Qurratul Ain Hyder Ke Fiction Mein Pasmanda Tabqe Ke Kirdar Aur Unke Masail

ABSTRACT
THESIS

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

Urdu

By

Md. Sufiyan Ahmad

UNDER THE SUPERVISION OF

Prof. Mohd Tariq

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY,
ALIGARH, (INDIA) 2021

قرۃ العین حیدر کے فکشن میں
پسماندہ طبقے کے کرداراور ان کے مسائل

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ.ڈی

مقالہ نگار

محمد سفیان احمد

نگراں

پروفیسر محمد طارق

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۲۱ء

پیش لفظ

میرے مقالے کا عنوان ''قرۃ العین حیدر کے فکشن میں پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل'' ہے۔قرۃ العین حیدر کی شخصیت اور ان کے تخیل میں ایسا تنوع اور ایسی ہمہ جہتی موجود تھی کہ تحقیق کے لیے منزل مقصود تک پہنچنا جوئے شیر لانے جتنا مشکل مرحلہ ثابت ہوا۔ان کے فکشن کا موضوعاتی دائرہ بہت وسیع ہے، ان کے ہر کردار کی اپنی ایک شناخت ہے جو فن پارے میں مسلم حیثیت رکھتے ہیں۔فکشن کے علاوہ قرۃ العین حیدر نے رپورتاژ، تراجم، خاکے اور علمی و ادبی مضامین بھی تحریر کیے ہیں۔لیکن راقم الحروف کے مقالے کا موضوع چونکہ ''قرۃ العین حیدر کے فکشن میں پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل'' ہے۔لہٰذا مقالے کا دائرہ بھی قرۃ العین حیدر کے فکشن تک ہی محدود رکھا گیا ہے۔

زیر نظر مقالے میں قرۃ العین حیدر کے افسانے، ناولٹ اور ناولوں میں پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔جہاں تک پسماندہ کرداروں کا سوال ہے تو اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ ان ہی کرداروں پر گفتگو کی جائے جو قرۃ العین حیدر کے فکشن میں سماجی، معاشی، اقتصادی، سیاسی اور طبقاتی سطح پر پسماندگی کے شکار ہیں۔اس طرح مقالے کو بے جا طوالت سے بچانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔مطالعے کی سہولت کے پیش نظر مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلے باب کا عنوان ''قرۃ العین حیدر کے حالاتِ زندگی اور ادبی کارنامے: ایک جائزہ'' کے نام سے ہے۔جس میں مصنفہ کی پیدائش، شخصیت، آباواجداد، تعلیم و تربیت اور ادبی ماحول کے اثرات کے ساتھ ان کی ادبی زندگی کا آغاز، ابتدائی تخلیق اور رہنمائے ادب کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ان کے افسانوی مجموعے، ناولٹ، ناول، رپورتاژ، تراجم اور خاکے وغیرہ کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا، تیسرا اور چوتھا باب ''قرۃ العین حیدر کے فکشن میں پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل'' کے عنوان سے ہیں۔راقم نے ان تینوں ابواب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، جس میں بتدریج صنفی اعتبار سے

مصنفہ کے افسانے، ناولٹ اور ناولوں کے پسماندہ کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یوں دوسرا باب ''قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل کی عکاسی'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں مصنفہ کا آغاز سے لے کر آخری افسانوی مجموعے تک کے تمام افسانوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ''ستاروں سے آگے''، ''شیشے کے گھر''، ''پت جھڑ کی آواز''، ''روشنی کی رفتار'' اور ''قندیل چیں'' (مرتب ڈاکٹر جمیل اختر) کا تخصیصی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ مصنفہ نے اپنے افسانوں میں کرداروں کی مدد سے زندگی کے متنوع پہلوؤں کو پیش کیا ہے، جن میں سے بہت سے کردار پسماندہ طبقے کے ماحول اور معاشرے کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ راقم نے موضوع کو بے جا طوالت سے بچاتے ہوئے صرف انہی افسانوں کا تجزیہ پیش کیا ہے جن افسانوں میں تخلیق کار نے پسماندہ طبقے کے افراد کی زندگی اور مسائل پیش کیے ہیں۔

تیسرا باب ''قرۃ العین حیدر کے ناولٹ میں پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل کا تجزیاتی مطالعہ'' پر مشتمل ہے۔ اس باب میں مصنفہ کے تخلیقی ناولٹ میں ''چائے کے باغ''، ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو''، ''دلربا'' اور ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' کے پسماندہ طبقے کے کرداروں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ان میں بعض کردار تو ایسے ہیں جو مرکزی اہمیت رکھتے ہیں جب کہ بعض ضمنی حیثیت رکھنے والے بھی کردار ہیں۔ ناولٹ کا ایک بڑا حصہ پسماندہ طبقے کی زندگی اور مسائل پر مبنی ہے، یہ باب قرۃ العین حیدر کی تخلیقی روش کو ایک الگ زاویہ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ زیر تحقیق مقالے میں راقم نے ناولٹ کے تمام کرداروں کو چاہے وہ اہم ہوں یا غیر اہم ان کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

چوتھا باب ''قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل: ایک تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں قرۃ العین حیدر کے تخلیق کردہ ناول ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینۂ غم دل''، ''آگ کا دریا''، ''آخر شب کے ہمسفر''، ''کارِ جہاں دراز ہے'' (تین جلد) ''گردش رنگِ چمن'' اور ''چاندنی بیگم'' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ افسانوں کی طرح ابتدائی ناولوں کے پس منظر پر رومانی فضا چھائی ہوئی ہے لیکن ذہنی پختگی کے بعد ناولوں میں فنی وفکری گہرائی بھی نظر آتی ہے۔ ان ناولوں میں تخلیق کار نے سماجی حالات کو پیش کرتے ہوئے اعلیٰ اور پسماندہ دونوں طبقے کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔

پانچواں اور آخری باب ''حاصلِ مطالعہ'' ہے۔ یہ باب پورے مقالے کا ماحصل ہے۔ گزشتہ ابواب میں جو موضوعات زیر بحث آئے ہیں، آخری باب میں ان سے نتائج اخذ کرنے کی کاشش کی گئی ہے۔ مصنفہ کی تحریروں سے پسماندہ طبقے کے کرداروں کی مجموعی فضا کا جو نقش ابھرتا ہے اس کا ذکر بھی اسی باب میں شامل کیا گیا ہے۔

مقالے کے آخر میں ''کتابیات'' کے تحت مآخذ کے طور پر استعمال شدہ کتب و رسائل کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ کرداروں کے مطالعہ کے لیے ان سے متعلق افسانے، ناولٹ اور ناولوں یعنی اصل متن سے براہ راست رجوع کیا گیا ہے اور حسب ضرورت دوسرے حوالوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔ لیکن زیر تحقیق موضوع کا مطالعہ جس پس منظر میں کیا گیا ہے اس پر اردو ادب میں بہت کم لکھا گیا ہے اس لیے اصل متن سے ہی زیادہ سہارا لیا گیا ہے۔

تحقیقی مقالے کے نگراں پروفیسر محمد طارق چھتاری صاحب کی ذات میرے لیے خضر راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے موضوع کے انتخاب سے لے کر خاکے کی تیاری تک بھرپور تعاون فرمایا، اور دورانِ تحقیق اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود ہر گام پر ایک شفیق استاد کی طرح مقالے کے شروع سے لے کر آخر تک میری بھرپور رہنمائی فرمائی۔ ان کی شخصیت میرے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے، میں ان کی مہربانیوں کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔

میں صدر شعبۂ اردو اور اپنے تمام اساتذہ کرام کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی، جن کے مفید مشوروں نے ہمیشہ مجھے روشنی دکھائی اور میں اپنی منزل تک بہ آسانی پہنچ سکا۔ یہ تمام شخصیات علم و آگہی کے ایسے سر چشمے ہیں جن کا فیض ہمیشہ سب کے لیے جاری رہتا ہے، ان تمام کا تہہ دل سے ممنوں ہوں کہ یہ سبھی حضرات گاہِ بگاہِ میری تربیت فرماتے رہیں۔

مولانا آزاد لائبریری اور سیمینار لائبریری کے اسٹاف نے موضوع سے متعلق مواد کی سہولیات فراہم کیں، خاص طور سے محسن بھائی، ریحان، عرفان بھائی، جاوید بھائی اور شعبۂ اردو کے تمام اسٹاف ممبر کا تہِ دل سے شکریہ۔ شعبۂ اردو سے تعلق رکھنے والے دوست بھی شکریے کے مستحق ہیں کیوں کہ اس سلسلے میں کسی نہ کسی

طرح ان کا تعاون بھی شامل رہا ہے۔ان دوستوں کے ساتھ نہ صرف اچھی یادیں وابستہ ہیں بلکہ بہت سے موضوعات پر تبادلۂ خیال کی وجہ سے بہت کچھ سیکھنے کو بھی ملا۔

آخر میں میں اپنے امی ،ابو اور بہن بھائیوں کا شکریہ اس لیے ضروری خیال کرتا ہوں کہ انہوں نے میری کامیابی و کامرانی کے لیے ہر لمحہ دستِ دعا دراز کیے رکھا۔ان کی بے پناہ دعائیں ،بے پایاں محبتیں اور شفقتیں میرے لیے کڑی دھوپ میں سائبان کا کام کرتی رہیں۔میرا چھوٹا بھائی فیضان احمد خصوصی شکریے کا مستحق ہے جس نے ساری ذمہ داریاں اپنے سر لے کر مجھے فرصت سے کام کرنے کا موقع فراہم کیا، یہ مقالہ اس کی عنائتوں اور محبت کا ثمر ہے۔

محمد سفیان احمد

ریسرچ اسکالر،شعبہ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

۲۰۲۰۰۲(یو۔پی)انڈیا

قرۃ العین حیدر کے فکشن میں
پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل

تلخیص

نگراں	مقالہ نگار
پروفیسر محمد طارق	محمد سفیان احمد

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۲۱ء

تلخیص

اردو فکشن کے جدید عہد کی پہچان قرۃ العین حیدر کے افسانوی ادب سے ہوتی ہے۔ان کی تخلیقات میں موضوعات کا دائرہ وسیع کینوس پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ حال کے زمانے میں جدید اور قدیم عہد دونوں سے اپنا فکری رشتہ استوار کرتی ہیں۔ان کے یہاں سماجی، تہذیبی اور معاشرتی فضا کردار کے تشخص کے حوالے سے نظر آتی ہے۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے اردو فکشن کے پس منظر پر دیہات کی پسماندہ زندگی زیادہ نظر آتی ہے۔جس کے ہیرو مزدور، کسان اور محنت کش لوگ ہیں۔لیکن قرۃ العین حیدر کے فکشن کی فضا اور ماحول شہری ہے اور ان کے سارے کردار بھی شہر کے رہنے والے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کے فکشن کا مطالعہ ماہرین ادب نے شہری زندگی کے پس منظر میں کیا اور ان کے کرداروں کو ماورائی دنیا کے فرد سے تعبیر کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کی شروع سے لے کر آخر تک تقریباً تمام تحریروں میں طبقاتی تفریق کے اثرات جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔مصنفہ تمام تر طبقاتی پہلوؤں، بالخصوص سماج کے اونچ نیچ کے طبقاتی مسائل سے خاصی متاثر نظر آتی ہیں۔اس کی مثال ان کی وہ تخلیقات ہیں جو سماج کی طبقاتی تفریق کو نمایاں کرتی ہیں۔ان کے یہاں انسانی جذبوں، رشتوں کی شکست و ریخت، سماجی آدرشوں اور تہذیبوں کے انہدام کے منظر نامے بحسن و خوبی موجود ہیں، اس کے ساتھ ساتھ سماج کے بنائے ہوئے طبقاتی تفریق کے اصولی نظام پر وسیع اور گہری نظر کا مشاہدہ بھی ملتا ہے۔قرۃ العین حیدر نے سماجی تاریخ کے الٹ پھیر اور اس کے عروج و زوال کی داستان اس طرح بیان کی ہے کہ ان کے یہاں ہمیں سماج کے طبقاتی نظام اور اس کے اصول و پیمانے کی پوری تصویر دکھائی دیتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن اردو ادب میں اب تک ان کی تحریروں کا مطالعہ محدود دائرہ میں کیا گیا ہے، اور انہیں صرف اعلیٰ طبقے کا نمائندہ تخلیق کار کہا گیا ہے۔ راقم نے قرۃ العین حیدر کے فکشن میں اعلیٰ طبقے کے بجائے پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کو

پیش کیا ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان کی تحریروں میں پسماندہ طبقے کے کردار ضمنی یا عارضی طور پہ نظر نہیں آتے بلکہ پسماندہ طبقے کی ترجمانی میں ان کے مشاہدے اور عمیق تجربے کا علم واضح طور پر ہوتا ہے۔ وہ پسماندہ طبقے کی زندگی سے اچھی طرح واقف تھیں، ان کے ساتھ سماج میں کس طرح کا رویہ اپنایا جاتا تھا؟ اور سماج میں اونچ نیچ کے رویہ سے کس طرح اذیت محسوس کرتے تھے؟ ان کی تخلیقات میں اس کی تصویر پوری طرح سامنے آجاتی ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر راقم نے اپنے مقالے کا موضوع ''قرۃ العین حیدر کے فکشن میں پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل'' منتخب کیا ہے۔ جو درج ذیل پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

قرۃ العین حیدر کے فکشن کے حوالے سے مجموعی طور پر کہا جائے تو ان کی تخلیقات حقیقی زندگی سے بہت قریب ہیں۔ سماجی زندگی میں فرد کے ساتھ طبقات کے تقسیمی نظام کے زیر اثر جو جو مسائل رونما ہوئے ہیں، فرد کے داخلی احساس، ڈرامائی پیش کش اور علامتی اظہار و بیان کے جو تجربے قرۃ العین حیدر نے کیے ہیں وہ اظہر من الشّمس ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی ادبی خدمات کا دائرہ بسیط کینوس پر پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ ان کی تخلیقات میں افسانے، ناولٹ، ناول، رپورتاژ اور تراجم وغیرہ شامل ہیں۔ کسی بھی تخلیق کار کی ادبی حیثیت کا معیار اس کی تخلیقات میں پوشیدہ ہوتا ہے جو اس کے مقام و مرتبے کے تعین میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ راقم الحروف نے مقالے کی ترتیب میں اس بات کی حتی الامکان کوشش کی ہے کہ بغیر کسی تعصب اور جانبداری کے موضوع کے تمام تر لوازمات کا احاطہ کیا جائے۔ جیسا مذکور ہوا ہے کہ شخصیت کے تعین قدر میں اس کے ادبی کارناموں کا نمایاں کردار ہوتا ہے اس لیے خاکسار نے دورانِ تحقیق قرۃ العین حیدر کی ادبی خدمات کو مرکوز نظر رکھا ہے اور حسب صلاحیت جو نتائج اخذ کیے جا سکتے تھے انھیں پوری دیانتداری سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

زیر تحقیق مقالہ مجملہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ مقالہ کا آغاز حسب روایت پیش لفظ سے ہوتا ہے جس میں راقم الحروف نے مقالہ کے اندراجات، تعارف اور غرض و غایت کو پیش کیا ہے۔ اس کے بعد'' قرۃ العین حیدر کے حالات زندگی اور ادبی کارنامے: اجمالی جائزہ'' کے عنوان سے پہلا باب قائم کیا گیا ہے۔ جس

میں ان کے خاندانی احوال وآثار، تعلیم وتربیت، علمی وادبی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی وفات تک کے تمام واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہےاور ان کی تصانیف کا مختصراً تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کی پیدائش ۲۰/جنوری ۱۹۲۷ءکو ریاست یو پی کے شہر علی گڑھ میں ہوئی۔ گھر والوں نے ان کا نام 'نیلوفر' رکھا لیکن خالو میر افضل علی نے تبدیل کر کے ایران کی مشہور ہستی ''قرۃ العین حیدر طاہرہ'' کے اسم گرامی پر قرۃ العین حیدر کر دیا۔ قرۃ العین حیدر کی تعلیم وتربیت دہرہ دون، علی گڑھ، بنارس، دہلی اور لکھنو جیسی مختلف جگہوں پر ہوئی۔ بقول مصنفہ 'ان کی ادبی زندگی کا آغاز سات سال کی عمر سے ہوا'۔ ان کا پہلا افسانہ ''ایک شام'' کے نام سے شائع ہوا۔ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کا دائرہ وسیع ہے اس باب میں تمام اصناف کا اجمالی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوی مجموعے پانچ ہیں جن کے نام ''ستاروں سے آگے''، ''شیشے کے گھر''، ''پت جھڑ کی آواز''، ''روشنی کی رفتار'' اور ''قندیل چین'' کے عنوان سے ہیں۔ اس کے علاوہ ناولوں میں ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینۂ غمِ دل''، ''آگ کا دریا''، ''آخر شب کے ہم سفر''، ''کارِ جہاں دراز ہے'' (تین جلد)، ''گردش رنگ چمن'' اور ''چاندنی بیگم'' مشہور ہیں۔ ان کے ناولٹ ''سیتا ہرن''، ''چائے کے باغ''، ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو''، ''اور'' دلربا'' اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ رپورتاژ اور تراجم وغیرہ کا ذکر بھی کیا ہے جو ان کی تخلیقات کا حصہ ہیں۔ قرۃ العین حیدر کو اردو ادب کی بے پناہ خدمت کرنے کے صلے میں متعدد ادبی اعزازات سے نوازا گیا جو ان کے شایان شان ہے۔

مقالے کے باب دوم ''قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل کی عکاسی'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں ان کے افسانوی مجموعے پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے ان افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے جس میں قرۃ العین حیدر نے پسماندہ طبقے کے کرداروں کو پیش کیا ہے۔ خلاصہ کے طور پر یہاں ان افسانوں کا مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے جس میں پسماندہ طبقے کے کردار موجود ہیں۔ ''پرواز کے بعد'' کی میگڈ یلین ڈی کوڈرا عرف مگ اور کارل، ''ٹوٹتے تارے'' کی رخشندہ عرف ری شی اور کمل، ''رقص شرر'' کی سلیما مارینا اور ''یہ باتیں'' کا وہ بے روزگار نوجوان جو معاش کی تلاش میں ہمہ وقت سرگرداں رہتا ہے۔ ''شیشے

کے گھر'' میں شامل افسانہ ''برف باری سے پہلے'' کے پسماندہ کردار اصغر ربانی، ارنا کرسینا اور سگرڈ ربانی، نشاط اسٹینلے، روبی کھوچڑ اور انوری خان ہیں۔ ''جلاوطن'' کی رام رکھی، ممولہ ڈومنی اور وہ سارے کہار جو ایک ایک دو دو پیسے کے لیے اپنے کاندھوں پر لوگوں کو اٹھائے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ افسانوی مجموعہ ''پت جھڑ کی آواز'' کا افسانہ ''ڈالن والا'' ہے۔ جس کے پسماندہ طبقے کے کرداروں میں میوزک ماسٹر سائمن، گڑھوال فقیرا اور تین بھائیوں کی ایک بیوی جل دھرا کا ہے۔ ''یاد کی ایک دھنک جلے'' کا پسماندہ کردار آیا 'گریسی' کا ہے جو اس افسانے کا اہم کردار ہے۔ گریسی پسماندہ طبقے کی معمولی ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر ایک جذباتی پہلو بھی رکھتی ہے۔ ''کارمن'' کے پسماندہ کردار کارمن، روزا، ایمیلیا اور مگدلینیا کی زندگی اور روزمرہ کے حالات کو تخلیقی اہمیت دی ہے۔ مذکورہ تمام کردار سماج کے پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس کی تخلیق میں مصنفہ نے حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔

مذکورہ افسانوں کے علاوہ ''روشنی کی رفتار'' کا افسانہ ''حسب نسب'' ہے۔ اس افسانے کے پسماندہ طبقے کے کرداروں میں سلامت بوا، ملّن خان، دھمّو خان اور طوائف کلو بائی ہیں جن کی زندگی اور سماجی مسائل کو تخلیق کار نے اجاگر کیا ہے۔ اگلا افسانہ ''نظارہ درمیاں ہے'' ہے جس میں پسماندہ طبقے کا کردار پیرو جاہ دستور اور تارابائی کا ہے۔ پسماندہ طبقے کی زندگی اور ان کے مسائل پر لکھا گیا اہم افسانہ ''فقیروں کی پہاڑی'' ہے۔ تخلیق کار نے بے روزگاروں کی نفسیاتی زندگی اور بدلتے ہوئے ذہنی فکر کو پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ متعدد فقیروں کی مصنوعی مسائل کا محاسبہ ہے اور آخر میں یہ اسی مصنوعی زندگی میں شامل ہو کر فقیروں کے طبقے کا بہت بڑا بھکاری بن جاتا ہے۔ ''اکثر اس طرح سے بھی رقص فغاں ہوتا ہے'' جمال آرا اور بندو خان کو حالات نے بھیک مانگنے پر مجبور کیا ہے۔ افسانہ ''کہرے کے پیچھے'' میں پسماندہ طبقے کے کردار فضل مسیح اور آیا کٹّو ہے، جن کی زندگی کے نشیب و فراز افسانے کا مرکز ہے۔ ''قندیل چین'' قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا آخری مجموعہ جسے ڈاکٹر جمیل اختر نے ترتیب دی ہے۔ افسانہ ''شربت والی گلی'' میں ڈولی جیکب اور قدیم فلمی دنیا کی پسماندہ زندگی اور ان کے مسائل کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ''تار پر چلنے والی'' سرکس میں کام کرنے والے پسماندہ کرداروں میں مادام تمارا، اولگا اور مس لارا ہیں۔ ''سنگھاردان'' یہ افسانہ پسماندہ طبقے کی طوائف خاندان کی زندگی پر مبنی

ہے۔ اگلا افسانہ ''ایک پرانی کہانی'' کے عنوان سے ہے۔قرۃ العین حیدر کے اس افسانے کا موضوع غریبی اوربھوک مری کے زیر اثر انسان کی پسماندہ حالات ہیں۔معاشی پسماندگی اور پیٹ کی بھوک کے آگے انسان ہرفعل کرنے پرآمادہ ہوجاتا ہے،حتیٰ کے وہ بھیک مانگنا بھی قبول کرلیتا ہے۔

مجموعی طور پرقرۃ العین حیدر کے افسانوں کودیکھا جائے توان کے یہاں موضوعات کا تنوع بہت زیادہ ہے۔کرداروں کا ایک جمِ غفیر نظر آتا ہے جو چاروں طرف آتے جاتے نظر آتے ہیں۔افسانے کے یہ کرداراپنے حالات اورمسائل کے ذریعے اس عہد کی سماجی،معاشی،معاشرتی،تہذیبی اورطبقاتی سطح پر بہترین نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔اس باب میں قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا مطالعہ ان کے افسانوں کے پسماندہ کرداروں کی زندگی اوران کے مسائل کے مختلف پہلوؤں سے کیا گیا ہے جوسماجی،طبقاتی،معاشرتی، معاشی اورذاتی سطح پرکمزوراورنچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔اس موضوع پرکام کرتے ہوئے بنیادی ماخذ سے زیادہ سروکار رکھا گیا ہے جبکہ ثانوی ماخذ سے کم مدد ملی ہے۔کیوں کہ قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا نقادافسانہ نگار کی موضوعاتی تفہیم سے کم سروکار رکھتا ہوا نظر آتا ہے جبکہ ان کی تکنیک،اسٹائل،زبان اوراسلوب پر زیادہ بات کرتا ہے۔بہرکیف قرۃ العین حیدر کے مذکورہ تمام افسانوں کے پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی ان کے مسائل کا جائزہ متن کے حوالے سے لیا گیا ہے جوقرۃ العین حیدر کے افسانوی تفہیم اورمعنوی جہت میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔

باب سوم کا عنوان ''قرۃ العین حیدر کے ناولٹ میں پسماندہ طبقے کے کرداراوران کے مسائل کا تجزیاتی مطالعہ'' ہے۔اس باب میں قرۃ العین حیدر کے ناولٹوں میں پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی کے مسائل کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ناولٹ ''چائے کے باغ'' ناولٹ کا پس منظر پسماندہ طبقے کا غریب اورمزدور طبقہ جو مشرقی پاکستان اورآسام کی سرحد پراپنے بنیادی ذریعے معاش چائے کے باغوں میں مزدوری کرکے پیٹ پالتا ہے۔مزدور طبقے کے کرداروں میں رام نندن،گلجریا،پاربتی،ترلوچن،سکھ نندن،بس بیتا اوررام کرن ہے۔ کرداروں کی زندگی کی ایک ایک جزئیات،ان کی نفسیات اورذہنی کیفیت کا اظہار مصنفہ کی پسماندہ طبقے سے گہری واقفیت اورعمیق تجربے کا پتا دیتی ہے۔راقم نے زیر تحقیق یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ناقدین

ادب نے قرۃ العین حیدر پر جو اعلیٰ طبقے کی ترجمانی کا لیبل لگایا ہے یہ مقالہ اس لیبل کو توڑتا ہے۔اسی طرح ان کا ایک اور ناولٹ ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' اس ناولٹ میں قرۃ العین حیدر نے جن کرداروں کو پیش کیا ہے وہ پسماندہ طبقے کے ہیں۔ یہ ناولٹ پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک بدنصیب کنبے کی کہانی ہے جن میں رشک قمر، ہرمزی خالہ، چھمّن خان، جمیلن اور ساتھ میں رہنے والا کانٹرے بھانڈ رہتا ہے۔تخلیق کار نے ان کرداروں کے اندر احساس و جذبات کا اتنا دکھ درد بھر دیا ہے کہ ان کی داستانِ حیات پڑھ کر دل دہل سا جاتا ہے۔

ناولٹ ''دلربا'' کا موضوع ہندوستانی شوبز کی دنیا ہے۔اب تک اس ناولٹ کا مطالعہ اعلیٰ طبقے کی جاگیردانہ نظام کے خاتمے کے حوالے سے ہوتا رہا ہے لیکن زیرِ تحقیق مطالعہ ان ڈیرہ دار طوائفوں کی زندگی پر مبنی ہے۔پسماندہ طبقے کی ڈیرہ دار طوائف گلنار بائی کی سماج میں سوائے سامانِ تفریح کے کوئی حیثیت نہیں تھی۔راقم نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ ناولٹ اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کے عروج و زوال کا بہترین نمائندہ ہے جس میں مصنفہ نے دونوں طبقے کی زندگی کے مسائل کو حقیقت پسندانہ پیرائے میں پیش کیا ہے جو ناولٹ کی جان بن گئی ہے۔اس باب کا آخری ناولٹ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' ہے۔اس ناولٹ میں دیہات کے کسانوں کی زندگی اور ان کے صورتِ حال کو موضوع بنایا گیا ہے۔پسماندہ طبقے کے کرداروں میں شبیروا، دوار کا پرساد اور مدار بخش، کلکٹر صاحب کے یہاں خاص ملازم ہیں۔اس کے علاوہ جھینگا باسی وہ کردار ہے جو مظہر صاحب کے کھیتوں اور باغوں میں کام کرتا ہے۔ناولٹ کا ایک حصہ جس کا پس منظر ہندوستان کا دیہات ہے جس میں اعلیٰ اور پسماندہ دونوں طبقے کے لوگ تفریق کے باجود ایک ساتھ زندگی گزارتے نظر آتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو قرۃ العین حیدر کے ناولٹ پسماندہ طبقے کے طوائفوں، خانگیوں اور سماج کا نچلا طبقے کی زندگی اور ان کے مسائل پر مبنی ہے۔ یہ لوگ سماجی نابرابری کا بری طرح سے شکار ہیں۔غریبی، بھوک، معاشی تنگی اور خوشگوار مستقبل کے خواہشات کی تکمیل کے لیے خود کو بیچ ڈالنے پر مجبور ہیں۔شخصیت کا انتشار، جنسی خواہشات سے جنم لیتا ہے اور پھر جب یہ خواہشات ناآسودہ رہ جاتی ہیں تو انسان ان کا مداوا کرنے کے لیے نئے نئے حربے استعمال کرتا ہے۔مذکورہ ناولٹ کے کردار بھی اس کی ترجمانی کرتے نظر آتے

ہیں۔مصنفہ نے ان کرداروں کو حقیقت کا روپ اس طرح دیا ہے کہ ان میں طبقاتی اور سماجی تفریق بھی نظر آتی ہے اور تہذیبی عمل داری بھی۔ ''چائے کے باغ''، ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، ''دلربا'' اور ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' یہ چاروں ناولٹ ایسے ہیں جو نہ صرف ناولٹ نگاری کے فن پر پورا اترتے ہیں بلکہ اس کے کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل مصنفہ کے عمیق مطالعہ اور مشاہدے کا بہترین نمونہ ہے۔ناولٹ کے کرداروں کو اس کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اس طرح اجاگر کرتی ہیں کہ انسانی زندگی کا ایک مکمل ڈھانچہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

باب چہارم ''قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل: ایک تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔اس باب میں قرۃ العین حیدر کے ناولوں پر جو مفکرین ادب نے اعلیٰ طبقے کا لیبل لگایا ہے اس رائے سے قطع نظر ان کے ناولوں کا مطالعہ پسماندہ طبقے کے کرداروں کے حوالے کیا گیا ہے۔ان کے یہاں شہروں کے مظلوم، مفلس، غریب اور سماجی سطح پر پسماندہ طبقے کے کردار موجود ہیں۔ اس طبقے کی زندگی کے مسائل کو جس طرح مصنفہ نے فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے اس کا جائزہ تنقیدی نقطۂ نظر سے لیا گیا ہے۔ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کا پس منظر ہندوستان کی آزادی سے قبل سماج کے طبقاتی افراتفری کا ہے۔ناول کا ایک حصہ مارکسی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے جس میں خورشید عالم کا کردار اہم ہے۔ مارکسی نظریات اور تحریک کے زیر اثر سماج کا پسماندہ طبقہ اوپر کی طرف آرہا ہے جسے اعلیٰ طبقہ قبول نہیں کرتا۔اس کے علاوہ قرۃ العین نے اعلیٰ اور متوسط طبقہ کی خامیوں اور کمیوں پر بھی بہت طنز کیا ہے۔اس ناول میں مصنفہ نے عملاً کسی پسماندہ کردار کو پیش نہیں کیا ہے لیکن پسماندہ طبقے کا سماج اور زندگی کے متعلق تخلیق کار کی ہمدردی واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ ''سفینۂ غم دل'' اس ناول میں لکھنو کی تہذیب اور ماحول میں لوگوں کی بدلتی زندگی کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔جدید دور میں نوابین طبقہ اپنے قائم مقام سے نیچے آچکا ہے، صنعتی دور نے سب کو آگے بڑھنے کا موقع دیا۔ پونم مہیشوری پسماندہ طبقے کا کردار ہے۔اس کے علاوہ سماج کا ایک پسماندہ طبقہ تھیٹر میں کام کرنے والی مراثین کا بھی ہے۔مصنفہ نے مارکسزم کے طبقاتی انقلاب اور اس کے متعلق خیالات کا واضح اظہار بھی کیا ہے۔نیز ناول میں پسماندہ طبقے سے ان کی ہمدردی کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

ناول ''آگ کا دریا'' اس ناول کے ابتداء میں ہی ہندوستانی معاشرہ پانچ مختلف ذاتوں پر مشتمل دکھائی دیتا ہے۔جس میں کشتری، براہمن، ویش، شودر اور چنڈال ہیں۔اس کے بعد بدلتے وقت کے تناظر میں ناول کے ہر دور میں پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔''آخرِ شب کے ہمسفر'' بنگال میں چلنے والی آزادی کی تحریک اس ناول کا موضوع ہے۔ مارکسزم تحریک کے زیر اثر ہندوستان کی آزادی کے خواہش مند نوجوان اعلیٰ اور پسماندہ طبقہ کے طبقاتی فرق کو بھی مٹانے کی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔جس کی نمائندگی ریحان الدین اور دیپالی سرکار کر رہے ہیں۔اعلیٰ طبقے کے لیے پسماندہ طبقے کے دلوں میں بغاوت اور نفرت کی فضا کو جس طرح تخلیق کار نے پیش کیا ہے اس کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کے متعدد کردار ناول میں ایسے ہیں جو تبدیلی کے باعث زندگی کی بڑی تبدیلی سے گزرتے ہیں ان کرداروں کے جذبات واحساسات اور تمام تر داخلی کیفیات کو تخلیق کار نے جس طرح نمایاں کیا ہے اس کا بھی تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''گردشِ رنگِ چمن'' ناول کی کہانی پچھلی ڈیڑھ صدی کا احاطہ کرتی ہے۔مصنفہ نے ناول میں پسماندہ طبقے کی طائفہ زندگی کو پیش کیا ہے۔ ناول کے اہم کردار دلنواز بیگم اور مہرو بیگم مغل شہزادیاں ہیں لیکن وقت کی تبدیلی نے ان کو طوائف بننے پر مجبور کر دیا۔پسماندہ طبقے کے پس منظر کو جس طرح تخلیق کار نے اس ناول میں پیش کیا ہے اس کے تمام پس منظر کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔''چاندنی بیگم'' مصنفہ کا اہم ناول ہے۔ اس ناول کے فضا میں اعلیٰ طبقہ اپنے زوال کے باوجود اسی طرح مگن ہے جس پر مصنفہ نے سخت طنز کیا ہے۔ وہیں پسماندہ طبقے سے تخلیق کار کی ہمدردی کا جذبہ ابھرتا نظر آتا ہے۔ناول نگار نے بیلا رانی شوخ کے ذریعے پسماندہ کرداروں کی زندگی، نفسیات اور مسائل کو پیش کرتے ہوئے جس نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے راقم نے اس کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

''کارِ جہاں دراز ہے'' قرۃ العین حیدر کا سوانحی ناول ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ ناول صرف فیملی ساگا نہیں ہے بلکہ اس میں برعظیم کی بنتی بگڑتی صورتحال وقت کے آئینے میں شفاف دکھائی گئی ہے۔ برعظیم ہمیشہ طبقات میں تقسیم رہا، آنے والے لوگوں نے مختلف نظام کے تحت ہندوستان میں طبقاتی نظام قائم

کیے جس کا تعلق فاتح اور مفتوح، ادنیٰ و اعلیٰ اور ذات پات کے نسلی امتیاز سے رہا ہے۔ کردار نگاری کے حوالے سے ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں کوئی فنی اور فکری جذبہ نہیں ملتا بلکہ تصویری طور پر ان کی زندگی دکھائی دیتی ہے۔

قرۃ العین حیدر ایک ہمہ جہت شخصیت تھیں جیسے جیسے ان کی تحریروں کو پڑھتے جائیں ویسے ویسے فکر وشعور کے نئے نئے در وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر لوگ نے ان کے فکشن کا مطالعہ کرنے کے بعد انہیں اعلیٰ طبقے کا نمائندہ تخلیق کار کہا ہے۔ لیکن ان کی تخلیقات میں بہت سے دیگر پہلو بھی ہیں جن کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ افسوس اس امر کا ہے کہ ان کے فکشن کا مطالعہ ان کی زندگی کے پس منظر میں کیا گیا اور کردار نگاری کے حوالے سے ان کا دائرہ اعلیٰ طبقے کے کرداروں تک ہی محدود قرار دیا گیا۔ جبکہ ان کے یہاں پسماندہ طبقے کے کردار بھی موجود ہیں لیکن اس طرف توجہ کم دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کے حوالے سے کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ حالانکہ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات اتنی وسعت، بوقلمونی اور اتنے پھیلاؤ کی حامل ہے کہ عقل ششدر رہ جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اپنی خلاقانہ صلاحیت کی بدولت اپنے جینوئن رائٹر ہونے کا بھی ثبوت پیش کیا ہے کیونکہ انہوں نے باقی تمام چیزوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے نظریات اور اصولوں سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اس نابغۂ روزگار ہستی جس نے اپنی ساری زندگی ادب کی خدمت میں گزار دی ہو، ان کو زندگی میں جیسی پذیرائی ملنی چاہئے تھی وہ نہیں مل سکی۔ بالآخر مصنفہ نے اس دنیا کو خیر باد کہنے میں عافیت سمجھی اور ۲۱ راگست ۲۰۰۷ء کی رات اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

قرۃ العین حیدر نے اپنی اسی (۸۰) سالہ زندگی میں بے پناہ اور بہترین ادب تخلیق کیا ہے، اور انہوں نے فکشن کے میدان میں ایسے تابندہ نقوش ثبت کیے ہیں جو انہیں مدتوں مرنے نہیں دیں گے اور ادب سے محبت کرنے والے ان کے بہترین فکشن کی بدولت انہیں بھلا نہیں پائیں گے۔

مقالہ کا باب پنجم ''خلاصۂ کلام'' پر مشتمل ہے۔ اس میں از اول تا آخر تمام ابواب کا محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ خلاصۂ کلام میں ہر باب کا انفرادی طور پر مختصراً جائزہ لیا گیا ہے اور تحقیق کا لب لباب اور ماحصل کا تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر تحقیق سے ادب میں کیا اضافہ ہوتا ہے یا یہ مقالہ قرۃ العین حیدر کی فکری شخصیت اور ادبی

تعبیر و تفہیم میں کس قدر معاون ثابت ہوتا ہے اس کا فیصلہ تو نگراں اور ممتحن کی صوابدید پر منحصر ہے۔ فی الحال خاکسار نے اپنے طور سے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ کچھ تسلی بخش اور لائق استفادہ نتائج برآمد کیے جا سکیں اور یہی حاصل کلام کی افادیت ہے۔

اس باب کے آخر میں کتابیات شامل کی گئی ہے۔ یوں تو دوران تحقیق موضوع سے متعلق و غیر متعلق بہت سی کتابوں کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا۔ مگر مقالہ کی ترتیب کے سلسلے میں راقم الحروف نے جن کتابوں، رسائل و جرائد وغیرہ سے براہِ راست کسب فیض کیا ہے کتابیات کے ضمن میں انھیں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

راقم الحروف کو یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ قرۃ العین حیدر اردو ادب کی ایک منفرد و ممتاز تخلیق کار ہیں۔ جس طرح سے انھوں نے ادب کی خدمات انجام دیں انھیں کا حصہ تھی۔ خاکسار نے اپنی علمی بے بضاعتی کے باوجود حسب استعداد پوری کوشش کی ہے کہ قرۃ العین حیدر کی علمی و ادبی شخصیت بالخصوص ان کے فکشن میں پسماندہ طبقے کے کرداروں کے تمام گوشوں کا من حیث الجہات مطالعہ پیش کیا ہے۔ اگر راقم الحروف کی یہ ادنیٰ کاوش قرۃ العین حیدر کے فکری و فنی کاوشوں کو منظر عام پر لانے میں مددگار ثابت ہوئی اور ادب میں اضافہ کا باعث بنی تو راقم الحروف کی عرق ریزی کا اس سے بہتر نعم البدل کچھ نہیں ہو سکتا۔

Qurratul Ain Hyder Ke Fiction Mein Pasmanda Tabqe Ke Kirdar Aur Unke Masail

ABSTRACT

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

Urdu

By

Md. Sufiyan Ahmad

UNDER THE SUPERVISION OF

Prof. Mohd Tariq

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY,
ALIGARH, (INDIA) 2021

فہرست

باب اول

قرۃ العین حیدر کے حالاتِ زندگی اور ادبی کارنامے:

اجمالی جائزہ

قرۃ العین حیدر اردو فکشن کی دنیا میں ایک بلند مقام پر فائز نظر آتی ہیں۔ان کے فکشن میں فکر و فن اور سماج و تہذیب کے متنوع رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔وہ سماجی و معاشرتی مسائل کو حال، ماضی اور مستقبل کے پس منظر میں نہایت خوبی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔قرۃ العین حیدر کا فن زیادہ سے زیادہ فاصلوں میں زیادہ سے زیادہ قربت تلاش کرنے کا فن ہے۔ان کا مطالعہ محض ایک عہد یا تہذیب و ثقافت کا نہیں بلکہ کئی عہدوں اور کئی تہذیبوں پر پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ان کی تخلیق کا ایک بڑا حصہ اردو ادب میں زندہ و جاوید کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے۔قرۃ العین حیدر کی تخلیقی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے ناقدین ادب انہیں اردو کے چند معروف فکشن نگاروں میں شمار کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی بے پناہ شہرت اور غیر معمولی شخصیت کے پیچھے ان کے پڑھے لکھے اور روشن خیال والدین کی کارفرمائی واضح دکھائی دیتی ہے جس کا اعتراف مصنفہ نے بھی کیا ہے۔انہوں نے اپنی اور اپنے خاندان کی سوانح ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں لکھتے وقت اس اعتراف کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

> ''مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا کیوں کہ میں ان سے علاوہ کوئی انوکھی ہستی قطعاً نہیں ہوں۔[۱]

قرۃ العین کی انفرادیت کے باوجود ان کے خاندان کا پس منظر، ماحول، حالات و واقعات کے متعلق جاننا اور یہاں تحریر کرنا ضروری ہے کیوں کہ اس کے بغیر ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے پردہ اٹھانے میں اور ان کے فکر و فن کو مکمل طور پر سمجھنے میں کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتے۔

قرۃ العین کے آباؤ اجداد کا سلسلۂ نسب حضرت زین العابدین اور حضرامام حسین علیہ السلام سے جوڑا جاتا ہے۔(جس کی تفصیل ''کار جہاں دراز ہے'' میں مصنفہ نے درج کی ہے) حضرت زین العابدین کے

صاحبزادے حضرت زید شہید کو خلیفۂ وقت نے قتل کر دیا۔ زید شہید کے قتل کے بعد ان کے خاندان اور اولاد پر مظالم کا سلسلہ جاری رہا۔ زید شہید کی اولادیں مزید ظلم وستم اور ایذا رسانی سے بچنے کے لئے مختلف ممالک میں منتشر ہو گئے۔ حضرت زید شہید کے اولاد میں سے ایک مشہور صوفی بزرگ سید کمال الدین حیدر ترکمانیہ سے ہندوستان تشریف لائے اور قصبہ کیتھل میں قیام کیا۔ آپ کا شمار ہندوستان کے اولین صوفیائے کرام میں ہوتا ہے۔ آپ خواجہ بہاؤ الدین نقش بند بخاریؒ اور خواجہ معین الدین حسن سنجری چشتیؒ کے ہم عصر تھے۔ ان کے اخلاف اور ان کی اولادیں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہوئیں۔ قرۃ العین حیدر اپنے بزرگ اسلاف کے متعلق لکھتی ہیں:

''سید جلال الدین غازی جو سید کمال الدین ترمذی کے صاحبزادے، اس تذکرہ نویس، فقیر، حقیر، پر تقصیر، عاجز، فدویہ کے مورث اعلیٰ ہیں۔ موصوف اس علاقے میں جا کر بسے جو بعد میں روہیل کھنڈ کہلایا۔ سید جلال الدین کے اخلاف میں سید اشرف گنج بخش، سید احمد، سید محمد، سید محمود اور سید حسن عسکری کا زمانہ پندرھویں صدی کا ہے۔ سید حسن عسکری کے صاحبزادے سید ضیاء الدین ترمذی ایک بغاوت کو فرو کرنے کے سلسلے میں شہید ہو گئے اور جیا شہید کہلائے۔ ان کا مزار جھونسی میں ایک پرفضا ٹیلے پر موجود ہے جو الہ آباد سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے میر حسن اپنے وفادار تیر گر کے ساتھ پا پیادہ نہٹور واپس آ گئے وفادار تیر گر اور اس کی اولاد نے محلّہ تیر گراں بسایا جو آج تک آباد ہے۔ سادات ترمذی دانش مندانِ نہٹور کہلاتے تھے۔''[۲]

مذکورہ اقتباس کی تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ سید کمال الدین حیدر کی آل اولاد ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہوئی تھیں۔ مصنفہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس خاندان کے متعدد افراد ابتداء سے مغل عہد اور

برٹش حکومت کے وقت تک معزز عہدوں پر فائز رہے اور انہیں حکومت وقت کی جانب سے بڑی بڑی جاگیریں بھی عطا ہوئی تھیں۔ ''کارجہاں دراز ہے'' میں اپنے پر دادا کے متعلق لکھتی ہیں کہ میرے پر دادا دو بھائی میر بندے علی اور سید احمد علی تھے۔ میر بندے علی ۱۸۵۷ کے المناک حادثے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمک خوار ہو کر تحصیلدار کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں اور مسلمانوں کے بیچ لڑی گئی جس میں متعدد لوگوں کا قتل ہوا۔ انگریز حکومت نے مسلمانوں کو جنگ کا محرک مانا اور اپنے مخالفین مسلمان باغیوں کو سزا دی۔ سید احمد علی نے ۱۸۵۷ء میں مغل حکومت کو بچانے کے لئے ان کا ساتھ دیا اور انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کی رہنمائی بھی کی۔ برطانیہ حکومت نے سید احمد علی کو انگریزی سامراج سے بغاوت کرنے اور جنگ میں انگریزوں کے خلاف حصہ لینے کے جرم میں پھانسی کی سزا سنائی، لیکن بھائی بندے علی جو انگریزی حکومت میں بحیثیت تحصیلدار تھے ان کے اصرار پر سزا مسترد کر دی گئی۔ سید میر بندے علی کے بیٹے سید جلال الدین حیدر جو قرۃ العین حیدر کے دادا تھے انہوں نے ہندوستان کے بہت نازک اور مایوس کن حالات میں اپنی عملی زندگی کی شروعات کی۔ نئی حکومت کی سخت پالیسی میں اپنی صلاحیت کے بنا پر ڈپٹی سپرنٹینڈنٹ کے عہدے داری کا اعلیٰ مقام حاصل کیا اور اپنے حسن کارکردگی کے بدولت ''خان بہادر'' کا خطاب بھی حاصل کیا تھا۔

قرۃ العین حیدر کے والد سید سجاد حیدر یلدرمؔ ۱۸۸۰ء میں ضلع جھانسی کے قصبہ 'کانڈیز' میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم یو۔ پی کے شہر بنارس میں ہوئی۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ چلے آئے اور مدرسۃ العلوم میں داخلہ لیا۔ سجاد حیدر یلدرم مدرسۃ العلوم کے ممتاز طالب علم اور شبلی کے عزیز شاگردوں میں سے تھے۔ علی گڑھ میں تعلیم کے دوران ہی سر سید احمد خان کے بہت قریبی دوست نواب حاجی اسماعیل خان صاحب رئیس دتاولی کے سیکریٹری اور انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ نواب حاجی اسماعیل خان موصوف اس زمانے کے نامور ادیب تھے اور ترکی زبان کا علم بھی رکھتے تھے۔ اسماعیل خان کی قربت سے یلدرم کو ترکی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا لہٰذا وہ نواب صاحب کو انگریزی پڑھانے کے ساتھ ان سے ترکی زبان سیکھتے تھے۔ سجاد حیدر یلدرم کو ترکی زبان سے بے حد دلچسپی پیدا ہوگئی۔ انہوں نے ترکی ادب کی بہت سی تحریروں کا اردو میں

ترجمہ کیا جسے اردو ادب میں کافی شہرت نصیب ہوئی۔

سجاد حیدر یلدرم بہت ذہین اور خوش طبع انسان تھے انہیں پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق تھا۔علی گڑھ میں ان کی شخصیت کونکھرنے اور سنورنے کے بہت مواقع فراہم ہوئے۔اچھے اساتذہ کے ساتھ مولانا محمد علی جوہر و مولانا حسرت موہانی جیسے ہم سبق دوست بھی ملے۔یلدرم نے ۱۹۰۰ء میں انجمن اردوئے معلیٰ قائم کیا اور اس کے پہلے سیکریٹری بھی رہے اور اسی سال ان کا مشہور زمانہ مضمون ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' رسالہ معارف میں شائع ہوا۔سجاد حیدر یلدرم کی ادبی شناخت علی گڑھ کی فضا نے عطا کی۔انہیں علی گڑھ سے خاص عقیدت تھی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے علی گڑھ کو''دوسرا کعبہ'' کہا ۔

سجاد حیدر یلدرم اردو ادب میں افسانہ نگار، صاحب طرز انشاء پرداز اور مترجم کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے۔ وہ اردو کے پہلے ادیب تھے جنہوں نے اردو ادب کو ترکی ادب کے فن پاروں سے روشناس کرایا۔یلدرم کی بیشتر تخلیقات تراجم پر منحصر ہیں انہوں نے زمانۂ طالب علمی میں ہی ترکی کے متعدد افسانے اور ناولوں کا اردو میں ترجمہ کیا جو ان کی شہرت کا سبب بنا۔ان کے مضامین اور افسانوں کے مجموعے ''خیالستان'' (۱۹۲۸)''حکایات و احساسات'' نام سے شائع ہوئے ۔''ثالث بالخیر'' (۱۹۲۱)''زہرا''، ''مطلوب حسینا''،''آسیب الفت''اور''ہما خانم''ان کے ترجمہ کردہ ناول ہیں جو دوسری زبانوں سے اردو میں منتقل ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ رشید احمد صدیقی کی خواہش پر'نامق کمال' کا مشہور ڈرامہ'' جلال الدین خوارزم شاہ''اور ڈرامہ''جنگ وجدال'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ترجمہ نگاری میں یلدرم نے الفاظ کے انتخاب اور ترکیبوں کے اختراع کا خاص خیال رکھا ہے جس کے سبب انہیں ادب میں شہرت دوام کا درجہ حاصل ہے۔ان کی تخلیقات انشاء پردازی اور فصاحت و بلاغت کے بہترین نمونے ہیں۔مبالغہ آرائی، تخیل کی رنگینی اور اندازِ بیان کی لطافت ان کے یہاں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔عبارت نہایت صاف ستھری، شگفتہ اور دلچسپ ہوتی ہے۔ترکی زبان وادب سے واقفیت کے بنا پر انہیں''دل انگلش رخ ترکانہ داری'' کہا جاتا تھا۔بقول قرۃ العین حیدر:

''ترکوں کے لہجے میں ترکی اور ایرانیوں کے لہجے میں فارسی بولتے تھے۔''[۳]

سجاد حیدر یلدرم نے مختلف بڑے اور معزز عہدوں پر ملازمت کی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۲۰ء میں M.A.O کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملا تو سجاد حیدر یلدرم کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا پہلا رجسٹرار مقرر کیا گیا۔ اسی سال یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا قیام عمل میں آیا تو پہلے صدر کی حیثیت سے ان کا انتخاب بھی ہوا۔ شعبۂ اردو کے تعلیمی پہلوؤں پر خاص توجہ دی اور آٹھ سال تک شعبہ کے صدر رہے۔ یلدرم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۲۰ تا ۱۹۲۷ تک یونیورسٹی اور شعبۂ اردو میں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۲۹ء میں سول سروس جوائن کیا اور غازی پور واٹاوہ وغیرہ میں سرکاری ملازم رہے۔ ۱۹۳۰ء میں ریونیو کمشنر کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور جزائر انڈمان نیکوبار میں خدمت کی۔ ۱۹۳۴ء میں حج کا ارادہ کیا اور کعبۃ اللہ کی زیارت نصیب ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں صحت خراب ہونے کے سبب قبل از وقت وظیفے پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں دنیائے فانی کو الوداع کہا اور مالک حقیقی سے جا ملے۔ رشید احمد صدیقی نے سجاد حیدر یلدرم کی باصفت شخصیت، حسن اخلاق اور ان کے مزاج کی نرمی کا اعتراف کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''بڑے پاکیزہ اور معصوم سرشت انسان تھے۔ ان کو جوڑ توڑ بالکل نہ آتا تھا وہ اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سنے گئے۔ دوسروں پر بڑی فیاضی سے اکثر فخر کرتے پائے گئے۔ ایک سچے آرٹسٹ اور ادیب کی طرح وہ اہل مناصب سے کبھی مرعوب نہ ہوئے۔ لیکن فن کے کمال کی داد میں بڑے سخی تھے۔ سید صاحب کو میں نے شاید کبھی ''تم'' کے لفظ سے کسی کو مخاطب کرتے سنا ہو۔ انھوں نے اپنے منصب اور اپنی غیر معمولی مقبولیت کو ذاتی رفعت اور منقبت کا کبھی وسیلہ نہیں بنایا۔ ان کو میں نے برہمی میں آپے سے باہر نہیں پایا اور ہنسی دل لگی میں ان کے منہ سے کبھی ایسے الفاظ نہ سُنے جو مذاقِ سلیم پر بار ہوں۔''[۴]

قرۃ العین حیدر کی والدہ نذر زہرا بیگم ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کے آباؤ اجداد نیشاپور ایران سے بادشاہ جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ بادشاہِ وقت کی جانب سے ''باون گاؤں'' مع نوابی عطا کیا گیا

تھا۔سلطنتِ مغلیہ میں علمی اور محکمۂ مالیات کی ذمہ داری اس خاندان کے متعدد افراد کے سپرد تھی۔زہرا بیگم کے والد ُخان بہادر ٗسید نذر الباقر صوبہ سرحد پر بحیثیت ایجینٹ ملازم تھے اور فوجوں کی سپلائی کا کام کرتے تھے۔

سید نذر الباقر کا خاندان تعلیم یافتہ تھا ان کے گھر میں مشرق و مغرب کی جدید تہذیب و ثقافت اور آزادانہ ماحول کا پورا دخل تھا۔نذر زہرا بیگم کی تعلیم و تربیت ہندوستان کے اسی جدید ماحول میں ہوئی،انہیں پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔انہوں نے اپنے دور کے مشہور علمی و ادبی جرائد نیرنگ خیال،تمدن،مخزن،تہذیب نسواں،ادیب اور انقلاب وغیرہ میں بنت نذر الباقر یا مس نذر الباقر کے نام سے آزادیِ نسواں اور تعلیم نسواں کے متعلق مضامین اور افسانے لکھنا شروع کیا اور جلد ہی ادبی دنیا میں شہرت حاصل کر لی۔۱۹۱۰ء میں شمس العلماء ممتاز علی کے ہفت روزہ بچوں کا اخبار ''پھول'' کی اعزازی ایڈیٹر مقرر ہوئیں۔وہ ایک پڑھی لکھی اور جدید تہذیب کی خاتون تھیں اور اپنے دور کے فیشن ایبل سوسائٹی کی لیڈر اور روشن خیال خاتون کی حیثیت سے جانی گئیں۔بیسویں صدی عیسوی میں شمال ہند کی مسلمان لڑکیوں میں وہ منفرد مقام رکھتی تھیں۔ان کی شخصیت،عملی زندگی،مزاج،رہن سہن اور تخلیقات نے طبقۂ نسواں کو پوری طرح متاثر کیا۔ قرۃالعین حیدر نے اپنی والدہ کے متعلق لکھا ہے:

> ''اپنے کنوارپنے کے زمانے ہی میں بنت نذر الباقر کے مضامین نیرنگ خیال،زمانہ،تمدن،ادیب،انقلاب اور الناظر میں شائع ہوئے۔ان کا انگریزی ترجمہ ٹائمز آف انڈیا میں چھپا اور بمبئی اور مدراس کے انگریزی اخباروں کی طرف سے ان کو انعام ملے۔ان کا ایک مضمون جو تہذیب نسواں میں چھپا تھا۔اس پر مہارانی بڑودہ نے بنت الباقر کو تمغہ دیا۔شادی کے بعد دہرہ دون میں لڑکیوں کا انگریزی اسکول قائم کیا اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا۔مسلم گرلز اسکول علی گڑھ اور کرامت حسین گرلز اسکول لکھنؤ کے قیام کے سلسلے میں بہت کام کیا۔آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرس قائم کی جس کی سیکریٹری بیگم

حبیب الرحمٰن خان شیروانی اور صدر بیگم بھوپال تھیں۔۱۹۲۳میں نذر سجاد نے پردہ ترک کیا اور ترک موالات کے زمانے میں کھادی تحریک میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ یلدرم کے ہمراہ مشرق وسطیٰ کی سیاحت بھی کی۔''۵؎

نذر زہرا بیگم اپنے دور کی ممتاز ادیبہ تھیں۔وہ''سرسید کی تربیت یافتہ عقلیت پسند نسل سے تعلق رکھتی تھیں''۔انہیں''فیوڈل دور کی ادیبہ''اور''اردو ادب کی اماں حوا'' کہا گیا۔نذر زہرا بیگم نے موجودہ دور کی قدیم ضعیف العقیدہ روایت سے انحراف کیا اور معاشرے میں پھیلی مفلوک الحال تہذیب سے طبقۂ نسواں کو نجات دلانے کے لیے احتجاج بھی کیا بلکہ ان کی اصلاح کے لئے لیڈر بن کر رہنمائی بھی کی۔بقول قرۃ العین حیدر:

''وہ تعلیمِ نسواں کی زبردست حامی تھیں۔اصلاح پرستی کا رجحان تھا۔ انہوں نے توہمات، بدعتوں، قبر پرستی اور تعویذ پرستی کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا وہ اس زمانے کی فیشن ایبل سوسائٹی کی لیڈر تھیں۔'' ٦؎

نذر زہرا بیگم نے اپنی اکثر و بیشتر تخلیقات حقوق نسواں کی حمایت میں تخلیق کئے ہیں۔انہوں نے اپنے دور کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کو ایک مخصوص زاویے سے دیکھا۔سماج میں انسانی زندگی کے حالات اور اس کے نشیب و فراز کو محسوس کیا اور نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنی تحریروں میں ان مسائل کو پیش کیا۔نذر زہرا بیگم کا مشہور معاشرتی و اصلاحی ناول''اختر النساء بیگم''کے نام سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔اس کے علاوہ'' آہ مظلومہ''،''حرما نصیب''،''جانباز''اور''نجمہ''ان کی شاہکار تخلیقات ادب کی زینت بنیں۔نذر زہرا بیگم کی تخلیقات کا بنیادی موضوع جدید تعلیم اور مغرب کی نئی رجحانات سے مشرق کے اخلاقی اور تہذیبی نظام کو آہنگ کر اس کی افادیت سے روشناس کرانا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم اور نذر زہرا بیگم دونوں اپنے دور کے ممتاز ادیب تھے۔ان کی تحریریں قارئین کے حلقے میں بہت مقبول ہوئیں،ادب میں ایک نمایاں تخلیقات کے طور پر بہت سراہا گیا۔سجاد حیدر یلدرم کی شادی بنت الباقر سے ۱۹۱۲ء میں رسالہ''تہذیب نسواں''کے مدیر ممتاز علی کے توسط سے ہوئی۔ان کی چھ اولادیں

ہوئیں جن میں سے مصطفیٰ حیدر اور قرۃ العین حیدر حیات رہے۔

قرۃ العین حیدر کا خاندان روشن خیال اور تعلیم یافتہ تھا۔ان کے والدین معروف ادیب اور ادب نواز تھے۔گھر میں ادبی محفلیں بھی ہوا کرتی تھیں اور عہد حاضر کے مشہور ادیب ان کے گھر تشریف لاتے ،گھنٹوں ادبی گفتگو ہوا کرتی ،جس کے اثرات قرۃ العین حیدر نے بھی قبول کئے ۔ان کے خاندان میں مشرقی تہذیب و تمدن کی پاسداری کے ساتھ ماڈرن کلچر کا بھی عمل دخل تھا۔اس دور میں بھی اس گھرانے کی خواتین اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں، دادیہال اور نانیہال دونوں خاندانوں میں بچوں کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔جس میں قرۃ العین حیدر نے پرورش پائی اس خاندان کے تعلیم یافتہ نوجوان نسل خصوصاً قرۃ العین حیدر کے فرسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ cousins جن کی اچھی خاصی تعداد تھی ،ان کے متعلق مصنفہ لکھتی ہیں:

> ’’ایک سے ایک عالم فاضل چلا آرہا ہے۔دو بہنوں نے یونیورسٹی کے سارے ریکارڈ کھٹا کھٹ توڑ ڈالے۔ننھال میں جو بہن بھائی ہیں ان کا بھی یہی سلسلہ ہے۔ایک نوجوان خاتون نے مانچسٹر یونیورسٹی میں ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی کی ڈگری لی۔ایک بزرگوار بہت بڑے سیاست دان بن گئے ۔بہت کم کنبوں میں اتنے زیادہ ’قبیلے کا احساس‘ ہوتا ہے۔اس کی وجہ غالباً وہی تربیت اور وہی مخصوص تہذیبی پس منظر ہے‘‘۔ ے

قرۃ العین حیدر کے گھرانے کا تہذیبی اور معیارِ زندگی بہت بلند تھا۔ان کے گھر کا ماحولیاتی نظام اور عملی زندگی میں وہی رکھ رکھاؤ تھا جو اس دور کے بدلتے حالات میں جدید تہذیب وثقافت کی جان تھی اور اس آزاد ماحول میں تعلیم وتربیت کا بھی وہی نظام تھا جو اس عہد کا تقاضہ تھا۔مثبت نظریات اور بہتر ماحول میں قرۃ العین حیدر کی ذہنی پرورش ہوئی تھی جس کا اثر ان کی تحریر اور شخصیت دونوں پر واضح نظر آتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کی پیدائش ۲۰ جنوری ۱۹۲۷ء میں ریاست یو۔پی کے شہر علی گڑھ میں ہوئی۔بعض محققین کی تحقیق اور موصوفہ کی تحریروں سے ان کی تاریخ ولادت ۱۹۲۶ سے ۱۹۲۸ کے مابین مختلف اسناد کے ساتھ دستیاب ہوتا ہے۔مثلاً ہربنس سنگھ تصور نے ان کی پیدائش کی تاریخ اپنی کتاب ’’قرۃ العین حیدر ادب عہد

اور حیات'' میں ۲۰ جنوری ۱۹۲۷، نند کشور وکرم نے اپنے مضمون ''احوال وکوائف'' میں ۲۰ جنوری ۱۹۲۶اور ڈاکٹر اختر بستوی نے ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ لکھا ہے۔اس سلسلے میں قرۃ العین حیدر نے اپنے سوانحی ناول'' کارِ جہاں دراز ہے'' میں لکھا ہے کہ کالج کے داخلے کے سلسلے میں یلدرم نے سن ۱۹۲۷ لکھوایا تا کہ سولہ سال عمر ہو سکے لیکن سولہ سال عمر اب بھی نہیں ہوئی تھی۔ داخلے کے لئے مزید ایک سال اور Bake Dated ۱۹۲۶ لکھ کر بھیجا گیا جو آج تک چل رہا ہے۔

قرۃ العین حیدر سے ان کی تاریخ پیدائش یا ذاتی زندگی کے حوالے سے کسی محقق یا interviewrs نے ان سے بات کی تو موصوفہ نے اسے ہمیشہ ناپسند کیا۔ بلکہ وہ کہتی ہیں ''ہم اور ہماری شخصیت یہ کیا مسخرہ پن ہے۔'' ایک جگہ وہ لکھتی ہیں:

> ''معلوم نہیں کیوں لوگ کسی کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ وہ اپنی اس حرکت سے خوش ہوتے ہیں مگر دوسروں کو اس بات سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔اس کا اندازہ ان جاہلوں کو قطعاً نہیں ہوتا حالانکہ یہ ایک بہت ہی غیر مہذب بات ہے۔'' ۸

مذکورہ اقتباس سے مصنفہ کی دلی کیفیت اور ذہنی الجھن کا اندازہ ہوتا ہے لیکن شخصیت کے سوانحی پہلو پر جب بھی گفتگو ہوگی تو حالات زندگی کے مختلف امور پر ضرور بات ہوگی۔ بہر کیف قرۃ العین حیدر کے گھر والوں نے ابتداء میں ان کا نام نیلوفر رکھا جسے ان کے خالو میر افضل علی نے تبدیل کر کے ایران کی مشہور ہستی قرۃ العین طاہرہ کے اسم گرامی پر قرۃ العین حیدر رکھ دیا۔

قرۃ العین حیدر نے ابتدائی تعلیم مختلف جگہوں پر حاصل کی، ان کے والد انگریزی دور حکومت میں سرکاری ملازم تھے۔ ان کا تعین وقفہ وقفہ پر ملک اور بیرون ملک میں ہوتا رہا۔یہی سبب ہے کہ قرۃ العین کی ابتدائی زندگی والد کے ساتھ مختلف مقامات پر گذری۔ بچپن کا زیادہ تر عرصہ دہرہ دون اور پورٹ بلیر میں گذرا۔ یہ وہ علاقے ہیں جن سے قرۃ العین حیدر بہت متاثر ہوئیں، یہاں کے گہرے سمندر، جھیلیں، ندیاں،

ناریل کے جھنڈ اور پر سکون علاقائی فضا انہیں بہت پسند آئی۔ان مقامات کا ذکر ان کی تحریروں میں شعوری اور غیر شعوری طور پر جابجا نظر آتا ہے۔وہ لکھتی ہیں:

''بعض دفعہ مجھے خیال آتا ہے بھانت بھانت کی جگہوں پر رہے بھانت بھانت کے انسانوں سے ملے بھانت بھانت کی مصروفیتیں رہیں۔بچپن رنگا رنگ مناظر سے پر رہا۔اتر پردیش کے ہرے ہرے ضلع،ترائی کے جنگل ،ہمالیہ کی چوٹیوں پر بسنے والی معروف اور غیر معروف بستیاں،سب سے پہلے یاد جو ہے وہ جہاز کے سفر کی ہے۔کہ بس تیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں ۔بمبئی،کلکتہ،جنوبی ہند کی بندرگاہیں' ایران کی ساحل،کربلائے معلّٰی،قاہرہ،ترکی۔مستقل اِدھر ادھر گھوم رہے ہیں۔'' ۹

قرۃ العین حیدر کی ابتدائی تعلیم کا سلسلہ دہرہ دون کے ایک کانونٹ اسکول سے شروع ہوا۔وہ ابھی تیسری جماعت تک تعلیم حاصل کر پائی تھیں کہ انہیں علی گڑھ میں بہتر تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا۔علی گڑھ میں سجاد حیدر یلدرم کے بھائی اور قرۃ العین حیدر کے چچا نصیر حیدر کے گھر ''نور منزل'' میں قیام ہوا۔علی گڑھ گرلز کالج میں پانچویں جماعت کے لئے ان کا ٹیسٹ ہوا لیکن ریاضی میں کمزور ہونے کی وجہ سے انہیں تیسری کلاس میں داخلہ ملا۔ابھی کچھ عرصہ ہی گذرا تھا کہ قرۃ العین حیدر کی طبیعت خراب ہوگئی۔بھائی افضل علی کے کہنے پر والدہ نے عینی بی بی کو علی گڑھ سے لاہور بلا لیا۔اب گھر پر ایک ماسٹر سے ٹیوشن کے ذریعے تعلیمی سلسلہ شروع ہوا لیکن چند مدت کے بعد وہ لاہور سے لکھنو آ گئیں۔سجاد حیدر یلدرم نے قرۃ العین کو اردو زبان کی بہتر تعلیم اور اچھی تربیت حاصل کرنے کے لیے کرامت حسین گرلز کالج میں داخل کرایا۔لیکن نذر سجاد حیدر کی خواہش تھی کہ قرۃ العین حیدر انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں لہٰذا انہیں کرامت حسین کالج سے نکال کر'' سینٹ اگینز' (St.Agnes) میں داخلہ کرایا گیا۔اسی دوران قرہ العین حیدر نے دینی تعلیم بھی حاصل کی۔ والد نے گھر پر دینیات اور قرآن پڑھانے کے لئے مدرستہ ندوۃ العلماء سے ایک مولوی صاحب کو مقرر کیا لیکن والدہ کے حکم پر قرۃ العین حیدر کو نماز پڑھنے کا طریقہ اور نماز کے شرائط چھوٹی چچی جان نے سیکھائے۔ ''کارِ

جہاں دراز ہے'' میں قرۃ العین حیدر نے اپنی تعلیم کے متعلق والدین کی مختلف رائے اور کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ

''اباجان اور اماں جان کی رواداری کا عجیب عالم تھا۔اماں کہتی تھیں بچوں کو سنی دینیات پڑھوایئے ابا جان کہتے اگر شیعہ دینیات بھی پڑھ لیں گے تو کیا غضب ہو جائے گا۔لیکن اماں نے چھوٹی چچی جان سے جو اناّو سے آئی ہوئی تھیں۔ کہا، ''بھابھی! لڑکی کو اپنی نماز سکھلا دیجئے'' انہوں نے بخوشی سکھلا دی۔''۱۰؎

St. Agnes میں قرۃ العین حیدر کا تعلیمی سلسلہ زیادہ وقت تک نہ رہا۔ St. Agnes کے بعد ہائی اسکول کے لیے سجاد حیدر یلدرم نے ان کا داخلہ پرتھی سنگھ سریواستوا کے 'بنارس یونیورسٹی' میں کرا دیا ۔'بنارس یونیورسٹی' میں ہائی اسکول کے طلبہ کا ریاضی اور میوزک کا پرچہ اختیاری تھا۔ مصنفہ ریاضی میں کمزور تھیں اس لیے انہوں نے میوزک کا انتخاب کیا۔ میوزک کے مضمون میں کلاسیکل گانا، ستار اور تھیوری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مصنفہ کے لیے گھر والوں نے ایک طنبورہ خریدا تاکہ اسکولی تعلیم کے بعد گھر پر اس کا ریاض کر سکیں۔قرۃ العین حیدر نے ''بنارس یونیورسٹی'' سے ۱۹۴۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ ڈاکٹر جمیل اختر لکھتے ہیں کہ

''بنارس یونیورسٹی میں لڑکیوں کے لیے ریاضی لازمی مضمون نہیں تھا۔اس کے بجائے انہوں نے ہندوستانی موسیقی کا مضمون لیا جو میرس کالج آف ہندوستانی میوزک لکھنؤ کے سیکینڈ ایئر کے کورس کے برابر تھا۔ جس میں ستار، گائیکی، تھیوری آف میوزک کے تین الگ الگ پرچے شامل تھے۔مئی ۱۹۴۱ میں سیکنڈ ڈویژن اور اردو میں ڈسٹنکشن کے ساتھ میٹرک پاس کیا اور بنارس یونیورسٹی کی دوسری سب سے کم عمر طالب علم کا امتیاز بھی حاصل کیا۔''۱۱؎

قرۃ العین حیدر نے میٹرک پاس کرنے کے بعد انٹرمیڈیٹ کے لئے جولائی ۱۹۴۱ء میں ازابلا تھوبرن کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں اقتصادی، سوکس، انگلش اور اردو شامل تھا۔ ۱۹۴۳ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان سیکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ اسی سال ان کے والد رفیق کا انتقال ہو گیا اور قرۃ العین حیدر لکھنؤ سے دہلی اپنے بھائی مصطفیٰ حیدر کے پاس چلی آئیں۔ والد کا انتقال قرۃ العین حیدر کے لئے سانحۂ عظیم تھا۔ سجاد حیدر یلدرم سے قرۃ العین حیدر جذباتی طور پر بہت قریب تھیں۔ ان کی شفقت اور محبت نے قرۃ العین کو بہت کچھ دیا تھا۔ ان کی شخصیت میں پختگی کا زیادہ تر اساس انہیں کا مرہون منت ہے۔ سلمیٰ صدیقی لکھتی ہیں کہ:

> ''اپنے والد سے عینی کو وہی تعلق تھا جو عام طور سے بیٹی کو باپ سے ہوتا ہے۔ عینی کے لئے یلدرم کی حیثیت باپ، معلم، ساتھی، رہبر، دوست، بہی خواہ اور ناصح اور نقاد کی بھی تھی۔ ۱۲''

قرۃ العین حیدر کے دہلی آنے کے بعد بھائی مصطفیٰ حیدر کے توسط سے ''اندر پرست کالج'' میں داخلہ ہوا۔ ۱۹۴۵ء میں اندر پرست کالج سے بی۔اے اور ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے ایک سمر اسکول سے جدید انگریزی ادب کا مختصر کورس بھی کیا۔

قرۃ العین حیدر نے نصابی تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ بہت سے کورس شوقیہ بھی حاصل کیے جس میں موسیقی، آرٹ اور صحافت وغیرہ شامل ہیں۔ قرۃ العین حیدر کو موسیقی سے دلی لگاؤ تھا انہوں نے دہرہ دون اور لکھنؤ کے کانونٹ اسکولوں میں موسیقی کی ابتدائی معلومات حاصل کی تھی اس کے علاوہ ہندوستانی کلاسیکل موسیقی اور مغربی موسیقی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ موسیقی کے نابینا استاد 'سورج بخش سریواستوا' سے کلاسیکل موسیقی، پاکستان میں ایف۔ ایکس فرنانڈیز سے پیانو اور لکھنؤ گورنمنٹ اسکول میں مشہور آرٹسٹ ایل۔اے سین سے جاپانی بنگالی واش تکنیک سیکھی۔ ان کی تخلیقات کے سرورق پر موجود زیادہ تر تصویریں ان کی اپنی بنائی ہوئی ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے صحافت کی تعلیم بھی حاصل کی، ریجنٹ ارٹریٹ پولی ٹیکنیک لندن میں ایک سالہ

صحافتی ڈپلوما کورس کرنے کے لئے داخلہ لیا لیکن کورس مکمل کئے بنا ہی بیچ میں چھوڑ دیا۔اسی پولی ٹیکنیک میں پھر فرنچ میں داخلہ لیا لیکن کچھ دنوں بعد اسے بھی چھوڑ دیا۔

قرۃ العین حیدر اردو فکشن میں وہ نام ہے جس نے اپنی زندگی میں وہ تمام شہرتیں حاصل کی جو بڑے بڑوں کو نصیب نہ ہو سکیں۔وہ اپنے عہد کے ماحول اور روزمرہ زندگی سے بہت متاثر تھیں۔ان کی کہانیوں میں اس دور کی تہذیبی، تاریخی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی حالات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ان کی تحریروں میں سب سے زیادہ جدید ماحول، تقسیم اور تقسیم کے طفیل میں آنے والی وہ تمام تبدیلیاں ہیں جس سے مصنفہ بہت زیادہ متاثر ہوئی تھیں۔

قرۃ العین حیدر بچپن سے ہی بہت ذہین اور سمجھدار واقع ہوئی تھیں وہ لکھتی ہیں ''خداوند کریم نے اپنے فضل و کرم سے مجھے video typing یادداشت عطا کی ہے چنانچہ اڑھائی برس کی عمر سے چند مناظر ذہن میں محفوظ ہیں۔'' جس کی مثال'' کار جہاں دراز ہے'' ہے۔اس میں قرۃ العین حیدر نے اپنی زندگی کے وسیع تجربات اور مشاہدات کو بڑی خوبی سے قلمبند کیا ہے۔زندگی کے مختلف واقعات اور تمام مشغولات میں انہوں نے کن کن حالات کا سامنا کیا اور وقتاً فوقتاً ان کی زندگی میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں وہ سبھی معلومات ایک دستاویز کی طرح'' کارِ جہاں دراز ہے'' میں موجود ہے۔آبا و جداد، والدین اور دوست واحباب کے ساتھ جس ماحول نے قرۃ العین حیدر کی ذہنی پرورش کی اس کی تفصیل بھی تحریر ہے۔ابتداء سے ہی ان کے چاروں طرف ادبی ماحول، محبت کرنے والے والدین، گھر میں جدید مشترکہ تہذیب، جدید تعلیم و تربیت کا پورا اہتمام حتیٰ کہ وہ تمام آسانیاں'' کارِ جہاں دراز ہے'' کے مطالعہ سے نظر آتی ہیں جو قرۃ العین حیدر کو میسر آئیں اور ان کی ذہن سازی کے لیے معاون رہیں۔اس کے متعلق صغریٰ مہدی نے لکھا ہے کہ:

> '' قرۃ العین حیدر کو خدا نے ذہانت، ذکاوت اور غیر معمولی گونا گوں صلاحیتوں سے نوازا تھا۔جن کو ان کی ذاتی محنت شوق، ماحول اور ماں باپ کی تربیت نے جلا دی۔ڈانس، میوزک، پینٹنگ اور شاعری سے دلچسپی لی۔مگر وہ سب ان کی ہوبیز بن گئیں مگر وہ بنیادی طور پر رائٹر تھیں

اوراسی میں نام پیدا کیا۔''۱۳؎

قرۃ العین حیدر کے مطابق ان کی پہلی کہانی سات سال کی عمر میں شائع ہوئی۔ جسے انہوں نے ترکی زبان کے ایک کارٹون اسکرپٹ سے ٹریس کر کے لکھا تھا جو رسالہ پھول کے سالنامے میں شائع ہوا۔ اسی کہانی کے شائع ہونے کے بعد مصنفہ کا حوصلہ بلند ہوا اور انہوں نے تاحیات لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ پہلی کہانی کے متعلق لکھتی ہیں:

''پہلی کہانی شاید سات سال کی عمر میں لکھی تھی جو مجھے اب تک یاد ہے کہ اس طرح شروع ہوئی تھی۔''رات کے بارہ بجے تھے۔ کاٹھ گودام کے اسٹیشن پر قلی لالٹین لئے ادھر ادھر دوڑتے پھرتے تھے۔ ہیروئن شاید میری گڑیا تھی جو خود ہی ٹکٹ خرید کر پاؤں پاؤں چل کر غلط ٹرین میں بیٹھ گئی تھی۔''۱۴؎

ڈاکٹر جمیل اختر نے اپنے تحقیق مقالہ ''قرۃ العین حیدر کا تخلیقی سفر تحقیق کی روشنی میں'' قرہ العین حیدر کے مذکورہ تحریر کو ایک بیان ثابت کیا ہے۔ کیوں کہ جس سال اور رسالے کا مصنفہ نے ذکر کیا ہے۔ اس رسالے کی تحقیق اور دریافت میں جمیل اختر نے ہندو پاک میں ''پھول'' کے سبھی فائلیں چھان ڈالے لیکن اس کا پتا نہ چلا۔ اس لیے اب تک کی تحقیق کے بعد مسودے کا تصدیقی ثبوت دریافت نہ ہونے پر مصنفہ کی بات صرف بیان معلوم ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل اختر:

''ہندوستان اور پاکستان کی لائبریریوں میں ''پھول'' کی جو فائل موجود ہے اس میں کہیں بھی مجھے یہ کارٹون نہیں ملا۔ چونکہ سن کا ذکر نہیں ہے اس لیے جب تک اس کی تصدیق نہیں ہو جاتی اس بیان پر یقین کرنا مشکل ہے۔''۱۵؎

قرۃ العین حیدر کا پہلا افسانہ ''ایک شام'' کے نام سے رسالہ ادیب میں شائع ہوا۔ یہ ایک طنزیہ افسانہ ہے جو لالہ رخ کے فرضی نام سے شائع ہوا تھا۔ اس افسانے کے بارے میں ''کار جہاں دراز ہے'' کے مطالعہ

سے علم ہوتا ہے کہ جب قرۃ العین نے یہ افسانہ لکھ کر چچا زاہدی کو دکھایا تو انہیں بہت پسند آیا، انہوں نے اصل نام کے بجائے فرضی نام سے شائع کرانے کی ہدایت کی اور کہا اصل نام سے چھپواؤ گی تو لوگ یقین نہیں کریں گے لہٰذا افسانہ ''ایک شام'' لالہ رخ کے فرضی نام سے شائع ہوا۔ قرۃ العین حیدر کے نام سے ان کا پہلا افسانہ ''ارادے'' کے نام سے ۱۹۴۳ء میں رسالہ ''ادیب'' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مصنفہ کے متواتر کئی افسانے منظر عام پر آئے۔ اس دور میں ان کی تحریروں کو بہت سراہا گیا، بعض نے تنقید بھی کی اور اسے دوسری دنیا کی تخلیق سے بھی تعبیر کیا۔ جب قرۃ العین حیدر کا پہلا افسانہ شائع ہوا تو عصمت چغتائی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ:

> ''قرۃ العین حیدر کا پہلا افسانہ شائع ہوا تو ایسا معلوم ہوا کہ افق ادب پر ایک نیا نویلا ستارہ طلوع ہو گیا ہے۔ چمک دمک سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب یہ ننھا منا سا ستارہ آفتاب ادب بن کر آنکھوں کو خیرہ کر دے گا ادبی دنیا میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ قرۃ العین حیدر کا مضمون دیکھ کر رسالے پر چھینا جھپٹی شروع ہو جاتی۔ واہ واہ کیا کہنا، کرشن چندر جیسی رومانیت، حجاب اسماعیل جیسی طلسماتی فضائیں اور عصمت جیسے چٹختے ہوئے مکالمے۔ جی نہیں خالص قرۃ العین کی اپنی تراش خراش، رنگینی اور لوچ جو کسی خدشے کا محتاج نہیں۔'' ۱۶

مذکورہ اقتباس سے یہ واضح ہے کہ ان کے ابتدائی افسانوں نے قارئین ادب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ کیوں کہ ان کے فن پاروں کا موضوع، اظہارِ بیان اور اسٹائل معاصر لکھنے والوں سے بالکل الگ تھا۔ ان کے افسانوں میں انگریزی کے الفاظ اور جملے مکالمے کے طور پر جا بجا ملتے ہیں جو اردو پڑھنے والوں کے لیے ایک نئے طرز کا تجربہ تھا۔ یہ افسانے ادب میں ایک نئی روش کے طور پر ابھر کر سامنے آئے جنہیں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۴/ افسانوں پر مشتمل ''ستاروں سے آگے'' کے نام سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا، جس میں بالکل ابتدائی افسانے شامل ہیں۔ اس کے متعلق عبدالمغنی نے لکھا ہے کہ:

''یہ اعلی متوسط طبقے کے خوش حال اور خوش باش نونہال ہیں جو زندگی کو
تفریح، ایک کھیل اور ایک تماشا سمجھتے ہیں......... امنگوں سے بھرے
ہوئے ہیں اور ستاروں پر کمنڈ ڈالنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کا فلسفۂ حیات
بالکل کھوکھلا بنجر اور بانجھ ہے۔''[۱۶]

قرۃ العین کے ابتدائی افسانے نوعمری میں لکھے گئے ہیں جو ان کے اردگرد ماحول کے ایک مخصوص دائر تک محدود نظر آتے ہیں۔ ان کی تخلیق میں فنی اور فکری گہرائی اس وقت پیدا ہونے لگی جب وہ اپنے اردگرد ماحول سے آگے نکل کر سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی اور تاریخی مسائل کو افسانے کا موضوع بنایا۔ اس نئے پس منظر کی تخلیقات کو حلقۂ ادب نے بہت سراہا اور عزیزوں نے ان کا حوصلہ بڑھایا۔ اس کے علاوہ مصنفہ کی زندگی میں آنے والے دو بڑے سانحات بھی تخلیقی محرک کا کام کیے، ایک ان کے والد کی موت اور دوسرا تقسیم ہند کا ناقابلِ یقین حادثہ۔ موخر الذکر سانحہ سے قرۃ العین حیدر پوری زندگی ابھر نہ سکیں، جس کا المیہ ان کی تخلیقات میں شعوری اور غیر شعوری طور پر نظر آتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''اگر کسی حادثے نے میرے لیے محرک کا کام کیا تو وہ پہلا حادثہ
۱۹۴۳ء میں میرے والد کی موت تھی اور دوسرا تقسیم ہند کے صدمے
نے میرے لکھنے پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ تقسیم ہند کے صدمے نے ۱۹۴۷ء
کے آخر میں مجھ سے ''میرے بھی صنم خانے'' لکھوائی جو آج بھی اردو
کے چند اچھے ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔''[۱۷]

قرۃ العین حیدر نے تقسیمِ ہند کو ذہنی طور پر کبھی قبول نہیں کیا۔ ان کی تحریروں سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ پوری زندگی تقسیم کی مخالفت کرتی رہیں کیوں کہ وہ ہندوستان کی تہذیب و کلچر اور مشترکہ سماجی زندگی کی پوری طرح قائل تھیں۔ انسان سے محبت اور انسانی قدریں انہیں بہت عزیز تھی۔ ۱۹۴۷ میں ہندو مسلم کے نام پر ہندوستان تقسیم ہوا جس کے بعد ہندوؤں کو پاکستان سے ہندوستان اور مسلمانوں کو ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے کا قرارداد پاس ہوا۔ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے والے مسلمانوں میں قرۃ العین حیدر

بھی شامل تھیں۔قرۃ العین حیدر کا ادب ہجرت کے اس جذبات واحساسات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔مصنفہ ہزاروں بلکہ لاکھوں غمزدہ مہاجرین کے دکھ درد کی نہ صرف چشم دید گواہ تھیں بلکہ اس دردوغم کو جسمانی اور ذہنی سطح پر برداشت بھی کیا۔بقول ابواللیث صدیقی

''ہزاروں انسانوں کو ان کے گھروں عزیزوں سے جدا ہوکر ایک نئے ماحول میں پناہ لینا پڑی، انہیں مہاجر، پناہ گیر اور کہیں کہیں بن بلائے مہمان اور حملہ آور سمجھا گیا۔ان کی مثال ایک ایسے نرم ونازک پودے کی سی تھی جن کو کسی چمن سے اکھاڑ کر ویرانے میں لا ڈالا گیا ہو۔قرۃ العین حیدر کے یہاں یہ احساس نہایت ذاتی،شخصی اور بڑا شدید ہے۔''[۱۸]

پاکستان میں قیام کے وقت قرۃ العین حیدر کا دوسرا افسانوی مجموعہ بعنوان ''شیشے کے گھر'' کے نام سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔اس میں کل ۱۲ افسانے شامل ہیں۔اس مجموعے کے تمام افسانوں کا مرکز تقسیم ہند اور اس کے بعد پیدا ہونے والے مسائل ہیں جس میں تہذیب کی پامالی،جلاوطنی،ہجرت کا کرب،انسانی رشتوں کی ناقدری،اپنوں سے بچھڑنے کا غم اور دیگر زوال پذیر حالات کا اظہار نہایت المناک انداز میں کیا ہے۔ تیسرے افسانوں کا مجموعہ ''پت جھڑ کی آواز'' ہے جو ۱۹۶۵ء میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہوا۔اس مجموعے پر قرۃ العین حیدر کو ۱۹۶۷ء میں ''ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ'' سے نوازا گیا تھا۔اس مجموعے میں کل آٹھ افسانے شامل ہیں جس کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ ہندوستان میں لوگ مختلف ذات اور طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔مصنفہ نے افسانے میں الگ الگ ذات اور طبقے کے لوگوں کے مسائل کو موضوع بنایا ہے جس میں اشرافیہ اور پسماندہ طبقے کے لوگوں کی تفریق واضح طور پر نظر آتی ہے۔''پت جھڑ کی آواز'' کے کرداروں کے ذریعے سماجی اور معاشی حالات کی جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے اس میں لوگوں کے حقیقی مسائل کا درد سماج میں اونچ نیچ کے تفریقی نظام کے زیر اثر دکھائی دیتا ہے۔

''روشنی کی رفتار'' قرۃ العین حیدر کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے جو ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے شائع ہوا۔اس کے تمام افسانے جدید افسانوں کے ذیل میں شمار ہوتے ہیں۔واقعہ کا بیان،کرداروں کے

احساسات اور نفسیاتی مسائل کا اظہار علامتی پیرائے میں کیا گیا ہے۔سماج اور معاشرہ کا جائزہ بڑی ہی فنکاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔قرۃ العین حیدر کا آخری افسانوی مجموعہ جسے جمیل اختر نے ترتیب دے کر ''قندیل چین'' کے نام ۲۰۰۰ء میں شائع کیا۔اس مجموعے میں وہ افسانے ہیں جو مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے تھے جسے جمع کر کے شائع کیا تھا۔

اردو ادب میں قرۃ العین حیدر کے افسانے بالکل منفرد اور نایاب ہیں جسے کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔ ان کے افسانے جس طرح مقبول ہوئے اسی طرح ان کے ناولوں کو بھی امتیازی حیثیت حاصل ہے اور یہ ناول اردو ادب میں قرۃ العین حیدر کی امتیازی شناخت کی اہمیت رکھتے ہیں۔

قرہ العین حیدر نے پاکستان میں قیام کے وقت تقریباً ۱۹ سال کی عمر میں اپنا پہلا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کے نام سے لکھا جو مکتبہ جدید لاہور سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔یہ ناول تقسیم ہند کے تاریک واقعہ پر مشتمل ہے جو اس وقت کے انسان اور اس کے وحشی پن رویے کو پیش کرتا ہے۔تقسیمِ ملک کے نام پر ہندو مسلم جنگ میں لاکھوں جانیں ناحق قتل ہوئیں،معصوم اور بے بس لوگوں کا خون سیاسی پالیسی کے تحت بہایا گیا جس میں خسارہ صرف اور صرف انسانیت کا ہوا۔اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے ان حالات کو پیش کیا ہے جس سے وہ خود دوچار ہوئی تھیں۔''میرے بھی صنم خانے'' کے متعلق لکھتی ہیں:

> ''جس وقت میں پاکستان گئی میں نے ''میرے بھی صنم خانے'' لکھنا شروع کر دیا تھا اور جیسا کہ سب کو معلوم ہے تقسیم ہند کا مجھے بڑا صدمہ تھا۔اس وقت تک مجھے احساس ہو گیا تھا کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔؟'' میرے بھی صنم''میں وہی ماحول،وہی کردار،وہی سارا قصہ پورا موجود تھا۔جیسے پورا سیٹ لگا ہوا تھا اور میں نے ناول لکھنا شروع کیا۔''۱۹

''میرے بھی صنم خانے''تقسیم ہند کے حالات پر لکھا گیا کامیاب ناول ہے جسے مصنفہ نے بڑی ہی فنکاری سے تحریر کیا ہے۔قرہ العین حیدر کا دوسرا ناول ''سفینۂ غم دل'' کے نام سے ہے جو ۱۹۵۲ء میں مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوا۔یہ ناول تین فصل ۵۸ باب اور اختتامیہ پر مشتمل ہے۔''سفینۂ غم دل'' کا موضوع تحریکِ

آزادی اور ملک تقسیم کے بعد پیدا ہونے والے فسادات اور ہجرت کے تجربے پر مشتمل ہے۔اس میں تقسیمِ ہند سے قبل اور مابعد کے لوگوں کی زندگی، اس کی نفسیات اور انسانی ذہنوں میں پیدا ہونے والا انتشار نظر آتا ہے۔ مصنفہ نے ہجرت کے کرب میں انسانیت اور انسان کی زوال پذیر زندگی کو دردانگیز انداز میں بیان کیا ہے اور یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کیسے فرسودہ سیاسی نظام نے ہندوستان کی مثال یافتہ مشترکہ تہذیب کو کھوکھلا کردیا۔

قرۃ العین حیدر کا تیسرا اور اردو ادب کا سب سے شاہکار ناول ''آگ کا دریا'' ہے۔ یہ ناول لاہور کے کتب خانہ مکتبہ جدید لاہور سے ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔اس ناول نے قرۃ العین حیدر کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ فکری اعتبار سے سب سے گہرا اثر مرتب کرنے والا واحد ناول ہے۔''آگ کا دریا'' موضوع کے اعتبار سے ہر قاری کے لئے ایک الگ اہمیت رکھتا ہے اس لئے اسے کسی ایک موضوع کے محدود تناظر میں نہیں دیکھا جا سکتا۔اس کے واضح موضوعات میں وقت، اواگمن، ماضی کا المیہ، مٹتے ہوئے تہذیب کا آئینہ اور انسانی قدروں کی پامالی وغیرہ ہیں لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ناول مذکورہ تمام موضوعات کا مجموعہ ہے۔

''آگ کا دریا'' ایک وسیع کینوس پر لکھا گیا ناول ہے۔اس ناول میں ہندوستان کی ہزار سالہ قدیم تہذیبی اور سماجی زندگی کو سمیٹا گیا ہے۔قرۃ العین حیدر نے ناول میں ڈھائی ہزار سال کی ہندوستانی تہذیب کی قدریں، جدید دور کا ماحولیاتی منظر، تقسیم ہند، نئے ملک پاکستان کا مقصد اور اس کے بعد پاکستان کی انسانی زندگی، ان سب صورتِ حال کو المیاتی انداز میں بیان کیا ہے۔ جب یہ ناول شائع ہوا تو پاکستان کے ادبی اور غیر ادبی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔اردو ادب کے ٹھیکے داروں نے ہنگامہ خیزی کی آگ بھڑکائی جس کے بعد ان پر اعتراضات، مخالفت اور طعن وتشنیع کا ایک طوفان برپا ہوگیا۔کسی نے انہیں ہندوستان نواز کہا تو کسی نے دیوی جی کا خطاب دیا۔کشور ناہید لکھتی ہیں کہ

> ''پاکستان میں 'آگ کا دریا' پہ بیہودہ بحث چلی۔ساری بحث کا مرکز تھا کہ یہ ہندوستان سے آئی ہیں۔اس لیے انہوں نے پاکستان کو دل سے

قبول نہیں کیا۔ بہت کم لوگ تھے جنہوں نے اس خوبصورت ناول کے
کینوس کو سمجھا اور اس کے کردار کا تجزیہ کیا تھا۔''[۲۱]

قرۃ العین حیدر ''آگ کا دریا'' کی اشاعت کے بعد متنازعہ مسئلے سے بیزار ہو کر لندن چلی گئیں۔ ۱۹۶۲ء میں خواجہ احمد عباس کی کوشش اور پنڈت جو ہر لال نہرو کے بلاوے پر ہندوستان چلی آئیں۔ یہاں آنے کے بعد ہندوستان کے شہر بمبئی میں ۱۸ سال تک قیام کیا۔ قرۃ العین حیدر کا ایک اور اہم ناول ''آخرِ شب کے ہم سفر'' کے نام سے مکتبہ جدید لاہور سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کو بعض نقادوں نے فنی اعتبار سے ''آگ کا دریا'' اور قرۃ العین حیدر کا سب سے بہتر ناول قرار دیا ہے۔ خود مصنفہ نے اس ناول کو بہت پسند کیا۔ وہ کہتی ہیں:

''It is my best novel and I am quite excited about it''

''آخرِ شب کے ہم سفر'' میں مصنفہ نے بنگال کی سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی حقائق کو بہت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ اس ناول کے کرداروں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل اجتماعی حقیقت کے ترجمان ہیں جو ۱۹۷۱ اور اس سے قبل رونما ہوئی تھی۔ ان کرداروں کا تعلق معاشرے کے مختلف طبقوں اور اقدار سے ہے جو وقت کے الٹ پھیر سے اپنی زندگی میں الجھے ہوئے ہیں۔ ناول میں کرداروں کی عملی سے تاریخ کے کچھ حقیقی واقعات ابھر کر سامنے آتے ہیں لیکن مصنفہ نے کرداروں کے حقائق سے انکار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''بنگال کی دہشت پسند اور انقلابی تحریک ۱۹۴۲ء کا اندولن، مطالبۂ
پاکستان، تقسیم ہند اور قیامِ بنگلہ دیش کے تناظر میں لکھے ہوئے اس ناول
کے تمام کردار فرضی ہیں۔۔۔۔۔۔ اور ہندوستانی، پاکستانی یا بنگلہ دیشی
شخصیت سے ان کا تعلق نہیں ہے''۔[۲۲]

قرۃ العین حیدر کا اگلا ناول ''کارِ جہاں دراز ہے'' ہے۔ اس ناول کا دائرہ اتنا وسیع اور معنی کی اتنی سطحیں ہیں کہ اسے پڑھتے ہوئے قاری افسانے اور حقیقت کے مابین الجھ جاتا ہے۔ ''کارِ جہاں دراز ہے'' تین جلدوں پر مشتمل ایک ضخیم سوانحی ناول (Family Saga) ہے، جس کی پہلی جلد ۱۹۷۷ء میں

منظرِ عام پر آئی جو بارہویں صدی عسوی سے ۱۹۴۷ء تک کے حالات و واقعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ دوسری جلد ۱۹۷۹ء میں چھپی جو ۱۹۴۷ء کے بعد سے لے کر ۱۹۷۶ء تک کے حالات و واقعات کا احاطہ کرتی ہے اور تیسری جلد اپنی پہلی دو جلدوں کے ساتھ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی جو عہد جدید کے ادبی اور سیاسی لوگوں کے احوال کے گرد گھومتی ہے۔ اس ناول کا عنوان علامہ اقبال کے ایک شعر سے ماخوذ ہے

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

''کارِ جہاں دراز ہے'' کے ضخیم حصہ پر قرۃ العین حیدر نے اپنے خاندانی ورثے اور اعلیٰ سلسلۂ نسب کو بیان کیا ہے گویا بنیادی طور پر یہ ان کے خاندان کی تاریخ ہے۔ مصنفہ کورافل رسل نے سوانحی ناول لکھنے کی طرف مائل کیا۔ جس کے متعلق وہ لکھتی ہیں:

> ''عرصہ ہوا رافل رسل نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے ایک لائف اینڈ ٹائمز قسم کی چیز لکھنی چاہیئے۔ اس وقت اس کتاب کا کوئی تصور میرے ذہن میں نہ آیا تھا لیکن جب لکھنے بیٹھے تو تکنیک اور صنف آپ سے آپ بن جاتی ہے اور حقیقت افسانے سے عجیب تر ہے''۔[۲۳]

''گردش رنگ چمن'' اڑتالیس ابواب پر مشتمل قرۃ العین حیدر کا یہ ناول ۱۹۸۷ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ اس ناول کا آغاز ۱۸۵۷ کے ہنگامہ خیز زمانے سے ہوتا ہے جس میں جنگ آزادی کے بعد ہندوستانی معاشرے میں اقدار کے زوال کی تصویر کشی اعلیٰ و پسماندہ طبقے کے کرداروں کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے جو اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی صورتِ حال تھی۔ مصنفہ نے ان شریف گھرانے کی لڑکیوں کی زندگی کو پیش کیا ہے جو حالات سے مجبور ہو کر طوائف بن گئی اور شدید احساسِ جرم، ذلت اور انتشار ذات میں مبتلا تھیں۔

۱۸۷۵ء کے بعد معاشرے کی تبدیلی نے جس طرح طوائف کے Institution کو فروغ دیا اس سے انسان کے اندر وجودی سطح پر ایک روحانی بحران پیدا ہو گیا، یہ ناول اسی صورتِ حال کی ایک دستاویز ہے جو

ہماری تہذیبی، ثقافتی اور اجتماعی تشخص پر ایک بدنما داغ ہے۔ قرۃ العین حیدر کے فنی وفکری ارتقاء میں ان کا اہم اور آخری ناول ''چاندنی بیگم'' ہے جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔ مصنفہ نے قیام پاکستان سے لے کر موجودہ دور کے معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں کو بیان کرتے ہوئے ہندوستان میں جنم لینے والے عصری مسائل کو نہایت عمدگی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول کا منظر نامہ اتنا وسیع ہے کہ کہانی مسلسل پھیلتی چلی جاتی ہے، لوگوں کے جذبات واحساسات اس کے دامن میں سمٹے نظر آتے ہیں۔ مصنفہ نے مذکورہ ناول میں زندگی کے اسرار ورموز اور تخلیقی تجربے کی ایسی صورتیں اور ایسی جہات دریافت کرنے کی کوشش کی ہیں جو ان کے دوسرے ناولوں میں نہیں ملتیں۔

قرۃ العین حیدر نے اردو ادب میں اپنے منفرد تخلیقات کے ذریعے ایک الگ پہچان قائم کی جن کی حیثیت دائمی ہے۔ ناولوں اور افسانوں کے علاوہ انہوں نے ناولٹ نگاری میں بھی اپنے فنی اور فکر کی گہرائی کا ثبوت دیا ہے۔ فکری وفنی حوالے سے دیکھا جائے تو ان کے پانچ ناولٹ ''سیتا ہرن'' ۱۹۶۰، ''چائے کے باغ'' ۱۹۶۴، ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' ۱۹۶۶، ''دلربا'' ۱۹۷۶ اور ''اگلے جنم موہے بیٹیا نہ کیجو'' ۱۹۸۹ء میں سامنے آتے ہیں۔ موخر الذکر کے علاوہ دیگر چاروں ناولٹ ''چار ناولٹ'' کے نام سے مجتمع کر کے ایجوکیشنل بک ہاؤس نے ۱۹۸۱ء میں علی گڑھ سے شائع کیا۔ مصنفہ کے ناولٹ میں ۱۹۴۷ء کے بعد کے حالات اور سماج کی حقیقی توقعات پر مبنی نیا معاشرہ کس نہج پر دکھائی دیتا ہے؟ اس کی واضح تصاویر ان ناولٹ میں موجود ہیں۔ اس میں لوگوں کا ذہنی اور فکری رویہ واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ناولٹ کے کرداروں کی فنی تعمیر وتشکیل کے متعلق قمر رئیس کی یہ رائے ملاحظہ کریں:

> ''پلاٹ کی تعمیر کا حسن اور کرداروں کی پیش کش کا انداز زیادہ ڈرامائی
> اور موثر ہے۔ عصری زندگی کے تضادات کی حقیقت پسندانہ تصویریں بھی
> اس دور کے ناول کے بجائے ناولٹ میں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں''۔[۲۴]

زمانی ترتیب سے دیکھا جائے تو قرۃ العین حیدر کا پہلا ناولٹ ''سیتا ہرن'' ہے جو مکتبہ اردو ادب لاہور سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ ناولٹ کا عنوان علامتی ہے، نام سن کر ذہن ہندو متھک واقعے کی طرف جاتا ہے لیکن

ناولٹ کی کہانی اس سے الگ ہے۔ناولٹ کا اصل موضوع وقت ہے جو اپنے ساتھ ان تمام چیزوں کو تبدیل کردیتا ہے جسے انسان نے برسوں محنت سے سجایا تھا۔قرۃ العین حیدر نے ایک بے بس اور مجبور عورت کے المیے کو بڑی مہارت کے ساتھ وقت کے تناظر میں پیش کیا ہے۔عورت کی فکر اور اس کا احساس مختلف زاویے سے سامنے آتا ہے اور عورت کے متعلق مرد معاشرہ کس طرح کا خیال رکھتا ہے تخلیق کار نے اس کا تجزیہ مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔یہ ناولٹ جغرافیائی تقسیم کے بعد پاکستان سے ہجرت کر کے آئی ایک عورت کی کہانی ہے جس کا پس منظر ہندوستان ہے۔اشاعت کے اعتبار سے ان کا دوسرا ناولٹ ''چائے کے باغ'' ہے جو حلقۂ ادب بمبئی سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔اس ناولٹ کا پس منظر ۱۹۴۷ کے بٹوارے کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان جانے والے مہاجرین ہیں جو ملک جانے کے بعد بھی وہ بنیادی طور پر ہندوستانی ہی ہیں۔یہ ناولٹ انہیں مہاجرین کرداروں کا المیہ ہے جو اپنی ثقافتی ،سماجی اور تہذیبی جڑوں سے کٹ چکے ہیں اور ہجرت کے کرب میں مبتلا ہیں ۔انہیں زندگی میں کہیں سکون حاصل نہیں ہے۔مصنفہ نے اس ناولٹ میں انسان کی معاشی ،معاشرتی اور سماجی سطح پر زندگی کے پسماندہ حالات کو دیکھنے ،سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

''ہاؤسنگ سوسائٹی'' قرۃ العین حیدر کا تیسرا ناولٹ ہے جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔یہ ناولٹ افسانوی مجموعہ ''پت جھڑ کی آواز'' میں شامل ہے۔اس ناولٹ کا موضوع تقسیم کے بعد ملک میں جنم لینے والی اقتصادی اور سماجی صورت حال ہے جس دور میں قدیم تہذیب وثقافت اور سرمایہ داری نظام کا خاتمہ ہوا۔اس کے بعد ملک میں نیا امیر طبقہ پیدا ہوا جس نے اپنی بے حس رویے سے غریب لوگوں کا استحصال کیا۔مصنفہ نے جدید سوسائٹی میں پیدا ہونے والے سماجی اور معاشی مسائل کو علامتی پیرائے میں پیش کیا ہے۔ہاؤسنگ سوسائٹی کے تعلق سے ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے لکھا ہے کہ:

''دراصل قرۃ العین حیدر نے جدید اور قدیم تہذیب کا موازنہ کر کے گم شدہ تہذیب کی اہمیت وافادیت پر زور ڈالا ہے۔پلاٹ ،کرار، مکالمہ نگاری، زبان واسلوب کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی منفرد تکنیک کے

ساتھ ہاؤسنگ سوسائٹی میں وہ روح پھونکی ہے جو اسے اردو کے بہترین
ناولٹ کا درجہ دلاتی ہے''۔ ۲۵

زمانی اعتبار سے ''دلربا'' قرۃ العین حیدر کا چوتھا ناولٹ ہے جو ۱۹۷۶ء میں رابعہ بک ہاوس لاہور سے شائع ہوا۔ یہ ناولٹ اپنے موضوع اور فن کے لحاظ سے منفرد ناولٹ ہے۔ اس کا موضوع ہندوستانی شوبز کی دنیا ہے جو پہلے اسٹیج ڈرامہ، اس کے بعد تھیٹر فلم اور پھر جدید دور کی فلمی دنیا کے ارتقاء و زوال کی داستان ہے۔ صنعتی ترقی کے بعد جدید دور میں عالمی سطح پر بڑی تبدیلیاں ہوئیں، ٹیکنیکل چیزوں کا عمل دخل انسانی زندگی میں زیادہ ہونے لگا اور لوگ ایڈوانس کلچر سے بہت قریب ہو گئے۔ بدلتے وقت کے ساتھ ہندوستانی اقدار میں بھی تبدیلی آئی۔ تھیٹر، اسٹیج اور فلم انڈسٹری کا ماحول بھی بدل گیا۔ مصنفہ نے اسی بدلتے اقدار کو طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے۔

''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' قرۃ العین حیدر کا آخری ناولٹ ہے جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ یہ ناولٹ عورت کی اقتصادی اور سماجی استحصال کی کہانی ہے جو اودھ کے زوال پذیر پسماندہ معاشرے میں مجبور اور مفلس زدہ زندگی گذار رہی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' میں اس دور کی عورت کے اس مسائل کو پیش کیا ہے جو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے دردر کی ٹھوکرے کھاتی ہے اور سماج میں ہر طرح سے اس کا استحصال ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے معاشرے کی برائیوں میں جوا، افیم، اور شراب وغیرہ کے اثرات جو معاشی تنگی اور معاشرتی خرابی کا سبب بن رہے ہیں ان کا اظہار بھی بہت ہی مؤثر پیرائے میں کیا ہے۔

افسانوی ادب کے ساتھ قرۃ العین حیدر نے غیر افسانوی ادب میں بھی اپنے فنی وفکری خیالات کا اظہار کیا ہے۔ غیر فکشن میں ان کی تحریریں رپورتاژ، خاکے اور تراجم پر مشتمل ہے۔ طرز فکر اور انداز بیان کے حوالے سے دیکھا جائے تو قرۃ العین حیدر اردو رپورتاژ نگاری میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ان کے رپورتاژ ''لندن لیٹر، پدماندی کے کنارے، درچمن ہر ورقے دفتر حال دیگر ست، کوہ دماوند، گل گشت، ستمبر کا چاند، جہانِ دیگر، چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ، خضر سوچتا ہے، دکن سانہیں ٹھار سنسار میں اور قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی

ہے'' نام سے مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ مذکورہ رپورتاژ کا مجموعہ کوہ دماونداورلیند لیٹر کے نام سے کتابی شکل میں بھی موجود ہے۔ان رپورتاژ میں مصنفہ نے مختلف مقامات کی سیاحت اور سفر کا خوبصورتی سے ذکر کیا ہے۔اگر موضوع کے حوالے سے ان رپورتاژ کے کینوس پر نظر ڈالی جائے تو ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔بقول سیما صغیر:

> ''قرۃ العین حیدر نے جہاں اردو کے افسانوی ادب کو وقار بخشا وہیں غیر افسانوی ادب میں بھی قابل ذکر اضافہ کیا۔ان کے خاکے ،رپورتاژ،مضامین اور تراجم اس کے گواہ ہیں۔انہوں نے گیارہ رپور تاژ لکھے ہیں۔''۲۶

قرۃ العین حید کا پہلا رپورتاژ'' لندن لیٹر'' کے نام سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔اس رپورتاژ میں مصنفہ نے سفرِ لندن اور وہاں کے فطری وغیر فطری مناظر کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا گیا ہے۔لندن میں رہنے والے پاکستانی،ہندوستانی اور امریکی نوجوانوں کا مختلف زاویے سے ان کی حالات زندگی کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ساتھ ہی وہاں کی معاشی صورت حال،تحریر وتقریر کی آزادی،تعلیم وتربیت کا نظام اور انگریزی تہذیب وکلچر کی زندہ تصاویر دکھانے کی کوشش کی ہے۔جسے پڑھ کر قاری بہت متاثر ہوتا ہے۔ان کا دوسرا رپورتاژ'' پدما ندی کے کنارے'' ہے۔یہ رپورتاژ'پاکستان رائٹرز گلڈ'' کے سالانہ جلسے کی روداد ہے جس میں قرۃ العین حیدر بطور خاص مدعو تھیں۔یہ انجمن بابائے اردو مولوی عبدالحق کے زیر صدارت قائم ہوئی تھی جو ادیبوں اور اہل قلم کاروں کی انجمن کے نام سے بھی مشہور تھی۔انجمن کے قیام کا مقصد پاکستانی ادیبوں کے حقوق کا تحفظ اور انہیں ادبی سہولت مہیا کرانا تھا۔قرۃ العین حیدر نے انجمن کے اسباب وعلل کے علاوہ اپنی سیاحت اور سفر کے دوران عظیم شخصیات سے ملاقات کا ذکر دلکش انداز میں کیا ہے۔تیسرا رپورتاژ سفرِ مصر پر مبنی ہے'' درچمن ہر ورقِ دفترِ حال دیگرست'' جو ۱۹۶۸ء میں رسالہ'نقوش' لاہور سے دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔اس میں مصر کی تاریخی واقعات اور تاریخی عمارات کا ذکر دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔وہاں کی مذہبی رسومات،تہذیب اور معاشرے کا رکھ رکھاؤ اس رپورتاژ کے حوالے سے دیکھنے کو ملتا ہے جس کا اظہار مصنفہ

نے بڑی دل جوئی سے کیا ہے۔

''کوہِ دماوند'' اپنی خصوصیت کے اعتبار سے منفرد رپورتاژ ہے جسے ادبی حلقے میں بے حد پسند کیا گیا اور کافی پذیرائی بھی ہوئی۔ ۱۹۶۸ء رسالہ آج کل میں شائع ہونے والا یہ رپورتاژ ایران کے سفر پر مبنی ہے۔ 'کوہِ دماوند' دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا تاریخ ایران اور دوسرا سفرِ ایران کے تجربات اور مشاہدات پر محیط ہے۔ ایران کی 'ملکہ فرح دیبا' کی تاج پوشی کے موقع پر قرۃ العین حیدر کو مدعو کیا گیا تھا، یہ رپورتاژ اسی موقع کی روداد ہے۔ مصنفہ نے اس میں ایران کی قدیم تاریخ کا جائزہ ماضی قریب اور ماضی بعید کے حوالے سے لیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے خسرو اور پرویز سے لے کر فردوسی کے عہد تک کا ایرانی تاریخ اور اس کی تہذیب و ثقافت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ مصنفہ نے ایران کے دو مشہور پہاڑوں 'دماوند' اور 'البرز' کا ذکر دلچسپ اور افسانوی انداز میں کیا ہے۔ ان کا اگلا رپورتاژ ''گل گشت'' کے عنوان سے شائع ہوا جو دو حصوں پر موقوف ہے۔ پہلے حصے میں سفرِ روس اور اس کے متعلق اور دوسرا حصہ وادیِ کشمیر اور اس کی خوبصورت فضاؤں پر مبنی ہے۔ ۱۹۷۴ء میں ملک روس کے ماسکو یونیورسٹی نے ایک 'ادبی کانفرس' منعقد کی جس میں قرۃ العین حیدر بھی مدعو تھیں۔ 'گل گشت' کا پہلا حصہ اسی ادبی کانفرس کی روداد ہے جہاں لوگوں کا استقبال اور ان کا خیر مقدم بڑی خندہ پیشانی سے کیا گیا۔ علاوہ ازیں مختلف جگہوں پر سیر و سیاحت کے بعد وہاں کا دلفریب منظر بھی پیش کیا ہے جن سے وہ متاثر ہوئی تھیں۔ دوسرے حصے میں کشمیر کی تہذیب و ثقافت، طرزِ معاشرت، ادبی دلچسپی، مزاج، رسم و رواج اور روزمرہ زندگی کے احوال کا احاطہ کیا ہے۔ وادیِ کشمیر پر لکھا گیا 'گل گشت' جسے پڑھتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ جنت نشاں کشمیر کی خوبصورتی اور اس کا فطری حسن لائق دید ہے۔

''ستمبر کا چاند'' قرۃ العین حیدر کا یہ رپورتاژ رسالہ ''نقوش'' لاہور سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۵۷ء میں ٹوکیو جاپان کی جانب سے ۲۹ واں سالانہ ادبی اجلاس منعقد کیا گیا جس میں قرۃ العین حیدر سمیت ۲۸ ممالک کے ادیب بھی شریک تھے یہ رپورتاژ اسی 'بین الاقوامی' کانفرنس کی روداد پر مشتمل ہے۔ مصنفہ نے مجلس میں موجود ادیبوں کے اذکار کے ساتھ سفرِ جاپان کا تفصیلی واقعہ، جاپان کی جغرافیائی تاریخ، تمدن اور تہذیبی حالات کے ساتھ دوسری جنگ عظیم سے لے کر ہیروشیما کی تباہی کا جاپان پر کیا اثر پڑا، اس منظر کی تصویر مؤثر

طریقے سے پیش کیا ہے۔ 'ستمبر کا چاند' کا انداز بیان اور منظر کشی اتنا عمدہ ہے کہ قاری ذہنی طور پر جاپان کا سیر کرنے لگتا ہے اور وہاں کی صورتحال سے واقف بھی ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ایک اور رپورتاژ ''جہانِ دیگر'' ہے یہ رپورتاژ مصنفہ کے سفر امریکہ کی روداد ہے جہاں اینگل نے رائٹرز ورکشاپ کے سالانہ اجتماع میں شرکت کے لیے مدعو کیا تھا۔ اس ورکشاپ میں بشمول قرۃ العین حیدر ۲۲ ممالک کے ادباء شریک ہوئے تھے۔ 'جہانِ دیگر' میں امریکہ کی معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور تاریخی معلومات کے علاوہ مشرق ومغرب کے مابین موازنہ کرکے اس کے مشترکہ مسائل کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف مذکورہ مسائل کو ابھارا ہے بلکہ زندگی کے متعلق مختلف حقائق کو بھی پیش کیا ہے۔

''خضر سوچتا ہے، وولر کے کنارے'' وادیِ کشمیر پر لکھا گیا دلچسپ رپورتاژ ہے۔ مصنفہ نے کشمیر کی آب وہوا، خوشگوار فضا، باغوں، پھولوں اور شعروادب کا ذکر لطیف انداز میں کیا ہے۔ اس رپورتاژ کی منظر نگاری نہایت دلکش اور جاذب نظر ہے۔ ''دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں'' قرۃ العین حیدر کی رپورتاژ نگاری میں اپنی خصوصیت کے اعتبار سے بالکل جدا ہے جو ہندوستان کے جنوبی علاقہ دکن کی تاریخی واقعہ پر لکھا گیا ہے۔ پہلی مرتبہ یہ رپورتاژ رسالہ 'افکار' علی گڑھ سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا جس میں دکن کی تاریخ، تہذیبی رچاؤ، علم وادب کا ماحول اور قدیم ادبی سرگرمیوں کی جھلکیاں دلکش اسلوب میں پیش کی ہیں۔ حیدرآباد مخلوط تہذیب ومعاشرت کا بہترین عکاس تھا یہاں کی فضا میں ادب شناسی کی خوشبو تھی جس نے بیش بہاں ادبی رتن پیدا کئے۔ مصنفہ نے دکن کی قدیم تاریخی واقعہ کے ساتھ اس عہد کے لوگوں کے واقعے بھی تحریر کئے ہیں جن میں دکنی تہذیب کے خوبصورت نقوش موجود تھے۔ ان کا آخری رپورتاژ ''قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آئی ہے'' کے عنوان سے ہے، یہ رپورتاژ پوری عالم دنیا کی روداد ہے۔ مصنفہ نے اس رپورتاژ میں عالمی سطح پر ہو رہے انسانی بربریت اور اس کی تباہی کا المیہ پیش کیا ہے۔ ملک کے انسانی رہنماؤں کو کوئی فکر نہیں کہ انسانیت کا زوال کس قدر ہو چکا ہے بلکہ وہ لوگوں کی خدمت کے بجائے جدید سائنسی ایجادات کو اہمیت دے رہے ہیں اور ملک کا عوام بھوکے ننگے زندگی گذار رہا ہے۔ تخلیق کار نے اسی انسانی قدروں کی پامالی اور زوال آمادہ زندگی کا مؤثر انداز میں ذکر کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے غیر افسانوی ادب میں رپورتاژ کے علاوہ متعدد ادبی اور غیر ادبی شخصیات کا خاکہ بھی لکھا ہے۔ جن میں ان کے والد سجاد حیدر یلدرم، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، چودھری محمد علی رودولوی، عصمت چغتائی، ابن انشاء اور غلام عباس وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے اپنے خاکوں میں شخصیت سے متعلق زندگی کے حالات و واقعات، ان کی منفرد خصوصیات، ظاہری و باطنی اوصاف، عادات و اطوار، حرکات و سکنات، اس کا رہن سہن اور طرز گفتگو کو ایجاز و اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ انسان کی پوری شخصیت قاری کے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ مصنفہ نے خاکہ تحریر کرتے وقت شخصیت کی ثنا خوانی یا اس پر منفی باتیں لکھنے سے گریز کیا ہے۔ اندھیری رات کا مسافر، دیکھ کبیرا رویا، چند باتیں، اور سرود شبانہ خاکہ نگاری کے عمدہ مثال ہیں۔ مشہور شخصیات کے خاکوں کے علاوہ قرۃ العین حیدر نے اپنی حالات زندگی پر ایک خاکہ ''آئینہ خانے میں'' عنوان سے تحریر کیا ہے جس میں ان کی زندگی کے اہم گوشوں کا علم ہوتا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ''سجاد حیدر یلدرم'' کے عنوان سے اپنے والد کا خاکہ لکھا۔ مصنفہ نے یلدرم کے حالات زندگی لکھتے ہوئے ذاتی اظہارِ بیان کے ساتھ ان کے معاصرین کی تحریروں سے بھی فیض اٹھایا ہے اور اپنے والد کی بہترین تصویر پیش کی ہے۔ سجاد حیدر یلدرم مصنفہ کے محبوب باپ اور آئیڈیل تھے۔ والدین کے لیے محبت، احترام اور عقیدت فطری ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ مصنفہ سے لامحالہ مبالغہ آرائی کا عنصر شامل ہو گیا یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے پاس کہنے کو اتنا کچھ تھا کہ ان کا قلم فنِ خاکہ نگاری تک محدود نہ رہ سکا اور اس میں ایک قسم کی انتہا پسندی آ گئی۔ مصنفہ کا ایک اور خاکہ ''دیکھ کبیرا رویا'' سعادت حسن منٹو پر لکھا گیا خاکہ ہے جس میں منٹو کی ادبی شخصیت اور اس کی ادبی پہچان کو موضوع بنایا گیا ہے۔ منٹو کی ادبی زندگی کے بعض گوشوں کو پیش کرتے ہوئے ان کے افسانوی فکر و فن کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جس سے ان کے افسانوں کی گہرائی کی جانب واضح اشارہ ہوتا ہے۔ منٹو کے ساتھ ان کے معاصرین کا رویہ جنہوں نے ان کے افسانوں کو فحش نگاری کے ترازوں پر رکھ کر فحش افسانہ نگار کا لقب دیا۔ خاکے کا اصل موضوع یہ ہے کہ منٹو کی زندگی میں بحیثیت افسانہ نگار وہ درجہ نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے لیکن اس کے انتقال کے بعد منٹو شناسی کا ایک وسیع حلقہ وجود میں آیا اور بے شمار مدوحین سامنے آ گئے۔ قرۃ العین حیدر کا یہ خاکہ اسی پس منظر کا عکاس ہے جسے طنزیہ پیرائے میں

بیان کیا ہے۔اسی موقع کا ایک منظر ملاحظہ کریں:

''۱۹جنوری سے پہلے جب تک وہ زندہ تھا اسے گالیاں دی جاتی تھیں۔ترقی پسند اسے رجعت پسند کا پرستار کہتے تھے۔رجعت پسندوں کے نزدیک وہ اس زمانے کا سب سے بڑا بے دین انقلابی اور ترقی پسند تھا۔اس رسہ کشی میں وہ غریب تو دوسری دنیا کو سدھارا۔اب بیٹھے سر دھنیے۔اب اسی کی یاد میں جلسے ہو رہے ہیں۔اظہارِ افسوس کی قرار دادیں پاس کی جارہی ہیں۔ایک سے ایک رقت انگیز بیان اس کے ہم عصروں کی طرف سے پریس میں آرہے ہیں۔''[۲۷]

''لیڈی چنگیز خان'' کے نام سے عصمت چغتائی کا خاکہ اپنی خصوصیت کے اعتبار سے منفرد اہمیت رکھتا ہے۔قرۃ العین حیدر نے عصمت چغتائی کا یہ خاکہ بڑے ہی والہانہ انداز میں پیش کیا ہے جس سے ان کے انسان دوست اور انسانی زندگی کے بعض نمایاں پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔اس کے علاوہ اردو ادب میں ان کا افسانوی انداز، موضوع، فکر وفن اور بے باک اظہار بیان کو بہت سراہا ہے اور ان کی خوبیوں کا دل سے اعتراف بھی کیا ہے۔مصنفہ نے ''داستان طرازی'' کے نام سے چودھری محمد علی رودولوی کا خاکہ لکھا۔خاکہ نگاری کے حوالے سے یہ خاکہ بہت ہی شاندار، سیر حاصل اور مثالی نمونہ ہے جس میں چودھری محمد علی ردولوی کی پوری شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔چودھری صاحب اردو زبان وادب کے شیدائیوں میں سے تھے جنھوں نے اردو کی خدمت دل و جان سے کی۔قرۃ العین حیدر نے رودولوی صاحب کی حالات زندگی اور اردو زبان سے جذبۂ محبت کو نہایت ہمدردی کے ساتھ پیش کیا ہے۔مصنفہ نے چودھری صاحب کی تحریری زبان، لکھنے کا اسٹائل اور اظہار و بیان کے انداز کا ذکر بڑی خوبصورتی سے خاکے میں پیش کیا ہے۔

''سرود شبانہ'' مشہور شاعر فیض احمد فیض کے متعلق لکھا گیا خاکہ ہے جس میں فیض کی زندگی، پنجاب کی آب وہوا، فیض کا شعر وادب سے دلچسپی کا رجحان اور ان کی شاعری کی مقبولیت کا ذکر کیا گیا ہے۔اس خاکے میں فیض کی روزمرہ زندگی، اس عہد کی تہذیب وروایت، سیاسی ماحول اور ان کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر مصنفہ

نے بڑی دل آویزی کے ساتھ کیا ہے۔قرۃ العین حیدر نے ''چاند نگر کا جوگی'' کے عنوان سے ابن انشاء کا خاکہ قلمبند کیا جو موضوع اور پس منظر کے لحاظ سے اہم خاکہ ہے۔مصنفہ نے ابن انشاء کی شاعری، ان کے خطوط ،ان کی تحریریں اور ان کے انٹرویو وغیرہ کی مدد سے ایک اچھا خاکہ لکھنے کی کوشش کی ہے جو دل میں اتر جائے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس خاکے کو پڑھ کر ابن انشاء کو مزید اچھے سے جاننے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔مصنفہ نے ابن انشاء کی شخصیت کے علاوہ ان کے فن پاروں کا فنی تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔قرۃ العین حیدر نے کرشن چندر کا خاکہ ''ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے'' کے عنوان سے لکھا ہے۔یہ خاکہ نہایت دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے۔اس میں کرشن چندر کی زندگی کے بعض مؤثر احوال قلمبند ہیں۔کرشن چندر بحیثیت قلم کار ادب میں کیا مقام رکھتے ہیں اس کی طرف بھی قارئین کو متوجہ کیا ہے۔خاکے کے ذریعے کرشن چند کی ادبی شہرت اور ان کی تخلیقی فکر کے رجحان کا بھی اندازہ ملتا ہے۔مصنفہ نے اپنے خاکے میں کرشن چندر کی تخلیقیت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں اردو کے بڑے تخلیق کاروں میں شمار کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے بعض ایسے شخصیات کے بھی خاکے لکھے ہیں جن سے وہ ذاتی طور پر واقف نہیں تھیں۔ایسے خاکوں کے لیے انہوں نے معاصرین کی تحریروں اور شخصیت کی ذاتی تحریروں سے استفادہ کیا ہے۔''چند باتیں'' اور ''اندھیری رات کا مسافر'' اسی طرز کے خاکے ہیں۔'چند باتیں' جانثار اختر کی زندگی پر لکھا گیا تعارفی خاکہ ہے جس میں مصنفہ نے جانثار اختر سے ہوئی چند ملاقاتوں کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے۔جانثار اختر کی شعری تخلیقات میں فکری اور معنوی گہرائی بیان کرتے ہوئے مصنفہ نے ان کی شعری انفرادیت کو بہت سراہا ہے۔''اندھیری رات کا مسافر'' مشہور شاعر اسرارالحق مجاز کا خاکہ ہے۔قرۃ العین حیدر نے اس خاکہ میں مجاز سے مختلف ادبی محفلوں میں ہوئی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔اس خاکے میں مجاز کی ادبی شہرت اور عوام میں ان کی مقبولیت کو لطیف انداز میں پیش کیا ہے۔شخصیت نگاری کے ساتھ مصنفہ نے مجاز کی شاعری کی معنوی تفہیم پر اپنے بصیرت افروز خیالات کا اظہار بھی کیا ہے جو شاعرِ مجاز کی پہچان ہے۔

مذکورہ تمام خاکوں میں زندگی کے احوال اور کچھ مؤثر واقعات کا ذکر نہایت ہی فن کاری سے کیا گیا ہے، ساتھ ہی ان کے تخلیقی فن پاروں کا تجزیہ، افہام وتفہیم ،اس کی اہمیت اور انفرادیت پر اپنے خیالات کا

اظہار بھی کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کے دیگر خاکوں میں ڈاکٹر رفیق زکریا، ہماری سلطانہ آپا، ہماری رشیدہ آپا، بیگم شائستہ اکرام اللہ، انیس قدوائی کی ادبی خدمات، پکچر گیلری کی ایک تصویر، شہاب الدین مالیر کوٹلی ، ایک منفرد خاتون اور الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے شامل ہیں۔قرۃ العین حیدر کی خاکہ نگاری کی خوبی یہ ہے کہ وہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ معلوماتی بھی ہے۔احوال و کوائف کو خوبصورت انداز میں بیان کرنے کے ساتھ کردار نگاری اور منظر نگاری کے ذریعے سماج اور ماحول کی بہترین تصویر بھی پیش کرتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے مختلف تخلیقی پہلوؤں میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے بڑوں کے ساتھ بچوں کے لیے بھی ادب لکھا ہے۔ مصنفہ کے اس تخلیقی فن کی طرف کم توجہ دی جاتی رہی ہے۔ادب اطفال میں مصنفہ نے جو کتابیں دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کیا ہے ان میں ''لومڑی کے بچے''، ''میاں ڈھینچو کے بچے''، '' بھیڑیے کے بچے''، ''ہرن کے بچے''، ''شیر خان''، ''بہادر''، ''ڈینگو'' اور ناول ''جن حسن بن عبد الرحمٰن'' شامل ہیں۔مصنفہ نے بچوں کی کہانیوں کا سلسلہ وار ترجمہ شروع کیا جو رسالہ ''پھول'' میں قسط وار شائع ہوئیں۔ان تراجم میں مصنفہ نے سلیس اور رواں زبان کا استعمال کیا ہے جو بچوں کے لیے آسان اور سہل ہوں۔'' بھیڑیے کے بچے'' میں مصنفہ نے اپنے قلم کی جادو بیانی سے بہت ہی آسان اور با محاورہ ترجمہ کیا ہے۔بچوں کی ذہن سازی کے ساتھ جانوروں کے ساتھ ان کا ہمدردانہ رویہ اور سماجی رواداری کے ساتھ گھر کی تربیتی زندگی کو بھی پیش کیا ہے۔''بہادر'' ایک تیز طرار گھوڑے کی کہانی ہے جو اپنے مالک کے تئیں وفادار ہے۔دیگر کہانیوں کے تراجم کی طرح زبان کی سادگی اور دلچسپی اس کہانی کا بھی عنصر ہے۔اس کہانی میں بھی بچوں کی دلچسپی اور ان کی ذہنی سطح کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔واقعات کی پیش کش اور منظر نگاری اپنی مثال آپ ہیں۔

بچوں کے لیے لکھا جانے والا ناول ''جن حسن بن عبد الرحمٰن'' ایک بہت دلچسپ سائنسی ناول ہے۔حقیقت پسندی کے دور میں داستانوی کرداروں اور تخیلات کے ذریعے مافوق الفطری واقعات کو پیش کرنا سوائے مبالغہ اور فرضی کے کچھ نہیں ہے کیوں کہ موجودہ دور ان طلسمات کے بجائے سائنسی ایجادات کا ہے۔اس ناول کے ذریعے مصنفہ کا مقصد بچوں میں عہد جدید کی تیز رفتاری اور سائنسی ترقی سے آگاہی

پیدا کرنا تھا۔قرۃالعین حیدر نے میخائل شولوخوف کے ایک ناول The fate of a man کا ترجمہ'' آدمی کا مقدر'' نام سے کیا۔ دراصل یہ ناول جرمن روس جنگ کے موضوع پر ہے۔ یہ ناول ایک روسی فوجی کی داستان بیان کرتا ہے جسے جنگ کے دوران جرمن فوج گرفتار کر لیتی ہے۔ جرمنوں کی بمباری سے اس فوجی کا گھر اور پورا خاندان ختم ہو جاتا ہے اور وہ دنیا میں اکیلا رہ جاتا ہے۔ روسی شخص جرمن قوم کے ظلم وستم کی ایسی ایسی داستانیں سناتا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔'' آدمی کا مقدر'' کے علاوہ قرۃالعین حیدر نے 'ویرا پانوا' (Vera Panova) کے ایک ناول ''یودوکیہ'' کا بھی ترجمہ کیا۔ یہ ایک سماجی ناول ہے جس کا مرکزی کردار ایک لڑکی یودوکیہ ہے۔ یودوکیہ لاولد ہے لیکن اس کے دل میں بچوں کے لیے بے پناہ محبت ہے وہ پانچ لاوارث بچوں کی اپنی اولاد کی طرح پرورش کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ناول میں مشرقی سماج کے دوسرے دلچسپ پہلو بھی نظر آتے ہیں۔ مشرقی سماج کی عکاسی کے ساتھ مصنفہ نے بڑی مہارت کے ساتھ ترجمہ کا حق بھی ادا کیا ہے۔

قرۃالعین حیدر کی تحریریں فکشن اور غیر فکشن کے علاوہ ترجمہ نگاری پر بھی مشتمل ہیں۔ ترجمے کا کام کسی بھی دوسری تخلیقی عمل سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہوتا ہے جسے مصنفہ نے بڑی فن کاری سے پیش کیا ہے۔ کیونکہ ایک فن کار اپنے خیالات کو تخلیقی جامہ پہنانے کے لیے جتنا سوچتا ہے اس سے کہیں زیادہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے والا سوچتا ہے۔ ترجمہ نگار پر زیادہ ذمہ داریاں ہوتی ہیں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ معیاری ترجمہ اسی وقت کر سکتا ہے جب دو زبانوں پر عبور رکھتا ہو اور بالخصوص اس موضوع کا بہتر علم رکھتا ہو جس کا ترجمہ کر رہا ہے اور ساتھ ہی دونوں زبان کی تہذیب و کلچر سے بھی واقف ہو۔ قرۃالعین حیدر کوئی زبانوں کا گہرا علم تھا اور مختلف تہذیب و کلچر سے بھی واقف تھیں۔ انہوں نے انگریزی، فارسی اور روسی زبان کی کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ اپنی اردو کہانیوں کے ساتھ دوسرے ادیبوں کی کہانیوں کا بھی انگریزی میں کامیاب ترجمہ کیا ہے۔ مصنفہ نے جن کتابوں کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ غالب اینڈ ہز پوئٹری (علی سردار جعفری اور قرۃالعین حیدر)

۲۔ اسٹوریز فرام انڈیا (خوشونت سنگھ اور قرۃ العین حیدر)
۳۔ دی نوچ گرل (قرۃ العین حیدر)
۴۔ ڈانسنگ گرل (قرۃ العین حیدر)

ابن انشاء، انتظار حسین، ابوالفضل صدیقی، خالدہ اصغر، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کی کہانیوں کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ غالب، فیض سودا اور میر انیس کے کلام کا ترجمہ بھی اردو سے انگریزی میں کیا۔ قرۃ العین حیدر کے اردو سے انگریزی تراجم میں انہوں نے اپنے بیشتر تخلیقات کا ترجمہ اردو سے انگریزی میں کیا ہے۔ ذیل میں ملاحظہ کریں

۱۔ میرے بھی صنم خانے۔ My taples. too
۲۔ آگ کا دریا۔ The river of fire
۳۔ آخر شب کا ہم سفر۔ Fire flies in the mist
۴۔ پت جھڑ کی آواز۔ The sound of falling leaves
۵۔ جلاوطن۔ The exiles
۶۔ اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو۔ A womans Life
۷۔ چائے کے باغ۔ Tea Garden of sylhet

قرۃ العین حیدر کے اردو سے انگریزی تراجم کے علاوہ ان کے وہ تراجم جو انگریزی اور دیگر زبانوں سے اردو میں ہے اس میں مصنفہ نے بڑی مہارت اور ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ زبان پر دسترس کے ساتھ مقامی تہذیب وثقافت، تشبیہات واستعارات اور زمینی حقائق سے واقفیت نے کہانی کو بے حد دلچسپ بنادیا ہے۔ کسی غیر ملکی زبان کے ادب پارے کو اپنے ماحول، سماج اور کلچر کے مطابق ڈھالنا انتہائی مشکل کام ہے لیکن اس مشکل کام کو آسان کر کے جس طرح مصنفہ نے پیش کیا ہے یہ انہی کا کمال ہے۔ ان کے اس ترجمے سے ان کی مشاقی، محنت اور بیانیہ پر مکمل مہارت کا پتا چلتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ فکشن اور غیر فکشن کے علاوہ صحافت نگاری، مصوری اور فوٹو

گرافی کی صلاحیتیں بھی سامنے آتی ہیں۔انہوں نے ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔اے انگریزی کرنے کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کے ہی ایک گورنمنٹ اسکول ''اسکول آف آرٹس'' سے مصوری کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی،اس کے بعد مصوری کی مزید تعلیم حاصل کرنے اور اپنی صلاحیت کو اور نکھارنے کی غرض سے لندن میں'' ہیدر لیز اسکول'' میں داخلہ لیا۔اسی دوران دل میں صحافت نگاری کی تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔مصنفہ نے لندن کے ''ریجنٹ اسٹیٹ پالی ٹکنیک'' میں داخلہ لیا اور صحافت کی تعلیم حاصل کی۔

قرۃ العین حیدر کی صحافت نگاری اور ملازمت کا آغاز ۱۹۵۱ء میں پاکستان کے ''محکمہ وزارت اطلاعات ونشریات'' سے شروع ہوا۔اس محکمے میں بالخصوص فلم اور اشتہارات کے محکمہ میں اطلاعات کے افسر کی حیثیت سے مصنفہ کا تقرر ہوا۔چونکہ مصنفہ کا تعلق اس محکمے کے شعبہ اشتہارات سے تھا اس لیے انہیں پاکستان میں ہر طرح کے ترقیاتی محکموں کی کارکردگی کے بارے میں تمام تفاصیل عوام تک پہنچانے اور اشتہار تیار کرنے کی تھی جسے محنت اور ایمانداری کے ساتھ مصنفہ پورا کرتی تھیں۔۱۹۵۲ء میں برطانیہ میں لندن کے پاکستان ہائی کمیشن میں 'پریس اتاشی' کے عہدے پر فائز ہوکر پاکستان اور برطانیہ کے باہمی تعلقات کو بہتر اور مستحکم بنانے میں اہم رول ادا کیا۔۱۹۵۴ء میں پی۔آئی۔اے کراچی میں بطور اطلاعات افسر کا عہدہ سنبھالا اور ۱۹۵۶ء میں کراچی سے ہی شائع ہونے والے اخبار ''پاکستان کوارٹرلی'' کے اعزازی مدیر بھی مقرر ہوئیں۔ سیاسی اتھل پتھل اور ذہنی خلیج کے باعث قرۃ العین حیدر ۱۹۶۲ء میں ہندوستان واپس لوٹ آئیں اور بمبئی میں قیام پذیر ہوئیں۔۱۹۶۴ء میں بمبئی سے نکلنے والا انگریزی جریدہ ''امپرنٹ'' میں مینیجنگ ایڈیٹر کی حیثیت وابستہ ہوئیں۔ جہاں وہ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۸ء تک کام کرتی رہیں اور اسی دوران انہوں نے صحافتی میدان میں کافی شہرت حاصل کرلی۔اس کے بعد قرۃ العین حیدر ہفت روزہ انگریزی اخبار ''السٹریٹڈ ویکلی'' کے مجلس ادارت سے منسلک ہوئیں اور ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۶ء تک اپنے کاموں سے پڑھنے والوں کو متاثر کرتی رہیں۔عبدالستار ردولی لکھتے ہیں کہ:

''وہ مشہور انگریزی ہفت روزہ ''السٹریٹڈ ویکلی'' سے وابستہ ہوئیں تو اردو دنیا میں ایک تاریخ ساز واقعہ بنا۔''السٹریٹڈ ویکلی'' کا اس زمانے

میں ڈنکا بج رہا تھا، ہر پڑھا لکھا شخص چاہے وہ کسی زبان سے تعلق رکھتا
ہو، اس ہفت روزہ کا قاری ہونا اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا۔'' ۲۸

قرۃ العین حیدر کو صحافت نگاری کے علاوہ مصوری اور فوٹو گرافی کی بھی اچھی خاصی جانکاری تھی کیونکہ انھوں نے لکھنؤ کے ایک گرنمنٹ اسکول ''اسکول آف آرٹس'' سے مصوری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی مختلف کتابوں میں خود کی بنائی ہوئی تصویریں شامل ہیں، اس کے علاوہ مصنفہ سے ملنے والوں نے اپنی تحریروں میں ذکر کیا ہے کہ ان کی بنائی ہوئی بہت سے تصویریں ان کی گھر کے دیواروں پر لگی ہوئی تھیں۔

صحافت نگاری، مصوری اور فوٹو گرافی کے ساتھ ساتھ قرۃ العین حیدر کو فلم سازی اور موسیقی سے بھی بے حد دلچسپی تھی۔ مصنفہ نے ہندوستان میں راجکمار شیو پوری، گیان وتی، بھٹنا گر، سورج بخش سری واستوا اور راوین جونز سے اور پاکستان میں کلاسیکل موسیقی کے استاد بڑے آغا اور مسٹر فرانڈیز سے موسیقی اور پیانو کی تعلیم حاصل کی تھی۔ فلم سازی کے لیے امریکن ایڈوائزر سے فلم سازی اور اسکرپٹ رائٹنگ کی ٹریننگ لی تھی اور اس کے بعد ہندو پاک میں بیسیوں دستاویزی اور اشتہاری فلمیں بنائی۔ مصنفہ ایک انٹر یو میں فلم سازی اور اسکرپٹ رائٹنگ کی تربیتی مقصد اور اپنی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

''ٹریننگ کا مقصد یہ تھا کہ ہم ڈی۔اے۔وی۔پی میں ڈاکومنٹری فلم
بناتے تھے۔ اس کے لیے صحیح تکنیک کی جانکاری اور معلومات۔۔۔ فلم
سازی ہو یا رائٹنگ ہو یا پینٹنگ ہو جس میں انسان اپنی تخلیقی صلاحیت کو
بروئے کار لا سکے اس سے مجھے دلچسپی تھی اور آج بھی ہے۔'' ۲۹

قرۃ العین حیدر کی پہلی اشتہاری فلم ''پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز'' کی افتتاحی فلائٹ لندن کے لیے مسافروں کی ضروریات اور فلائٹ کی عام معلومات پر مشتمل تھی۔ مصنفہ کی یہ دستاویزی فلم بہت کامیاب رہی۔ اس کے بعد عزیز احمد کی فرمائش پر 'پاکستانی لوک ناچوں' پر مشتمل ایک رنگین ڈاکومنٹری فلم بنائی۔ اس کے لیے انھوں نے ڈھاکہ اور پھر چٹا کانگ ہل ٹریکس کا سفر کیا اور بڑی مشکل اور محنت کے بعد یہ فلم تیار کی۔ پاکستان میں جب ایک روپے والی کرنسی رائج کی جانے والی تھی تو اس کی تشہیر کے لیے مصنفہ نے ایک کارٹون فلم بنائی۔

یہ پاکستان میں پہلی کارٹون فلم تھی جس کا اسکرپٹ اور کمنٹری انہوں نے خود ہی لکھے۔ پاکستان سے واپس آنے کے بعد قرۃ العین حیدر ہندوستانی فلم ڈویژن سے وابستہ ہوگئیں۔ انہوں نے یہاں پر بھی متعدد اشتہاری فلمیں بنائی جن میں سے ایک فلم ''مالوا'' ہے۔ اس فلم کے لیے فلم ڈویژن نے ان کو ایوارڈ دیا اور اسی فلم پر ۱۹۶۳ء میں ''پری سی ڈنٹ سلور میڈل'' بھی ملا۔ اس کے علاوہ بہت سی مختصر فلمیں مشرقی اور مغربی پاکستان کے متعلق بنائیں جس میں دونوں علاقوں کی تہذیبی پس منظر اور اس کے فرق کو نمایاں کیا گیا ہے۔ مصنفہ نے بعض فلمیں بنگال، پنجاب اور سندھ کے کسانوں اور ان کے دیہی مسائل پر بھی بنایا۔ ڈاکومنٹری فلموں کے بعد ایک کمرشل فلم ''ایک مسافر ایک حسینہ'' کے ڈائیلاگ بھی تحریر کیئے لیکن مصنفہ کو اصل مہارت دستاویزی فلموں میں ہی حاصل ہے۔

قرۃ العین حیدر کو دیے گئے اعزازات و انعامات جو ان کی ادبی کاوشوں کے عوض میں اعزازی طور پر ملیں ہیں ان کا مختصراً ذکر ضروری ہے۔

۱۔ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ (افسانوی مجموعہ پت جھڑ کی آواز) ۱۹۶۷ء
۲۔ سویت لینڈ نہرو ایوارڈ (برائے مترجم) ۱۹۶۹ء
۳۔ پرویز شاہدی کل ہند ایوارڈ (مغربی بنگال اکیڈمی) ۱۹۸۱ء
۴۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ (برائے مجموعی ادبی خدمات) ۱۹۸۲ء
۵۔ غالب ایوارڈ ۱۹۸۲ء
۶۔ پدم شری (قومی اعزاز) ۱۹۸۴ء
۷۔ غالب مووی ایوارڈ ۱۹۸۴ء
۸۔ آندھرا پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ ۱۹۸۷ء
۹۔ اقبال سمان (حکومت مدھیہ پردیش) ۱۹۸۷۔۸۸ء
۱۰۔ بھارتیہ گیان پیٹھ ایوارڈ (برائے مجموعی خدمات) ۱۹۹۰۔۸۹ء

۱۱۔ بھائی ویر سنگھ انٹرنیشنل ایوارڈ ۱۹۹۱ء

۱۲۔ فیلو آف ساہتیہ اکیڈمی ۱۹۹۴ء

۱۳۔ کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (اردو اکیڈمی دہلی) ۲۰۰۰ء

اردو ادب کو بیش قیمتی سرمایہ عطا کرنے والی ادیبہ، قرۃ العین حیدر نے اپنی پوری زندگی ادب کی خدمت میں گزار دی۔ بالآخر زندگی تمام ہوئی اور وہ ۲۱/اگست ۲۰۰۷ء کی رات اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ ان کی نمازِ جنازہ اگلے دن ۲۲/اگست ۲۰۰۷ء کو عصر کی نماز کے بعد جامع مسجد، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی کے میدان میں ادا کی گئی اور جامعہ کے اسی خاص قبرستان میں ان کو سپردِ خاک کیا گیا۔

....

حواشی:

۱۔ قرۃ العین حیدر، رسالہ ''نقوش لاہور'' (آپ بیتی نمبر) ص ۱۴۱۷۱۔ جون ۱۹۶۴ء

۲۔ قرۃ العین حیدر'' کارِ جہاں دراز ہے'' (جلد اول) فن اور فنکار، بمبئی ص ۲۱/۲۲۔ جون ۷۷ ۱۹ء

۳۔ قرۃ العین حیدر، مضمون ''سجاد حیدر یلدر'' رسالہ 'پگڈنڈی امرتسر' (یلدرم نمبر) جلد ۹ شمارہ ۵ ص ۳۹۔ ۱۹۶۲ء

۴۔ رشید احمد صدیقی، مضمون ''یلدرم کی یاد میں'' رسالہ 'پگڈنڈی امرتسر' (یلدرم نمبر) جلد ۹ شمارہ ۵ ص ۱۰۱۔ ۱۹۶۲ء

۵۔ قرۃ العین حیدر، مضمون ''سجاد حیدر یلدرم'' رسالہ 'پگڈنڈی امرتسر' (یلدرم نمبر) جلد ۹ شمارہ ۵ ص ۳۸۔ ۱۹۶۲ء

۶۔ قرۃ العین حیدر'' کارِ جہاں دراز ہے'' (جلد اول) فن اور فن کار، بمبئی، ص ۱۵۲۔ ۱۹۷۷ء

۷۔ قرۃ العین حیدر، رسالہ ''نقوش لاہور'' (آپ بیتی نمبر) ص ۱۴۲۷۱۔ جون ۱۹۶۴ء

۸۔ ڈاکٹر مجیب احمد'' قرۃ العین حیدر ذات وصفات'' کاک آفسیٹ پرنٹرس۔ دہلی، ص ۱۲۔ ۲۰۰۸ء

۹۔ قرۃ العین حیدر، رسالہ ''نقوش لاہور'' (آپ بیتی نمبر) ص ۱۴۲۷۱۔ جون ۱۹۶۴ء

۱۰۔ قرۃ العین حیدر'' کارِ جہاں دراز ہے'' (جلد اول) فن اور فنکار، بمبئی ص ۳۸۷۔ جون ۷۷ ۱۹ء

۱۱۔ ڈاکٹر جمیل اختر ''زندگی نامہ: قرۃ العین حیدر'' NCPUL نئی دہلی، ص ۳۴۔ ۲۰۱۴ء

۱۲۔ سلمیٰ صدیقی'' قرۃ العین حیدر کا فن''، بحوالہ قرۃ العین حیدر: تحریروں کے آئینے میں از ڈاکٹر اختر سلطانہ، وی۔ ایس۔ گرفکس، حیدرآباد ص ۴۵۷۔ ۲۰۰۵

۱۳۔ صغریٰ مہدی مضمون'' قرۃ العین حیدر: سب جیسی سب سے الگ''، مشمولہ قرۃ العین حیدر شخصیت اور فکر وفن (مقالات وروداد وسیمینار) خدا بخش لائبریری ص ۱۳۳

۱۴۔ قرۃ العین حیدر'' کارِ جہاں دراز ہے'' (جلد اول) فن اور فن کار، بمبئی، ص ۲۰۳۔ ۱۹۷۷ء

۱۵۔ ڈاکٹر جمیل اختر مضمون، '' قرۃ العین حیدر کا تخلیقی سفر تحقیق کی روشنی میں''، سہ ماہی رسالہ 'فکر ونظر' جلد ۵۳

شمارہ۳،ص ٦٨۔ستمبر٢٠١٦

١٦۔ عصمت چغتائی،''پوم پوم ڈارلنگ''،(مجموعہ چھوئی موئی) کتب پبلشر لمیٹڈ ص١٣٦۔١٩٥٢ء

١٧۔ ڈاکٹر عبدالمغنی،''قرۃالعین حیدر کا فن'' موڈرن پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی،ص٤٣/٤٤۔١٩٨٥ء

١٨۔ قرۃالعین حیدر،''آئینہ خانہ میں''مشمولہ'ماہنامہ کتاب'لکھنؤص ١٥۔١٩٦٣ء

١٩۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی،''آج کا اردو ادب''،قمر کتاب گھر کراچی،ص٢٣٠۔١٩٨٢ء

٢٠۔ قرۃالعین حیدر''آئینہ خانہ میں''،مشمولہ،ماہنامہ،کتاب،لکھنؤص١٥،١٩٦٣

٢١۔ کشور ناہید،بحوالہ'تحریروں کے آئینے میں'از،ڈاکٹر اختر سلطانہ،مطبع،وی ایس گرافکس،حیدرآباد، ٢٠٠٥ص٦٠٣

٢٢۔ قرۃالعین حیدر،''آخرِ شب کے ہم سفر''،(پیش لفظ)ایجوکیشنل بک ہاؤس،علیگڑھ،١٩٨٤ء

٢٣۔ قرۃالعین حیدر''کارِ جہاں دراز ہے''(جلداول) فن اور فنکار،بمبئی ص١٤۔جون ١٩٧٧ء

٢٤۔ قمر رئیس،'قرۃ العین حیدر کے کارنامے پر ایک نظر'رسالہ،روشنائی،قرۃ العین حیدر نمبر،جولائی تا سمبر،٢٠٠٨ص٢٢٣

٢٥۔ وجاحت حسین رضوی،مضمون''قرۃ العین حیدر کی ناولٹ نگاری کا اجمالی تجزیہ''،'رسالہ نیا دور' (قرۃالعین حیدر نمبر)ص ١٥١۔فروری،مارچ ٢٠٠٩ء

٢٦۔ ڈاکٹر سیما صغیر'کوہِ دماوند'،رسالہ،نیا دور،قرۃالعین حیدر نمبر،فروری،مارچ،٢٠٠٩ص٩٨

٢٧۔ قرۃالعین حیدر،خا کہ'دیکھ کبیرا رویا'١٩٨٩ص٨٧

٢٨۔ ڈاکٹر جمیل اختر،''اندازِ بیاں اور(قرۃالعین حیدر سے بات چیت)فرید بک ڈپو،نئی دہلی،ص٤٧۔ ٢٠٠٥ء

٢٩۔ عبدالستار ردولی،مضمون''قرۃالعین حیدر چند باتیں اور چند ملاقاتیں''،مشمولہ'قرۃالعین حیدر شخصیت اور فن'مرتب ڈاکٹر صاحب علی،شعبۂ اردو ممبئی،ص١٨۔٢٠٠٨ء

باب دوم

قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل کی عکاسی

اردو افسانے کی روایت میں قرۃ العین حیدر کا نام منفرد اور یگانہ ہے۔انہوں نے متعدد افسانے لکھے جن کی تعداد ۱۰۳ ہے، یہ افسانے پانچ مجموعوں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔قرۃ العین حیدر کے افسانے اپنے عہد کے سماجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، تاریخی اور اقتصادی مسائل کے بہترین ترجمان ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو ان کا موضوعاتی کینوس دور تک پھیلا ہوا ہے اور اس کی مختلف جہتیں نظر آتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات کا جائزہ مختلف زاویے سے لیا جاتا رہا ہے۔آج بھی ان کے افسانوں میں نت نئے معنی اور حقائق دریافت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔ان کے یہاں یہ دریافت افسانوی فکر وفن کے ساتھ افسانوں کے موضوعات اور کرداروں کی زندگی کے مختلف مسائل کے پیش نظر کی جاتی ہے۔قرۃ العین حیدر کے افسانوی جہت کے متعلق گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ:

> ''ان کا فکشن اردو میں ایک نئ ذہنی افق کا درجہ رکھتا ہے جس کی معنویت کو پوری طرح سمجھنے میں وقت لگے گا۔وہ صرف ایک عظیم فنکار ہی نہیں بلکہ انسانیت کی عظیم مثال بھی تھیں ایسی عبقری شخصیت صدیوں میں جنم لیتی ہیں جو اپنی ذات وصفات اور خدمات سے دنیا کو متاثر کرتی ہیں۔''[۱]

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کی تفہیم اور ان کے افسانوں کے پسماندہ کرداروں کی زندگی کے مسائل کا تجزیاتی مطالعہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ان کے افسانوں کا موضوعاتی دائرہ بہت وسیع ہے اور کرداروں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔اسی لئے ہمیں ان کے افسانوں میں سماج کے دبے کچلے، نچلے طبقے کے پسماندہ کرداروں کی روزمرہ زندگی اور ان کے مسائل کا جائزہ لیتے وقت مصنفہ کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش

کرنی چاہیئے کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں؟ کرداروں کے عروج اور زوال میں کہاں کہاں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں؟ ان کے یہاں کرداروں کے طبقاتی تشخیص کے کیا کیا پیمانے ہیں؟ اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کے کرداروں کی پیش کش میں ان کا فکری رجحان کیا ہے؟ تہذیبی، سماجی، ثقافتی، معاشی اور معاشرتی رویوں کے متعلق ان کے کرداروں کی کیا سوچ ہے؟ اس طرح ان کا بنیادی نقطۂ نظر ہمارے سامنے آتا ہے جس کے بعد ان کی تخلیقات کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے یہاں کردار نگاری میں فکر کی گہرائی ملتی ہے جس کے پیچھے ایک پورا پس منظر کار فرما ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کے بیشتر کردار پڑھے لکھے اعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ چاروں طرف تعلیم یافتہ لوگوں کی بھیڑ، گھر میں کتابوں کا ذخیرہ، چاروں طرف مال و اسباب کی فراوانی اور جدید ماحول کی اعلیٰ سوسائٹی، جس میں لوگ زندگی گزارتے نظر آتے ہیں لیکن قرۃ العین حیدر کے مشاہدات اور تجربات کا دائرہ صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں سماج کی اعلیٰ سوسائٹی کے ساتھ پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل بھی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے فکشن میں پسماندہ طبقے کی کردار نگاری کے متعلق سید محمد اشرف صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''عینی کے ادب پر دو الزامات بہت شد و مد کے ساتھ لگائے گئے۔
>
> نمبرا: اعلیٰ طبقے کے لیے لکھتی ہیں اور اعلیٰ طبقے پر لکھتی ہیں۔
>
> نمبر۲: عینی کی زبان انگریزی آمیز ہے۔
>
> حیرت اس بات پر ہے کہ ان الزامات کو بے حد سینئر نقادوں نے ہوا دی تھی اور اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ ان الزامات کے پچاس برس بعد بھی کچھ مکتبی نقاد آج تک انھیں الزامات کا آموختہ پڑھ رہے ہیں۔ عینی کا لکھا ہوا متن ان الزامات کے خلاف ثبوت فراہم کرتا ہے۔
>
> کارمن، ''نظارہ درمیاں ہے'' کی پیرو جاہ، ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' کی ہیروئن ثریا، ''اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو'' کی دونوں بہنیں، ''یاد کی اک

دھنک جلے'' کی گریسی، ''حسب نسب'' کی چھمی، ''دریں گرد سوارے
باشد'' کا کلّو مہتر، ''ڈالن والا'' کا بوڑھا، ''چاندنی بیگم کی ہیروئن، ''دیکھو
اس طرح سے بھی رقصِ فغا ہوتا ہے'' کی بونی لڑکی۔ اردو ادب کے یہ
زندہ کردار اعلیٰ طبقے کے نہیں ہیں۔ مفلوک الحال ہیں اور مسکین ہیں اور
انھوں نے چاک گریباں ہم سے زیادہ چاک کر رکھے ہیں۔[۲]

قرۃ العین حیدر کے متعلق اردو ادب میں یہ مفروضہ آج بھی قائم ہے کہ انہوں نے اعلیٰ طبقے کے لوگوں کی زندگی اور اعلیٰ سوسائٹی کے ماحول کو ہی اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے اور ان کے ہی مسائلِ زندگی کو پیش کرنے میں زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تخلیق میں مظلوم، مفلس، غریب اور سماج کے نچلے طبقے کے افراد کا دائرہ کمزور اور قریب قریب خالی ہے۔ مذکورہ مفروضات کی تصدیق میں اردو کے بڑے ادیب، نقاد اور دانشور بھی شامل ہیں۔ زیرِ تحقیق باب میں مذکورہ مفروضات سے قطع نظر قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں مظلوم، مفلس اور مفلوک الحال پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس میں مصنفہ کے افسانوی مجموعے ''ستاروں سے آگے''، ''شیشے کے گھر''، ''پت جھڑ کی آواز'' ''روشنی کی رفتار'' اور ''قندیل چیں'' (مرتب ڈاکٹر جمیل اختر) شامل ہیں۔

ستاروں سے آگے:

''ستاروں سے آگے'' قرۃ العین حیدر کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ ابتدائی نوعمری میں لکھے گئے ان افسانوں میں کمیا اور خامیاں دونوں ہیں جو ممکنہ طور پر کسی بھی نومشق تخلیق کار کے یہاں پائی جاسکتی ہے، باوجود اس کے ان افسانوں میں ان کے تجربے، مشاہدے اور آگہی کی منہ بولتی تصویر نظر آتی ہے۔ ناقدینِ ادب نے اس مجموعے کو کردار نگاری کے حوالے سے کمزور اور اظہارِ خیال کے ایک دائرے حد تک محدود افسانہ قرار دیا ہے۔ مثلاً ''ستاروں سے آگے'' کے تمام کرداروں کا ماحول اور معاشرہ

تقریباً ایک جیسا ہی نظر آتا ہے، تخلیق کار نے اپنی شخصیت کے جھروکے سے دنیا پر نظر ڈالی ہے اور سامنے نظر آنے والی اشیاء کو ذہن اور تخلیق کا منظر نامہ بنا کر پیش کیا ہے، ان افسانے میں بچپن کی یادیں، نوجوانی کی رفاقتیں، واہمے، خواب وخیال کی خوبصورت اور دلکش منزلیں ہیں، تخلیق کار نے افسانے میں زندگی کے تجربات سے زیادہ رومانیت کے دلکش مناظر پیش کیے ہیں لیکن کردار نگاری میں کوئی خاص تجربہ نظر نہیں آتا وغیرہ۔ وارث علوی نے منٹو، بیدی اور عصمت چغتائی سے موازنہ کرتے ہوئے ''ستاروں سے آگے'' کے افسانوں کو کہانی، موضوع اور کردار نگاری کے لحاظ سے کمزور افسانہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ستاروں سے آگے کے ان افسانوں میں قرۃ العین کے پاس کہنے کے لیے کوئی کہانی نہیں، ایسے کردار ہیں جو دیر پا دلچسپی کے حامل ہوں۔ ایسے واقعات ہیں جو اپنی ڈرامائیت اور نفسیاتی تناؤ کا حس رکھتے ہوں، ایسے مناظر اور فضائیں بھی ہیں جن پر وہ ایک فطرت پرست فن کار کی طرح دھیان کو مرتکز کر سکیں۔ یہ چیزیں لیکن جھلکیوں کی صورت اور ان جھلکیوں میں اتنی توانائی نہیں کہ ایک تکمیل یافتہ فن پارے کا حس اختیار کر سکیں۔ یعنی کوئی کردار اتنا تہہ دار اور پہلو دار نہیں جو افسانہ کی جان بن سکے۔''[۳۲]

بالا سطور کا مذکورہ بیان ''ستاروں سے آگے'' کے بیشتر افسانوں پر صادق آتا ہے۔ بالخصوص جہاں تخلیق کار نے اپنے محدود دائرہ میں رہ کر کرداروں کی زندگی اور ان کے روزمرہ اوقات کا بیان کیا ہے وہاں کردار نگاری فنی اعتبار سے کمزور نظر آتی ہے۔ افسانے کے سارے کردار جدید ماحول اور معاشرے سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں جو کہ مصنفہ کی اصل زندگی کا ماحول ہے۔ لیکن قرۃ العین حیدر کے دائرۂ زندگی سے الگ ہو کر ''ستاروں سے آگے'' کا مطالعہ کیا جائے اور کرداروں کی عملی زندگی کو دیکھا جائے تو افسانے کے پسماندہ کردار معاشرے کے اصولی نظام اور طبقاتی تفریق کی وجہ سے دم توڑتے نظر آتے ہیں۔ ذیل میں ان افسانوں کا جائزہ لیا جائے گا جس میں مصنفہ نے سماج کے پسماندہ طبقے کی زندگی اور ان کے مسائل کو پیش

کیا ہے۔

''پرواز کے بعد''، ''ٹوٹتے تارے''، ''رقص شرر'' اور ''یہ باتیں''''ستاروں سے آگے'' میں شامل وہ افسانے ہیں جس میں اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کے کرداروں کے بیچ سماجی تفریق اور زندگی کے مسائل ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ مذکورہ افسانوں میں مصنفہ نے انسانی زندگی کی تشخیص اور طبقاتی نظام کے مابین فرق کو بھی واضح کیا ہے جو اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگیوں پر مشتمل ہے۔

''پرواز کے بعد'' اس افسانے کو فنی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں ترسیلی فقدان اور کرداروں کی نامکمل شبیہ جیسی خامیاں موجود ہیں۔ باوجود اس کے اس افسانے میں اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کے کرداروں کے تصادم اور ان کی زندگی کے مسائل نظر آتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے گھر میں کام کرنے والی ایک باورچن کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ میگڈیلین عرف مِگ غریب اور پسماندہ لڑکی ہے۔ مِگ بہت ہی نیک اور عقیدت مند لڑکی ہے وہ اپنے مقدس مریم کی ہر روز عبادت کرتی ہے۔ مِگ کے علاوہ اعلیٰ طبقے کے کردار بھی ہیں جن میں جمال انور، اس کی ماں اور جمال کے ہم خیال و ہم رتبہ دوست۔ افسانے کے سارے کردار اپنے ساتھ گزرے ہوئے حسین دور کی خوبصورت یادیں لئے ہوئے ہیں۔ جس میں حسرت کے ساتھ جذبات کی لہریں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ رخشندہ اپنی ماضی کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہے:

> ''اوہ خدا..........وہ کیسے دن تھے.......وہ کیا زمانہ تھا۔ انیس بیس سے لے کر چوبیس پچیس سال کی وہ عمریں..........ذرا ذرا سی بات، معمولی سے واقعات، جذبات کی لہریں، بڑی زبردست ٹریجڈی یا کامیڈی یا میلو ڈرامہ معلوم ہوتی تھیں۔ وہ چاروں دوست ایک دوسرے کے خیالات و افکار، دکھ سکھ اور محبتوں کے شریک.........
> مِگ کی حفاظت اور اس کی عزت کی خاطر کارل کی دلکش ناک پر مکہ رسید کرنے کو مستعد۔ شام کو مادرِ مقدس کی تصویر کے سامنے شمع جلانے کے بعد مِگ ان کے لیے چاء تیار کرتی۔''[۴]

مذکورہ اقتباس کی فضا ان نوجوان نسل کی ہے جو جدید ماحول کے نمائندے ہیں۔قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کے سماجی نظام کے تحت متعین شدہ معاشرہ کی ایک انوکھی تصویر پیش کی ہے۔اس افسانے کا سب سے اہم کردار میگڈیلین ڈی کوڈرا عرف مِگ کا ہے۔ مِگ افسانے کے ابتدائی پس منظر پر ایک خاموش اور سنجیدہ مخلوق کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ وہ ایک بر فیلی لڑکی ہے جو ہمیشہ سفید فام غرارے اور سفید دوپٹے میں رہا کرتی ہے جس کی زندگی کا محور تعلیم ،مصوری اور گٹار تک محدود ہے ۔ مِگ ، جمال انور اور اس کے دوستوں کے ساتھ اسی فلیٹ کے نچلی منزل میں رہتی ہے جس فلیٹ کے بالائی منزل میں جمال انور اور اس کے تینوں دوست اعظم مسعود، روشن ایرانی اور آفتاب رہتے ہیں۔ مِگ ان کے لیے کھانا بناتی ہے گویا مِگ کی حیثیت ایک خادمہ کی ہے۔افسانے میں جمال کی والدہ اعلیٰ طبقے کی نمائندہ کردار ہے وہ اپنے طبقے کے متعین شدہ معاشرے کے تحت بلند ہے اور مِگ جیسی سادہ لوح باورچن لڑکی کی حیثیت سماج میں پسماندہ طبقے کی ہے۔قرۃ العین حیدر نے افسانے میں سماج کے اسی فرق کو واضح کیا ہے جو معاشرے میں رائج تھیں۔سماج کے کچھ اعلیٰ طبقے کے لوگ نچلے طبقے کے پسماندہ افراد کو گری پڑی نظروں سے دیکھتے ہیں؟ اور ان لوگوں کے ساتھ بے جا رویہ اپناتے ہیں۔مثلاً جمال کی ماں جب مِگ سے پہلی بار ملاقات کرتی ہے تو اس کے خادمہ ہونے پر کس طرح سے حقارت کا اظہار کرتی ہے اس کا اندازہ اس اقتباس سے ہوتا ہے:

> ’’آپ مس ڈی کوڈرا ہیں؟ میرا مطلب ہے.....معاف کیجئے گا ہم آپ کے گھر میں اس طرح بلا اجازت اور بغیر اطلاع آ گئے لیکن....‘‘
>
> ’’ماوذیل آپ غلطی پر ہیں ۔ یہ میرا گھر نہیں ہے ۔ میرے پاس فرسٹ فلور پر صرف ایک کمرہ ہے ۔ میں ان لوگوں کے لئے چاء اور کھانا تیار کرنے یہاں آئی ہوں ۔
>
> اور ان دونوں اونچی خواتین نے اپنی بلندی پر سے جھک کر دیکھا کہ وہ محض ایک سفید فارم باورچن ہے ......یعنی یہ ایک بڑی بڑی آنکھوں والی بھولی سی لڑکی ....اسی طرح کی دوسری سفید فام یہودی اور اینگلو

انڈین لڑکیوں میں سے ایک.....اف۔نفرت کی پوٹ۔'' ۵؎

مذکورہ اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر نے اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین کی اس سوچ پر طنز کیا ہے جو اپنی بلندی سے نچلے طبقے کے لوگوں کو گری پڑی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ان کی نظروں میں میگڈیلین کی حیثیت ایک باورچن سے زیادہ نہیں جو انہیں 'نفرت کی پوٹ' دکھائی دیتی ہے۔افسانے کا سب اہم موڑ اور مِگ کی زندگی میں سب سے بڑی تبدیلی اس وقت آتی ہے جب جمال اور مِگ کے رشتے کو لے کر جمال کی والدہ ایک عورت کے ہمراہ اس فلیٹ میں داخل ہوتی ہیں۔''چمکیلے پتھروں سے سجی دو شاندار خواتین اندر آ کر صوفے پر اس طرح بیٹھ گئیں گویا ایسا کرنے کا انہیں پورا پورا حق حاصل تھا۔'' ٦؎ جمال انور کے علاوہ گھر پر اس کے تینوں دوست موجود تھے۔دونوں عورتیں مِگ کے متعلق جمال کے دوستوں سے پوچھتی ہیں۔اقتباس ملاحظہ کریں:

''وہ عورت کون ہے جس کے ساتھ وہ یہاں رہتا ہے؟''
عورت.....انہوں نے مِگ کو ایک پیاری سی، معصوم سی، رنگین تصویر کے سوائے کسی اور زاویۂ نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔عورت.....اس کے لیے بڑا بھونڈا سا لفظ تھا۔......
''میرا مطلب ہے وہ خاتون کون ہیں اور یہاں کب سے .....؟'' مِگ کے لیے ''خاتون'' کا لفظ بھی بڑا عجیب سا معلوم ہوا۔مِگ تو بس مِگ تھی۔یاسمین کی ایک بڑی سی کلی۔......
''کیا یہ لڑکی کسی باعزت طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔'' مِگ کے متعلق یہ ایک نیا انکشاف تھا جو پہلے ان کے دماغ میں کبھی نہ آیا تھا۔ان تینوں میں سے ایک چپکے سے دیوان پر سے اٹھ کر پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا اور باقی دونوں دل ہی دل میں اسے بددعائیں دینے لگے۔.......
''باعزت .....ار.....دیکھیے اس لفظ کو مختلف معنوں میں لیا جا سکتا

ہے......خصوصاًاس شہر کی سوسائٹی میں۔''ے

قرۃالعین حیدر نے اس افسانے کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سماج میں پسماندہ طبقے کے لوگوں کے ساتھ اشرافیہ طبقے کی کیا سوچ ہے؟اور معاشرے کا طبقاتی اصول کس نہج پر مبنی ہے؟ چونکہ قرۃالعین حیدر کو اعلیٰ طبقے کی سوسائٹی کا اچھا خاصا تجربہ تھا وہ اس سوسائٹی کے حالات اور اسباب سے اچھی طرح واقف تھیں۔انہوں نے کسی بھی محاذ پر اس طرح کے طبقاتی تشخیص کو قبول نہیں کیا۔یہی سبب ہے کہ اعلیٰ طبقے کے سطحی طبقاتی تفریق پر افسانہ نگار نے لطیف مگر گہرا طنز کیا ہے۔قرۃالعین حیدر کے نزدیک انسانی اقدار کا تعین ذاتی، معاشی، مذہبی یا پھر کسی دوسرے اصول پر قائم کیا جائے انہیں قابل قبول نہ تھی۔

قرۃالعین حیدر نے جہاں ان عورتوں کے خیالات کو پیش کیا ہے وہیں جمال کے دوستوں کے ذریعے اعلیٰ طبقے کی سطحی سوچ پر طنز بھی کیا ہے۔دراصل مصنفہ کا یہ موقف عام ہے کہ ہر سوسائٹی میں متضاد خیال رکھنے والے لوگ موجود ہیں اور ان کا نظریہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ان عورتوں کا مِگ کے لیے طبقاتی تشخص کا پتا لگانا دراصل ہندوستان کی سماجی تہذیب کا ایک قدیم ترین حصہ ہے۔ان عورتوں نے مِگ کو طبقاتی ترازوں میں رکھ کر اس کی ذات اور نسل کا جائزہ لیا جس کے پاداش میں مِگ جیسی با اخلاق لڑکی کارل جیسے لڑکے کے ساتھ دوسری جگہ چلی جاتی ہے۔کارل ریوبن کے ساتھ مِگ نے ایک نئی زندگی کی شروعات کی۔اس نے پوری زندگی سماج کے نچلے طبقے سے جوڑ کر ڈانس، اسٹیج شو اور آرکیسٹرا میں کام کرنے کے لیے وقف کر دیا۔دراصل مِگ کی اسٹیج شو زندگی جمال انور سے الگ ہونے کے بعد وجود میں آتی ہے۔قرۃالعین حیدر نے مِگ کی زندگی کو ایک ایسے نازک اندام شکل میں پیش کیا ہے کہ قاری کے دل میں اس کردار سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور اعلیٰ سوسائٹی کے انداز عمل سے ایک نفرت کا احساس بھی ہونے لگتا ہے۔

مذکورہ افسانہ دور جدید کے حالات کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جہاں اعلیٰ طبقے کے نوجوان نئے ماحول کی رنگین فضا میں مسرور نظر آتے ہیں وہیں جمال سے الگ ہونے کے بعد مِگ کی زندگی میں آنے والی غیر معمولی تبدیلی کا اندازہ بھی جمال کو نہیں ہوتا اور مِگ نیورلاجی جیسی ملحق بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہے جبکہ مِگ کی یہ زندگی اعلیٰ سوسائٹی کی ہی دین ہے۔''پرواز کے بعد'' افسانہ جس دور میں لکھا گیا ہے وہ موضوع کے لحاظ سے

اہم افسانہ ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ اس افسانے میں تخلیق کار نے گاؤں دیہات کے بجائے شہر کے پسماندہ زندگی کے طبقاتی مسائل کو پیش کیا ہے۔

اس مجموعے کا اگلا افسانہ ''ٹوٹتے تارے'' کے نام سے ہے۔موضوع اور فن کے اعتبار سے یہ افسانہ بھی کمزور ہے۔افسانے کا پلاٹ نامکمل ہے، کرداروں کی زندگی بھی ادھوری دکھائی دیتی ہے۔رخشندہ کے ماضی کے متعلق بھی افسانہ نگار کی خامیاں موجود ہیں۔افسانہ ''ٹوٹتے تارے'' میں قرۃ العین حیدر نے ایک یتیم لڑکی رخشندہ عرف ری شی کی زندگی اور اس کے جذبات، کیفیات اور خیالات کو موضوع بنایا ہے۔رخشندہ، بنا ماں باپ کی یتیم لڑکی ہے جس کی پرورش شاہنہ کے والدین کرتے ہیں جو امیر اور خاندانی لوگ ہیں۔قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں رخشندہ کے جذبات کو جس طرح پیش کیا ہے وہ ایک مجبور انسان نظر آتی ہے۔ رخشندہ وہ لڑکی ہے جس کے پاس کچھ نہ ہونے کے باوجود بھی اپنی پرورش میں شاہنہ اور اس کے والدین کو زندگی کا مرہون منت سمجھتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے اس کے جذبات کی ترجمانی کے ساتھ اس کے ذہنی فکر کی تصویر اس طرح پیش کی ہے:

''خدارا شی شی میرا خط پڑھ کر اپنے آپ کو غمگین مت کر لینا میں تم کو پورے چھ سال بعد لکھ رہی ہوں۔کتنی طویل مدت ہے اور میں کس قدر احسان فراموش۔یقیناً مجھے تم سے معافی مانگنی چاہیے۔ایک یتیم اور کمزور لڑکی ،جس نے تمہارے گھر پر،تمہارے گھر والوں کے رحم و کرم پر، پرورش پائی ہو اور وہ ایسی باغی اور سرکش نکل جائے۔سوچو تو شی شی میں ہمیشہ ہنسنے والی ری شی کیسی عجیب باتیں لکھ رہی ہوں کیوں کہ زندگی نے مجھے رونا بھی سکھا دیا ہے۔شاید میں اب بھی تم کو خط نہ لکھتی اور تم کو معلوم نہ ہونے پاتا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہی ہوں۔''[۸]

مذکورہ اقتباس کے ذریعے رخشندہ کے جذبات ،احساس اور اس کی معصومیت واضح طور پر نظر آتی ہے۔وہ ایک یتیم لڑکی ہے جو بغاوت کر کے گھر سے چلی جاتی ہے وہ اب اپنے عمل پر نادم ہے لیکن وہ اپنی

زندگی میں شاہنہ اور اس کے والدین کی احسان مند بھی ہے جن کی پرورش نے اسے زندگی عطا کی تھی۔ افسانے میں شاہنہ اور رخشندہ کے علاوہ اسلم اور کمل کا کردار بھی اہم ہے۔ اسلم اعلیٰ طبقے کا نمائندہ ہے وہ رخشندہ کو بچپن سے پسند کرتا ہے لیکن رخشندہ ایک یتیم لڑکی ہے جس کے خاندان، ذات اور طبقے کا کچھ پتا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلم کی شادی رخشندہ کے بجائے اعلی طبقے کی متمول شاہنہ سے طئے ہو جاتی ہے جبکہ شاہنہ کو کمل پسند کرتا ہے اور اس کے ساتھ اپنی زندگی گذارنا چاہتا ہے لیکن اس کی شادی کمل سے اس لئے نہیں ہو سکتی کیونکہ کمل شاہنہ کے طبقے سے تعلق نہیں رکھتا۔ دراصل یہ طبقاتی تفریق جذبات سے عاری ہے اور اس کی بنیاد سماج کے بنائے اصولوں پر مبنی ہے۔ اس کے متعلق یہ اقتباس دیکھیں:

> ''اور اب اتنے برسوں بعد شاہنہ پھر اسی سایہ دار روش پر آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی نیچے اتر رہی تھی جس پر اس کے دل کا ساتھی کمل اس لئے اس کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا کیونکہ وہ اس کے طبقے اور فرقے سے تعلق نہ رکھتا تھا۔''[۹]

مذکورہ اقتباس میں قرۃ العین حیدر نے شاہنہ اور کمل کی زندگی کے طبقاتی فرق کو اس طرح دکھایا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے کے باوجود اس لیے ایک نہیں ہو سکتے کہ کمل شاہنہ کے طبقے سے تعلق نہیں رکھتا۔ کمل اور رخشندہ کے ذریعے قرۃ العین حیدر نے سماج کے نچلے طبقے کے پسماندہ لوگوں کی سماجی حیثیت کو ابھارا ہے کہ کیسے معاشرے کے طبقاتی نظام کے تحت سماج کا ایک کمزور اور نچلا طبقہ حاشیہ پر زندگی گذارتا ہے۔ اس افسانے میں قرۃ العین حیدر یک رخی رویہ اپناتے ہوئے نہ صرف اعلی سوسائٹی کی ذہنی پسماندگی کو پیش کرتی ہیں بلکہ اشرافیہ طبقے کی انسان دوستی اور جذبے کو بھی دکھایا ہے۔ اعلیٰ طبقے کا اسلم معاشرے میں معصوم، مظلوم اور پسماندہ طبقے پر ہو رہے ظلم وستم پر اعتراض بھی کرتا ہے۔ شاہنہ اور اس کے گھر والے رخشندہ کے بچپن میں اس کے ساتھ ملازماؤں جیسا برتاو کرتے تھے اور اس سے خادمہ کی طرح کام لیتے تھے۔ اسلم، شاہنہ اور اس کے گھر والوں کے اس طرز عمل پر اعتراض کرتا ہے بلکہ نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''اسلم یکا یک نہایت تلخی سے بولا: ''مجھے تم سے نفرت ہے۔ تمہارے گھر

والوں سے نفرت ہے۔ سچ کہتا ہوں مجھے اس دن سے تم سے سخت نفرت
ہے جب میں پہلی مرتبہ بچپن میں تم کو رخشندہ کے ساتھ ایک خادمہ کا سا
برتاؤ کرتے دیکھا تھا۔''[۱۰]

قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں سماج کے طبقاتی تفریق کو نہایت ہی اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے بلکہ سماج کے اس تفریقی نظام پر طنز بھی کیا ہے کہ آج کا آدمی مفاد پرستی میں انسانیت سے کتنا گر چکا ہے۔ آج کے دور میں بھی لوگ طبقاتی نظام کے فرسودہ اصول کے تحت انسانی اور انسانیت سے زیادہ سماج کے اونچ نیچ طبقے کو اہمیت دے رہے ہیں۔قرۃ العین حیدر کے افسانوں کی یہی خاص خوبی ہے کہ وہ سماج کے کسی بھی طبقے کو پیش کرتی ہیں تو اس کی خامیوں اور خوبیوں کو چھپانے کے بجائے اس کا واضح اظہار کرتی ہیں جس کی مثالیں ان کے افسانوں میں موجود ہیں۔

''ستاروں سے آگے'' میں شامل افسانہ ''رقص شرر'' بالکل نئے اسٹائل میں لکھا گیا قرۃ العین حیدر کا منفرد افسانہ ہے۔ یہ افسانہ تین ابواب میں منقسم ڈرامہ کے فارم میں لکھا گیا ہے۔مصنفہ نے اس افسانے میں مختلف کرداروں کے خیالات اور ان کے مسائلِ زندگی کو دکھایا ہے۔اس افسانے کے دوسرے باب میں قرۃ العین حیدر نے برلن کی نائٹ کلب ڈانسر سلیما مارینا کی پسماندہ زندگی کو پیش کیا ہے،سلیما غریب ماں باپ کی فاقہ کش بیٹی ہے۔اس کا باپ ایک لوہے کے کارخانے میں معمولی سا ملازم تھا اور ماں بوڈاپسٹ میں ٹوپیاں بیچ کر اپنا گذارا کرتی تھی لیکن اب وہ دونوں مر چکے ہیں۔سلیما عالمی جنگ کے افراتفری کے ماحول سے تنگ آ کر اپنے ملک کو چھوڑ کر ہندوستان چلی آتی ہے۔ یہاں آنے کے بعد اب اس کا مستقل مسکن ہندوستان ہی ہے وہ یہاں کے ماحول اور تہذیب میں رچ بس گئی ہے۔ ہندوستان اور ہندوستان کے لوگ اسے پسند آ گئے ہیں وہ اب دوبارہ اپنے ملک نہیں جانا چاہتی۔افسانہ نگار نے سلیما سے بات کرتے ہوئے مکالماتی انداز میں اس کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''اور تم!.......محض ہنگری سی بال روم ڈانسر.......اور.......یہ اپریل کی
رات......اور ہم کینٹین کے باہر پائن کے سائے میں سبز بید کی کرسیوں

پر بیٹھے انتہائی بے معنی باتیں کر کے بے حد خوش ہو رہے ہیں۔اور پہلی
مئی کے جشن بہاراں کی شام کو تم نیلے ڈینیوب کے سبز زاروں کا ناچ
دکھلاؤ گی جس کے لئے تم کو ساڑھے تین سو روپے جنگی فنڈ میں سے
دیئے جائیں گے۔''[۱۱]

قرۃ العین حیدر نے ''رقص شرر'' میں سلیما کی زندگی اور اس کے مسائل کو پیش کرتے ہوئے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے برلن کے نائٹ کلب میں کام کرتی تھی جو اب ہندوستان میں ایک بال روم ڈانسر ہے۔سلیما ہندوستان میں ہونے والے تہواروں اور مختلف جشن بہاراں کے موقع پر اپنے رقص کے ذریعے لوگوں کے لئے مسرت آرائی کا کام کرتی ہے۔دراصل قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں ہندوستان کی قدیم روایت،سماجی نظام اور تہذیب کے پس منظر میں سلیما کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ ہندوستان کی سماجی نظام کے تحت بال روم ڈانسروں کی معاشرے میں کوئی عزت نہیں ہوتی۔ ناچنے اور گانے والوں کو اور اس پیشے سے تعلق رکھنے والوں کو نچلے طبقے میں شمار کیا جاتا ہے جن کی حیثیت سماج میں کم تر درجے کی ہوتی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ''رقص شرر'' میں کرداروں کی علامتی اور بے معنی گفتگو کا ایک سلسلہ دکھایا ہے جس سے اشاراتی طور پر سماج اور معاشرے کے اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔جنگ اور اس سے متاثر لوگوں کی در بدر زندگی کو حقیقی پیرائے میں اس طرح پیش کیا ہے کہ جنگ سے تنگ آ کر لوگ دوسرے ملکوں میں در بدر پھر رہے ہیں اور معاشرے میں پسماندہ زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔سلیما مارینا کی زندگی اس جنگ کی ہی دین ہے جو اب ہندوستان میں وہ ایک بال روم ڈانسر ہے۔قرۃ العین حیدر نے سلیما کو جذبات،احساسات، خصلت،رویہ،رجحان،مفاہمت اور تصادم کا مجموعہ بنا کر پیش کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا مذکورہ افسانہ ''رقص شرر'' جس زمانے میں تخلیق ہوا ہے وہ ترقی پسندی کا دور تھا۔اس زمانے میں ادب کا یہی رجحان تھا کہ سماج کے غریب اور پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل کا احاطہ کیا جائے۔اسی زمانے میں ترقی پسندوں نے قرۃ العین حیدر پر یہ الزام لگایا کہ وہ سماج کے پسماندہ طبقے

کے لوگوں کے مسائل کو پیش نہیں کرتی بلکہ وہ اپنے اعلیٰ سوسائٹی کے اونچے مقام پر کھڑے ہوکر صرف آسودہ حال زندگیوں کو پیش کرتی ہیں۔ جہاں لوگوں کو آرام وسکون کے تمام آسائیش میسر ہیں۔قرۃ العین کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی پسندوں کا ان پر یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں گاؤں دیہات کے غریب اور نچلے طبقے کے لوگ نظر نہیں آتے لیکن انہوں نے اپنے افسانوں میں شہروں میں موجود نچلے طبقے کے پسماندہ کرداروں کی زندگی اوران کے مسائل کو بڑی فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔شہروں کی زندگی ،سماجی نظام اور پسماندہ طبقے کی پیش کش قرۃ العین حیدر کے سوا کسی اورفن کار کے یہاں بہت کم نظر آتی ہے جوان کے مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دیتے ہیں۔

''ستاروں سے آگے'' کا سب سے مختصر افسانہ ''یہ باتیں'' ہے۔اس افسانے میں قرۃ العین حیدر نے پسماندہ طبقے کے غریب مفلوک الحال شخص کی معاشی زندگی کو پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ سماج کے ہر اس شخص کی کہانی ہے جو بے روزگاری کے عالم میں اپنی معاشی تنگی سے بدحال رزق کی تلاش میں سرگرداں ہے۔افسانے کی ابتداء خزاں اور بہار کی تجزیاتی ماحول سے ہوتی ہے جوراوی کے ذہن پر دائمی اثرات مرتب کر چکا ہے،وہ انتظار میں ہے کہ بہار کب آئے گی؟افسانے کے درمیان میں سینما سے واپس آتے وقت راوی کی ملاقات ایک دلچسپ شخص سے ہوتی ہے جس کی شخصیت اورفکری رجحان راوی کو بہت متاثر کرتی ہے۔اس کے بعد راوی اس دلچسپ شخص کوشام کی چائے پر مدعو کرتا ہے لیکن وہ دیر رات تک انتظار کے بعد بھی نہیں آتا اور نہ ہی کوئی خبر دیتا ہے۔

> ''چند روز بعد وہ مجھے ایک کافی ہاؤس میں ملا۔میں نے اس سے کہا کہ ٹی پارٹی پر میں نے اس کا بہت انتظار کیا۔شاید بارش کی وجہ سے راستے میں موٹر خراب ہوگئی اس لئے وہ نہ آسکا ہوگا۔
>
> ''میرے پاس موٹر نہیں ہے۔'' اس نے لا پرواہی سے جواب دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔
>
> ''تو آپ نے مجھے فون کر دیا ہوتا' کار بھیج دیتی۔''

''میرے پاس فون بھی نہیں ہے۔''

.......ہا بیچارہ آدمی!....... کار اور ٹیلی فون کے بغیر کیسے زندگی گزارتا ہوگا۔میرے دل میں اس کے لئے بے انتہائی ہمدردی پیدا ہوگئی۔''۱۲؎

قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں معاشی طور پر پسماندہ، غریب اور بے روزگاروں کی زندگی کے مسائل کا احاطہ بڑی فن کاری سے کیا ہے۔مصنفہ نے اس کے ساتھ یہ بھی دکھانے کی سعی کی ہے کہ امیر طبقے کا نوجوان بے روزگاری اور غریبی کے مسائل سے کم واقف ہے کیونکہ یہ طبقہ معاشی پسماندگی کی اس سطح پر آ کر شاید نہیں سوچ سکتا جس کی طرف تخلیق کار کا اشارہ ہے۔قرۃ العین حیدر نے سماجی تشخیص میں معاشی زندگی کے مسائل اور اس کی تصویر کو اس طرح ابھارا ہے گویا یہ ہر اس شخص کی اپنی زندگی ہے جو معاشی پسماندگی سے دوچار ہے۔افسانے میں قرۃ العین حیدر نے بے روزگاری سے پریشان جس شخص کی کہانی کو بیان کیا ہے اس کے سماجی نظریے کو بھی پیش کیا ہے۔فکری اعتبار سے سماج کے متعلق اس کا نقطۂ نظر اہم ہے، وہ غریب اور معاشی طور پر پسماندہ تھا اس کے ذہن میں بہت سارے خیالات گردش کرتے رہتے تھے جس کا تعلق روٹی اور زندگی سے تھا۔اس شخص کی زندگی کا عملی مقصد معاش تھا اور وہ اپنے مقصد کے تحت ہی سوچتا رہتا تھا۔

''چند روز بعد سنیما ہال سے باہر نکلتے ہوئے میں نے سنا کہ اس کو شاید نمک کے محکمے میں نوکری مل گئی ہے اور وہ کہیں اور چلا گیا ہے۔سو یا سوا سو روپے کی نوکری.......اور میں سوچنے لگی کہ شاید خدا نے دنیا اسی لئے بنائی ہے کہ اس میں سو روپے کی کلرکی کی جائے اور بس۔''۱۳؎

افسانہ ''یہ باتیں'' میں قرۃ العین حیدر نے سماج کے ان لوگوں کے مسائل کو پیش کیا ہے جو معاشی طور پر غریب اور پسماندہ ہیں۔سماج کا یہ پسماندہ طبقہ اپنی معاشی تنگی کو دور کرنے اور زندگی کی فاقہ کشی کو بہتر بنانے کے لئے تمام صورتوں سے گزرنے کا حوصلہ رکھتا ہے اور بالآخر وہ سو سوا سو روپے میں معمولی ملازمت کو قبول کر لیتا ہے۔قرۃ العین حیدر کا یہ افسانہ اپنے موضوع کے اعتبار سے کسی حد تک کامیاب نظر آتا ہے لیکن زندگی کے

مسائل کا تجزیہ تھوڑے اور پہلو کا تقاضہ کرتا ہے جس سے زندگی کے کچھ اور مختلف مسائل اور اہم پہلو نکل کر سامنے آجاتے۔ باوجود اس کے معاشی طور پر کمزور اور غریب پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی پر لکھا گیا یہ اہم افسانہ ہے۔

قرۃ العین حیدر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ستاروں سے آگے'' میں شامل مذکورہ افسانے فن اور تکنیک کے اعتبار سے کمزور افسانہ ہے۔ بالخصوص کرداروں کی منظر کشی ادھوری رہ گئی ہے، ان کے سبھی مسائل سامنے نہیں آپاتے۔ بلکہ بعض اوقات ترسیلی فقدان کا شدید احساس ہوتا ہے۔ باوجود اس کے قرۃ العین حیدر نے سماج کے اعلیٰ اور نچلے طبقے کے پسماندہ کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کو ایک حد تک پیش کرنے کی سعی کی ہے علاوہ ازیں سماج میں ان کی حیثیت، فکری رجحان اور ملک کے اس طبقاتی نظام کے زیر اثر پیدا ہونے والے مسائل کا بھی احاطہ کیا ہے۔ مذکورہ افسانوں کے موضوعات پر لکھتے ہوئے مصنفہ نے، اعلیٰ طبقے کا نچلے طبقے کے ساتھ جو تفریقی رویہ رہا ہے اس حقیقی منظر کو پیش کرتے ہوئے اس کے نتائج بھی دکھائے ہیں۔

شیشے کے گھر:

قرۃ العین حیدر کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''شیشے کے گھر'' ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۱۹۴۶ء کے بعد لکھے گئے افسانے شامل ہیں۔ اس مجموعے کے بیشتر افسانے مصنفہ نے تقسیم کے بعد پاکستان میں تحریر کیے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے ''ستاروں سے آگے'' کے افسانوں کے بالمقابل ''شیشے کے گھر'' میں کمیوں پر بڑی حد تک قابو پالیا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید احمد قادری:

> ''ستاروں سے آگے'' کے بعد عینی کے اندر غایت سنجیدگی، متانت اور خود احتسابی کی کیفیت پوری طرح جلوہ گر ہوئی اور انھیں اس امر کا شدت سے احساس ہوا کہ فنکار کو خود اپنے فن کی خامی یا خوبی سے واقف ہونا چاہیئے ، فنکار کیا لکھ رہا ، کیوں لکھ رہا ہے اور اس کی اہمیت اور

معنویت کیا ہے۔اس احساس نے بھی ان سے بہت اچھے اور معیاری
افسانے لکھوائے۔''[۱۴]

''شیشے کے گھر'' کے تمام افسانوں پر تقسیم ہند سے قبل اور بعد کا ماحول چھایا ہوا نظر آتا ہے۔کرداروں کی الجھی ہوئی زندگی اور حالات کے زیر اثر سماجی بحران کی تصویروں کو قرۃ العین حیدر نے بڑی دیانت داری سے پیش کیا ہے۔ایک طرف ان افسانوں کے بیشتر کردار تقسیم کے حالات سے متاثر ہیں تو دوسری طرف عالمگیر جنگوں کے وسیلے سے ابھرنے والے بین الاقوامی مسائل سے بھی دوچار ہیں جس نے انسانی جذبے کو آفاقی سطح پہ متاثر کیا۔قرۃ العین حیدر نے تقسیم کے حولناک منظر نامے کو بعد کے حالات سے جوڑ کر اس طرح پیش کیا ہے کہ انسان کے جذبات اور اس کے فکری رجحان کی تصویر افسانوں کی جان بن گئی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے یہاں افسانے طویل اور کرداروں کی تعداد زیادہ ہے جس سے کبھی کبھی اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ شروع ہوا تھا تو منظر کچھ اور تھا لیکن درمیان اور آخر میں واقعہ، کردار اور مناظر دوسرے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوں کی یہ خوبی ہے کہ وہ کردار سے زیادہ سماج اور ماحول کو اہمیت دیتی ہیں اسی لیے ان کے یہاں کردار کے بجائے وقت، سماج اور تہذیب موضوع ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں وقت کے ساتھ بدلتے ماحول میں سماج کے مختلف طبقے کے کردار نظر آتے ہیں جو اپنے اپنے طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

زیر تحقیق افسانوی مجموعہ ''شیشے کے گھر'' میں شامل افسانہ ''برف باری سے پہلے'' قرۃ العین حیدر کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ یہ افسانہ فلیش بیک تکنیک میں لکھا گیا ہے جو تقسیم کے بعد قیام پاکستان سے شروع ہوتا ہے اور ماضی کی یادوں سے جڑ جاتا ہے۔افسانہ نگار نے تقسیم کے زیر اثر پیدا ہونے والے مسائل کو بیان کرتے ہوئے انسان کے بکھرے ہوئے جذبات کو بڑی فن کاری سے بیان کیا ہے۔ یہاں اشرافیہ اور پسماندہ طبقے کے کرداروں کی سوچ وفکر اور سماج کے طبقاتی نظام کی وہ تصویریں ہیں جو معاشرے میں موجود تھیں۔تقسیم نے ہر طبقے کے لوگوں کو ذہنی طور پر متاثر کیا جس کے بعد لوگوں کو شعوری اور غیر شعوری طور پر بحران کا سامنا کرنا پڑا۔

افسانہ ''برف باری سے پہلے'' سرد ماحول کے منظر سے شروع ہوتا ہے اور چند مکالمے کے بعد ماضی کی راہ پر گامزن ہوجاتا ہے۔ افسانے میں بوبی ممتاز، کوئنی اور وجاہت اعلی طبقے کے کردار ہیں۔ یہ سبھی حالات کے متعلق تضاد نظریہ رکھنے والے دوست ہیں۔ اس کے ساتھ افسانے کے پس منظر پر اصغر ربانی، ارنا کرسنا، سگرڈ اور محلّہ وکٹوریہ گنج میں رہنے والے پسماندہ طبقے کے کردار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اصغر ربانی، ایک غیر ملکی کیتھوڈلک خاتون ارنا کرسینا سے شادی کر کے اسے اپنے ملک ہندوستان لاتا ہے۔ ارنا کرسنا، کے دل میں سر آغا خان کے ملک ہندوستان کی تصویر بنی ہوئی ہے اور وہ اس یقین کے ساتھ اصغر ربانی سے شادی کر کے ہندوستان آتی ہے کہ اصغر ربانی کے ساتھ وہ اس کے محل سرا میں الیف لیلوی سلطانہ کی طرح زندگی گزارے گی۔ اصغر ربانی اس کے لئے وہ تمام آسائشیں میسر کرائے گا جس کا اس نے خواب دیکھا ہے۔ دراصل ارنا کرسنا کی یہ دلی خواہش امر طبعی ہے جو ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے کہ وہ اپنے مستقبل میں عیش وعشرت کی زندگی گزارے۔ لیکن اس کا خواب اس وقت کافور ہو جاتا ہے جب وہ محلّہ وکٹوریہ گنج پہنچتی ہے۔ وکٹوریہ گنج اور ارنا کرسنا کی کیفیت کا منظر ملاحظہ کریں

> ''لیکن جب وہاں پہونچیں تو انہیں پتا چلا کہ مرمریں ستونوں اور ایرانی قالینوں والی محلسرا کے بجائے ان کے شوہر اصغر ربانی لکھنؤ کے ایک نہایت گندے محلے وکٹوریہ گنج میں رہتے ہیں۔ جہاں ایک بوڑھی ماں ہے جو ہر وقت امام کے مجلسوں میں چلا چلا کر رونے میں مصروف رہتی ہے۔ چار پانچ جاہل اور کالی اور سخت بے ہنگم بہنیں اور بھاوجیں ہیں۔ ان سب عورتوں کی ساری سوسائٹی جھوائی ٹولہ اور مولوی گنج اور نخاس کی گلیوں تک محدود ہے جہاں وہ سب ڈولیوں پر کتے کی طرح ہانپتے ہوئے انسانوں کے کاندھوں پر لد کے، پردے دار تانگوں میں سوار ہو کے کبھی کبھار اسی طرح کے دوسرے گندے مکانوں اور انہیں کی قسم کی دوسری بے ہنگم عورتوں سے ملنے جایا کرتی ہیں۔ ارنا کرسینا پر یہ سب

دیکھ کر بے ہوشی کا سا عالم طاری ہو گیا۔'' ۱۵؎

اصغر ربانی غریب طبقے کا پسماندہ شخص ہے۔اصغر ربانی کے خاندان کی زندگی غربت وافلاس میں گزر رہی ہوتی ہے۔ارنا کرسینا،جس نے دل ہی دل میں ایک حسین خواب سجایا تھا یہاں اسے تمام چیزیں برخلاف نظر آتی ہیں۔شادی کے بعد ارنا کرسینا زندگی کے اس محاذ پر کھڑی ہوتی ہے جہاں سے فطری طور پر احتجاج لازمی ہے۔وہ اصغر ربانی سے اپنے حالت زار کی شکایت کرتی ہے جس پر اصغر ربانی ارنا سے مزید حوصلہ رکھنے اور صبر سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے۔ارنا کو صبر کرتے ہوئے برسوں گزر چکا ہے،وہ اب ایک بیٹی کی ماں بن چکی ہے لیکن اس کی زندگی میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا،وہ اب اپنی قسمت کو کوستی اور من ہی من دکھی ہوتی رہتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے ارنا کرسینا اور وکٹوریہ گنج کے ظاہری خدوخال ظاہر کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ارنا کرسینا کی نفسیات،جذبات اور اس کی ذہنی ہیجان کو بڑی گرفت کے ساتھ بیان کیا ہے جو اصغر ربانی اور گھر کی غربت وافلاس کی دین ہے۔اسی طرح مصنفہ نے وکٹوریہ گنج کی تصویر کو دور سے کھڑے ہو کر پیش نہیں کیا ہے بلکہ گھر کے اندر کے حالات اور مسائل بھی دکھائے ہیں کہ کس طرح اصغر ربانی کی ماں،اس کی بہنیں اور اس کی بیوی پسماندہ زندگی بسر کر رہی ہیں۔

''وکٹوریہ گنج کے اس مکان کی ایک صحنچی میں بیٹھی ہندوستانی ماؤں کی طرح اپنی سگڑ کو پالتی رہیں اور میاں کو کوسا کریں۔اصغر ربانی اٹھتے بیٹھتے انہیں اطمینان دلاتے ''بس ڈارلنگ چند روز کی بات اور ہے پھر ہم چل کر الگ رہیں گے۔ ۱۶؎

افسانے کے پس منظر پر بہت کم وقت کے لئے اصغر ربانی کی زندگی دکھائی دیتی ہے کیونکہ اصغر ربانی جب اپنی بیوی کو مسوری کی سیر کرانے لے جاتا ہے تو وہاں اصغر ربانی اپنے ایک دوست ریٹائر ڈپٹی کلیکٹر، خان بہادر اعجاز احمد سے ارنا کرسینا کی ملاقات کراتا ہے۔ڈپٹی صاحب اپنے محل میں بڑی ٹھاٹ سے رہتے تھے، یہ وہی محل ہے جس کا خواب ارنا نے اصغر ربانی کے ساتھ دیکھا تھا۔ارنا کرسینا کو ڈپٹی صاحب اور ان کی اندازِ زندگی پسند آتی ہے۔ڈپٹی صاحب بھی ارنا کو پسند کر لیتے ہیں اور دونوں کی شادی ہو جاتی ہے جس کے بعد

افسانے کے پس منظر سے اصغر ربانی کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کی تہذیبی روایت میں ارنا کرسینا کا یہ عمل درست نہیں۔ شوہر کے ہوتے ہوئے کسی غیر مرد سے شادی کر لینا مشرق کی تہذیبی روایت کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارنا کرسینا اور اسکی بیٹی سگرڈ کو سماج میں وہ درجہ حاصل نہیں ہو پاتا جو ڈپٹی صاحب کو حاصل ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں ارنا کرسنا کی نفسیات اور ذہنی کیفیات کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

افسانہ ''برف باری سے پہلے'' میں قرۃ العین حیدر نے ہندوستان کے جس ماحول کا منظر نامہ پیش کیا ہے اس کا تعلق ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور ثقافت سے ہے۔ یہ ہندوستان ۱۹۴۷ء سے قبل کا ہے جس پر ابتدائی مغربی تہذیب دھیرے دھیرے اپنا اثر جمع رہی ہے۔ مغربی کلچر سے متاثر لوگوں میں اعلیٰ طبقے کے امیر لوگ شامل ہیں جن کی زندگی عیش وعشرت میں گزر رہی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں اعلیٰ طبقے کے لوگوں کی متضاد ذہنیت اور طبقاتی تفریق کو بھی ابھارا ہے۔ نشاط اسٹینلے، روبی کھوچڑ، سگرڈ ربانی اور انوری خان اعلیٰ طبقے کے وہ افراد ہیں جو آزاد زندگی جینا پسند کرتے ہیں جبکہ اس آزادروی کو اعلیٰ طبقے کے ہی بوبی ممتاز اور اس کی بہن کوئینی پسند نہیں کرتی۔ دراصل یہاں معاملہ متضاد سماجی نظریات کا ہے جس میں انسان کی تشخیص اس کے عمل اور معاشرتی نظام کے تحت کیا جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے افسانے میں تہذیبی روایت کو زیادہ اہمیت دی ہے اور اس تہذیب کے زیر اثر سماج کا جو ردِ عمل ہے اس کو بھی واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ نشاط اسٹینلے کے متعلق لکھتی ہیں کہ:

> ''وہ الہ آباد کے ایک بہت اعلیٰ عیسائی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور بڑی ہمدرد، بڑی فیاض بے حد نیک دل لڑکی تھی۔ اکثر وہ جذباتی بن کر اپنے دوستوں سے کہتی۔ لوگ مجھے اتنا برا سمجھتے ہیں' کاش کوئی مجھے پہچان سکتا کاش لوگ اتنے بیوقوف، گدھے نہ ہوتے۔''[۱۷]

نشاط اسٹینلے مذکورہ صفات کی حامل ہے جو اخلاقی اعتبار سے اعلیٰ شخصیت اور انسانی اقدار کی عمدہ مثال ہے۔ باوجود اس کے وہ مغربی کلچر سے بہت قریب ہے جسے مشرقی معاشرہ عریانیت سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ نائٹ

کلب جاتی ہے ڈانس، شراب نوشی اور لڑکوں سے فلرٹ بازی بھی کرتی ہے جو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب میں بالکل ناپسند کی جاتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں طبقۂ اشرافیہ کے دو الگ الگ اندازِ زندگی کو پیش کیا ہے۔اس میں انہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سماجی نظام کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور انہیں اصولوں کے تحت معاشرے کا نظام ترتیب پاتا ہے۔ ہندوستان کا اعلیٰ طبقہ جس کی نمائندہ کوئنی اور بوبی ممتاز ہیں وہیں روبی کھوچڑ، سگرڈ ربانی اور نشاط اسٹینلے جیسے لوگ انسانی اقدار کی اعلیٰ صفات کی عمدہ مثال ہونے کے بعد بھی اپنے طرزِ عمل کے اعتبار سے پسماندہ طبقے میں شمار کئے جاتے ہیں۔نشاط اسٹینلے جب بوبی ممتاز سے مل کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہے تو گویا وہ اس طبقاتی تشخیص پر اپنے اعمال وافعال کا اس طرح اظہار کرتی ہے۔

''تمہاری وہ بیحد معزز بہن کوئینی مجھے کیا سمجھتی ہے؟ غالباً کتا یا بلی یا اسی قسم کا کوئی بے عقل اور آسائش پسند جانور....... یا اس سے بھی کوئی اور زیادہ بری چیز.....تم میرا مطلب سمجھتے ہونا....سنو.....''اس نے کرسی پر واپس آکر بیٹھتے ہوئے کہا''تم جب کبھی اس سے ملو.....تم اس سے ضرور ملوگے۔ ہم سب ایک دوسرے سے اچھے دنوں میں دوبارہ کبھی نہ کبھی ضرور ملیں گے۔تم اس سے کہنا کی ساری عزت، اخلاق کا سارا اعلیٰ معیار،ساری اچھائی صرف اسی کی ملکیت نہیں ہے۔دنیا کے برے انسان بھی اتنے ہی اچھے بن سکتے ہیں۔یہ ساری بری لڑکیاں.....روبی کھوچڑ،انوری خان اور سگرڈ ربانی بھی اسی کی طرح اچھی اور اونچی بن سکتی ہیں۔انسانیت کی حقیقی اور آخری اچھائی ہم سب میں موجود ہے۔ ہم سب خلوص اور محبت اور زندگی کی سادگی کے اہل ہیں۔''[۱۸]

جس پسماندہ طبقہ کے لوگوں کی زندگی اور ان کی سماجی صورت حال کو قرۃ العین حیدر نے''برف باری سے پہلے'' میں دکھانے کی کوشش کی ہے دراصل وہ سماجی اور ذات پات کے تشخیص کے تحت قائم کیا گیا ایک نظام ہے۔اس افسانے میں پسماندہ طبقے کی زندگی اور ان کے مسائل کے ساتھ اعلیٰ طبقے کے لوگوں کی ذہنیت

کو پیش کرنے کی یہی وجہ ہے کہ انسان کی ذہنی انتشار کو آئینہ کر کے دکھایا جا سکے۔ افسانے میں قدیم اور جدید معاشرہ ہمارے سامنے اس طرح ابھر کر آتا ہے کہ ہم افسانے کے پس منظر پر ہندوستان کی طبقاتی تفریق اور سماجی اصول وضابطے کی جیتی جاگتی تصویر دیکھ لیتے ہیں۔

''شیشے کے گھر'' میں شامل افسانہ ''جلاوطن'' قرۃ العین حیدر کا بہترین افسانہ ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اس افسانے کو اپنے بہترین افسانوں میں شمار کیا ہے۔ یہ افسانہ تقسیم ہند اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والے مسائل پر لکھا گیا ہے جس میں انسانی اقدار کی شکست وریخت اور تہذیبی زوال کو پیش کیا گیا ہے۔ فن کار کا یہ افسانہ تخلیقی اعتبار سے منفرد اور اپنی مثال آپ ہے۔ 'جلاوطن' ہر اس شخص کا المیاتی اظہار ہے جو تقسیم کے درد اندوہ حالات سے دوچار ہوا اور اس کے ساتھ اپنے ہی ملک میں اپنوں سے ہی بے گانوں سا رویہ برتا گیا۔ اس افسانے میں قرۃ العین حیدر نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور سماجی زندگی کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ افسانے کے متعلق عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں کہ:

> ''جلاوطن، کا موضوع کوئی فرد یا اس کے مسائل نہیں ہیں بلکہ صدیوں پرانی ہندو مسلم مشترکہ تہذیب اور اس کی شکست وریخت سے پیدا ہونے والے انسانی اور سماجی مسائل ہیں، جس میں اگرچہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد دونسلوں کے کرداروں کو نمائندہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔''[۱۹]

افسانہ 'جلاوطن' میں قرۃ العین حیدر نے قصبہ امین آباد کی ایسی تصویر دکھائی ہے جہاں ہر مذہب اور ہر طبقے کے لوگ موجود ہیں۔ ہندوستان کے طبقاتی نظام پسماندہ طبقے کی زندگی کے مسائل اور دیگر امور بھی مصنفہ نے پیش کئے ہیں۔ یہ افسانہ شروع ہی پسماندہ طبقے کی رام رکھی سے ہوتا ہے۔ رام رکھی گھروں میں کام کرنے والی ایک ملازمہ ہے۔ قرۃ العین حیدر نے رام رکھی کی منظر نگاری بڑی جاندار طریقے سے کی ہے۔ افسانے کے ابتداء میں رام رکھی دروازے پر بیٹھ کر اناج صاف کر رہی ہے اس وقت ہیم کرن کا بھائی ڈاکٹر آفتاب رائے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ مصنفہ نے اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کے مابین جس مکالماتی منظر کو پیش کیا

ہے اس سے دونوں طبقے کے بیچ انسانی ہمدردی کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ منظر مصنفہ نے قریب سے دیکھا ہوا اور افسانے میں اس کی ہو بہو تصویر اتار دی ہو۔ اقتباس دیکھیں:

''چوکھٹ پر اکڑوں بیٹھی رام رکھی نہایت انہاک سے چاول صاف کر رہی تھی۔ اس کے گانے کی آواز دیر تک نیچے گموں والی سنسان گلی میں گونجا کی۔ پھر ڈاکٹر آفتاب رائے صدر اعلیٰ کے چبوترے کی اور سے بڑھے پھاٹک کی سمت آتے دکھلائی پڑے۔

''بندگی بھین صاحب۔۔۔'' ''بندگی۔۔۔'' ڈاکٹر آفتاب رائے نے زینے پر پہنچتے ہوئے بے خیالی سے جواب دیا۔

''راجی کھسی ہو بھین صاحب۔۔۔'' رام رکھی نے اخلاقاً دریافت کیا۔

''اور کیا۔۔۔ مجھے کیا ہوا ہے جو راضی خوشی نہ ہوں گا۔ یہ سوپ ہٹا بیچ میں سے''۔ انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔

''بھین صاحب ناج پھٹک رہی تھی''

''تو ناج پھٹکنے کے لئے تجھے گاڑی بھر راستہ چاہئے۔ چل ہٹا سب چیز۔۔۔''[۲۰]

قرۃ العین حیدر نے رام رکھی کا ذکر صرف ملازمہ کے طور پر ضمناً نہیں کیا ہے بلکہ اس کی تصویر ہندوستانی تہذیب کے آئینے میں پیش کی ہے۔ پسماندہ طبقے کے نوکر پیشے سے تعلق رکھنے والی رام رکھی کی زندگی پسماندہ طبقے کی نمائندہ ہے۔ مصنفہ نے اس کی زبان اور اظہار کے انداز کا بھی پورا خیال رکھا ہے۔ رام رکھی کے علاوہ پسماندہ طبقے کی ممولہ ڈومنی بھی نظر آتی ہے جو گھروں میں صفائی کا کام کرتی ہے۔ دراصل قرۃ العین حیدر کا یہ کمال ہے کہ جب وہ کسی معاشرہ یا کسی تہذیب کو پیش کرتی ہیں تو افسانے کے پس منظر پر اس کی پوری تصویر اسی طرح ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ممولہ یا رام رکھی دونوں ایسے کردار ہیں جو بیشتر گھروں میں نظر آتے ہیں۔ گھروں کا یہ کام مخصوص ہے جو پسماندہ طبقے کے نچلے ذاتی کے لوگ ہی کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر

نے ممولہ کے کردار کو سادے انداز میں پیش نہیں کیا ہے بلکہ ممولہ کی نفسیاتی کیفیت کو بھی دکھایا ہے۔ جب چھمّو بیگم بڑی بھاوج کے یہاں محرم میں نوحہ خوانی کے لئے دعوت پر مدعو کی جاتی ہیں تو وہاں پہنچتے ہی بڑی بھاوج کے گھر کے اندر بہنے والے نالے پر طنز کرتی ہے جس پر ممولہ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ چھمو بیگم نے اس پر اور اس کے کام پر طنز کیا ہے جس کے ردِعمل میں ممولہ پلٹ وار کرتی ہے۔اس منظر کو قرۃ العین حیدر نے اس طرح پیش کیا ہے۔

> ''چھمو بیگم ڈولی میں سے اتریں۔اور پائنچے سمیٹ کے پانی سے لبریز نالی کو الانگنے کے ارادے سے آگے بڑھیں'' اللہ رکھے بڑی بھاوج کے ہاں تو ہر وقت بس بہیا سی آئی رہتی ہے''۔انہوں نے ذرا بیزاری سے کہا۔
>
> کہیں ممولہ نے یہ سن لیا'' اے چھمو بیگم۔۔۔ذری زبان سنبھال کے بات کیا کیجئے۔ بڑی بھاوج کے دشمنوں کے گھر بہیا آوے۔شیطان کے کان بہرے۔۔ایسا تو میں نے آنگن کا سارا پانی سونتا ہے۔اپنے ہاں نہیں دیکھیں۔ساری گلی کو لیکے نوبت رائے کا تلاؤ بنا رکھا ہے۔اتا اتا پانی آپ کے گھر میں کھڑا رہتا ہے۔ہاں'' اس نے منہ در منہ جواب دیا۔
>
> '' اے بی ممولہ ۔۔۔ ذری آپے میں رہنا ۔۔۔ میں خود سے نہیں آ گئی۔ بڑی بھاوج نے سو دفعہ بلایا کہ آ کر مجلس پڑھ جاؤ۔۔۔مجلس پڑھ جاؤ۔۔۔ میں اپنے گھر سے فالتو نہیں ہوں کہ ماری ماری پھروں۔اور ٹکے کی ڈومنیوں کی باتیں سنوں۔۲۱

مذکورہ مکالمے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پسماندہ طبقے کی ممولہ اپنے اندر اظہار ذات کا جذبہ بھی رکھتی ہے۔چھمّو بیگم کے اعتراض پر وہ نہ صرف اپنے کام کے تئیں تن کر کھڑی ہو جاتی ہے بلکہ چھمو بیگم کو منہ در

منہ جواب بھی دیتی ہے۔ ممولہ کا یہ جذباتی اظہار دراصل ہر انسان کا جذباتی فعل ہے جہاں ہر کوئی کھڑا ہو سکتا ہے۔ انسانی فطرت کا یہ عام امور ہے کہ جب کوئی کسی کے کام میں خامیاں نکالتا ہے تو گویا وہ پوری طرح سے سامنے والے کی زندگی پر نکتہ چینی کرتا ہے، جسے کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ رام رکھی اور ممولہ الگ الگ گھروں میں ملازم تھیں۔ ان نوکر پیشہ لوگوں کا اپنے کام کے ساتھ ان کی ذات بھی الگ ہے۔ مثلاً ممولہ ڈومنی ذات سے تعلق رکھتی ہے اور اس طبقے کے لوگوں کا کام گھروں کی غلاظت صاف کرنا ہے۔ ممولہ بھی بڑی بھاوج کے یہاں مہترانی کا کام کرتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ممولہ کے کام اور اس کے طبقے کے ساتھ اس کے جذبات اور نفسیات کو بھی ابھارا ہے۔

''جلا وطن''، میں قرۃ العین حیدر نے سماج کا ایک اور پسماندہ طبقہ کہاروں کی زندگی اور ان کی معاشی حالات کو پیش کیا ہے۔ یہ کہار طبقہ لوگوں کو امین آباد کی گلیوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ ڈولی میں اٹھائے کاندھوں پر پھرتے ہیں اور ان کا پیشہ ہی ان کے معاش کا ذریعہ ہے۔ رام بھروسے اور ان کے کہار برادری محلوں کی عورتوں کو ڈھو کر روز کے ایک ایک دو دو پیسے کماتے ہیں۔ کہاروں کی زندگی اور ان کے معاشی مسائل کو مصنفہ نے بڑی فکری انداز میں بیان کیا ہے کہ کیسے پسماندہ طبقے کا کہار، بلا چوں چرا ایک ایک دو دو پیسے کے لئے خون پسینہ بہاتا ہے اور کڑی محنت کر کے اپنا اور گھر والوں کا گزارا کرتا ہے۔ مصنفہ نے کہاروں کی محنت کش زندگی کو بڑی رحم دلی سے پیش کیا ہے۔ محرم کا مہینہ آتے ہی کہار برادری خوش ہو جاتی ہے کیونکہ اس مہینے میں ان کو سواری زیادہ مل جاتی ہیں اور کمائی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مصنفہ نے محرم الحرام کا مہینہ آنے پر ان کی خوشی کو اس انداز میں پیش کیا ہے:

> ''ویسے محرم کی وجہ سے اب پیسے خوب ملیں گے۔ چہلم تک دس دس پھیرے ایک گلی کے ہوتے تھے اور ہر پھیرا تین تین پیسے۔ دور کے محلوں تک آنے جانے کے تو دو دو آنے تک ہو جاتے تھے۔ بس چاندی تھی آج کل بھائی رام بھروسے اور ان کی برادری کی۔ اور ریڑوے جو چل رہے تھے وہ الگ۔ ریڑوے ایک طرح کا لکڑی کا کرسی نما ٹھیلہ ہوتا

تھا جس میں چاروں طرف پردہ باندھ دیا جاتا تھا۔اندر دو دو تین تین
سواریاں گھس پٹ کر بیٹھ جاتی تھیں ۔اور بچوں کی انگریزی پرام کی
طرح دھکیلا جاتا تھا۔اور چرخ چوں کرتا ریڑوہ گلیوں کے پتھریلے فرش
پر بڑے ٹھاٹھ سے چلتا۔پالکی کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔یعنی چھ آنے فی
پھیرا۔۲۲

قرۃالعین حیدر نے مذکورہ افسانہ ''جلاوطن'' میں گھریلو ملازمہ،مہترانی اور کہارا ٹھانے والے سماج کے تین پسماندہ طبقے کو پیش کیا ہے۔مصنفہ نے ان کی زندگی اور ضرورت کو پیش کرتے ہوئے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ سماج کا وہ طبقہ ہے جسے نچلے درجے کے چھوٹی ذاتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ان کی خواہشات بھی ان کے طبقے کی طرح محدود ہے،ان کی زندگی کا مقصد کوئی متعین شدہ اصول پر قائم نہیں ۔یہ لوگ اپنی زندگی کو اپنی قسمت کے سہارے گزارتے دکھائی دیتے ہیں۔قرۃالعین حیدر نے ''جلاوطن'' میں پسماندہ طبقے کی زندگی اوران کے مسائل کو بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے وہ ان کے مسائل ومعاملات کے ساتھ ان کی نفسیات اور جذبات کا اظہار حقیقی پیرائے میں کرتی ہیں ۔اس سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ مصنفہ اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے ساتھ پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی سے بھی اچھی طرح واقف تھیں۔

پت جھڑ کی آواز:

''پت جھڑ کی آواز'' قرۃالعین حیدر کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔یہ افسانوی مجموعہ ان کے دورِعروج کا تخلیقی سرمایہ ہے جس پر ۱۹۶۷ء میں ساہتیہ اکیڈمی اردو نے اعزاز سے نوازا۔مصنفہ کے اس مجموعے میں مختلف موضوعات پر افسانے موجود ہیں جس میں سماج کے الگ الگ مسائل کو جگہ دی گئی ہے مثلاً ،اس عہد کے سماجی حالات وواقعات ،معاشی صورت حال،تہذیبی کشمکش ،وقت کی جبریت ،سیاسی صورت حال،مذہبی رواداری، اقدار کی شکست وریخت ،سماج کے پسماندہ طبقے کے لوگوں کی تفریق میں ہندوستانی معاشرے کا طبقاتی نظام

جیسے اہم نکات کو افسانے کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''ڈالن والا'' ہے ۔ڈالن والا، میں قرۃ العین حیدر نے سماج کے پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی، ان کے مسائل اور ان کے حالات کو پیش کیا ہے۔

''ڈالن والا'' ایک جگہ کا نام ہے۔ دہرہ دون میں آباد 'ڈالن والا' انڈین اور انگلو انڈین لوگوں کی بستی ہے۔ یہ بستی مختلف لوگوں سے بھری ہوئی ہے، یہاں سماج کے الگ الگ طبقے کے لوگ موجود ہیں جو خوبصورت ماحول اور بہترین کوٹھیوں میں خاموشی سے زندگی بسر کر رہے ہیں جس کے سبب ان کے حالات اور مسائل افسانے میں کم نظر آتے ہیں، وہیں اس خوش حال اور مطمئن محلے میں میوزک ماسٹر سائمن، گھر کا نوکر فقیرا، مسٹر جارج بیکٹ اور ان کی بیٹی ڈائنا جیسے سماج کے پسماندہ طبقے کے کردار بھی موجود ہیں۔قرۃ العین حیدر نے ان پسماندہ طبقے کے کرداروں کے حالات اور مسائل کا احاطہ بڑی فن کاری کے ساتھ کیا ہے۔ڈالن والا، کے مطالعہ سے ان کی حالات اور کیفیات پوری طرح ہمارے سامنے تصویر بن کر ابھرتے ہیں۔ سہیل بیابانی لکھتے ہیں کہ:

> ''ڈالن والا، میں نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے کرداروں میں سائمن صاحب، جارج بیکٹ اور ان کی لڑکی ڈائنا اور زہرہ ڈربی اہم ہیں۔ پسماندہ اور مفلس طبقے میں جل دھرا، فقیرا اور سردار خان شامل ہیں۔...........انھوں نے نچلے متوسط طبقے کے اقتصادی مسائل اور ان مسئلوں کو سلجھانے کی جدوجہد اور تڑپ بھی بڑے دل دوز انداز میں اجاگر کی ہے۔نادار اور مفلس طبقے سے تعلق رکھنے والوں کی زندگی اور اعلیٰ طبقے کی زندگی کے جذباتی اور نفسیاتی مسئلوں کے فرق کو بھی انہوں نے بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔''[۲۳]

''ڈالن والا'' پنشن یافتہ خوش حال لوگوں کا محلّہ ہے لیکن میوزک ماسٹر مسٹر سائمن کی غربت اور کسمپرسی قابل رحم ہے۔سائمن ایک دبلا پتلا بوڑھا سا آدمی ہے۔ جو 'ڈالن والا' میں لوگوں کو پانچ روپے مہینے پر موسیقی کی

تعلیم دیتا ہے۔ سائمن کی تنہا زندگی اور اس کی معاشی ضرورت میوزک ٹیوشن کی کمائی سے پوری ہوتی ہے، اس کے مہینے بھر کی کمائی آٹھ سے دس روپے پر مشتمل ہے۔ سائمن کی غریبی اور مفلسی کا یہ عالم ہے کہ اس کے پاس ایک ہی جوڑی کپڑا ہے، وہ ہمہ وقت اسی کو پہنتا ہے۔ اس کی اتنی استطاعت نہیں کہ اپنے لئے مزید ایک جوڑی کپڑا خرید سکے۔ کرسمس کے موقع پر جب سائمن کو تحفے میں دس روپے ملتے ہیں تو سائمن بہت خوش ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے سائمن کی محدود زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ 'ڈالن والا' میں اس کی غربت اور افلاس زدہ حال پر کسی کی نظر نہیں پڑتی، سائمن لوگوں کے بیچ آتا ہے لیکن اس کی پسماندہ حالت کی خبر کوئی نہیں لیتا۔ سائمن کے حوالے سے مصنفہ نے انسانی اقدار کے مٹتے ہوئے منظر نامے کو اس طرح پیش کیا ہے۔

> ''کرسمس کو تین دن گزر گئے مگر سائمن نہ آئے۔ چوتھے دن ان کی خیر خبر لانے کے لیے فقیرا کو پادری اسکاٹ کے گھر بھیجا گیا۔ اس نے واپس آکر سر جھکا لیا اور آہستہ سے کہا۔۔۔ ''سائمن صاحب کی مٹی ہو گئی۔ پادری صاحب کا مالی بتا رہا تھا کہ بڑے دن کے روز اس نے کوٹھری کا دروازہ کھولا تو سائمن صاحب چارپائی پر مرے پڑے تھے۔ انہیں سردی لگ گئی۔
>
> ''ان کے پاس ایک ہی کمل تھا بیگم صاحب۔۔۔ رات کو وہی کوٹ پتلون پہنے پہنے سوتے تھے۔''[۲۴]

افسانہ ''ڈالن والا'' میں فقیرا پسماندہ طبقے کا نوکر پیشہ کردار ہے جو افسانہ نگار کی چچی زاد بہن ریحانہ کے گھر میں ملازم ہے۔ فقیرا، ایک پہاڑی ہے جو گڑھوال کا رہنے والا ہے۔ فقیرا کے خاندان میں اس کے دو بھائی اور اس کی بھاوج جل دھرا ہے۔ گڑھوال پہاڑی پر پولی اینڈری کے رسم و رواج کے مطابق جل دھرا فقیرا کے دونوں بھائیوں کی بیوی تھی۔ فقیرا کے دونوں بھائی پہاڑ پر آنے جانے والے مسافروں کا سامان ڈھوتے تھے، ایک دن اتفاق سے دونوں بھائی ایک ہی پہاڑی سے گر کر مر گئے۔ بھائیوں کے مرنے کے بعد جل دھرا فقیرا کی بیوی بن جاتی ہے اور فقیرا اسے اپنے ساتھ لا کر 'ڈالن والا' میں خوشی سے رہتا ہے۔ پسماندہ طبقے کا

گڑھوالی فقیرا کی پہاڑی زندگی اور اس کے حالات کا ایک منظر ذیل کے اقتباس سے ملاحظہ کریں:

''فقیرا ایک ہنس مکھ گڑھوالی نوجوان تھا۔ دو سال قبل وہ چیتھڑوں میں ملبوس، نہر کی منڈیر پر بیٹھا، اون اور سلائیوں سے موزے بن رہا تھا۔ جو پہاڑیوں کا عام دستور ہے، تو سکھ نندن خانساماں نے اس سے پوچھا تھا: کیوں بے نوکری کرے گا۔؟ اور اس نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے جواب دیا تھا: مہینوں سے بھوکوں مر رہا ہوں کیوں نہیں کروں گا۔'' تب سے وہ ہمارے یہاں ''اوپر کا کام'' کرتا رہا تھا اور ایک روز اس نے اطلاع دی تھی کہ اس کے دونوں بڑے بھائیوں کی مٹی ہوگئی ہے اور وہ اپنی بھاوج کو لینے گڑھوال جا رہا ہے، اور چند دنوں بعد اس کی بھاوج جل دھرا پہاڑوں سے آ کر شاگرد پیشے میں بس گئی تھی۔'' ۲۵

جل دھرا ادھیڑ عمر کی گوری چٹی عورت تھی جس کے چہرے پر رنگ برنگے نقش و نگار گدے ہوئے تھے اس کی آمد پر 'ڈالن والا' میں رہنے والے دیگر نوکروں کی بیویاں آپس میں چہ میگوئیاں کرتی ہیں کہ ان پہاڑیوں کا کیسا برا رواج ہے، ایک لگائی کے دو دو تین تین خاوند۔ قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں پسماندہ طبقے کے غریب پہاڑیوں کی تہذیبی زندگی، ان کے رسم و رواج اور لوگوں کے ساتھ ان کا عملی رویہ کیسا ہے، ان سب معاملات کو بڑی فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ افسانے کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مصنفہ فقیرا کے ساتھ گڑھوالوں کی زندگی اور ان کے رسم و رواج سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ واقفیت ہی ہے کہ قرۃ العین حیدر نے اعلیٰ طبقوں کے ساتھ پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی، ان کے جذبات، نفسیات، رہن سہن اور ان کے مسائل کو پیش کیا ہے۔

''ڈالن والا'' میں پسماندہ طبقے کے غریب اور مفلس لوگوں کی روزمرہ زندگی کے مسائل زیادہ نظر آتے ہیں۔ ماسٹر سائمن، فقیرا کے علاوہ مسٹر جارج بیکٹ اور ان کی بیٹی ڈائنا بھی ہے۔ جارج بیکٹ انگلو انڈین شخص ہے جو نہایت غریب اور فاقہ کش انسان ہے، ان کی زندگی کی کفالت ڈائنا کی کمائی سے ہوتی ہے۔

ڈائنابیکٹ سنیما ہال کی ٹکٹیں ۲۵ روپے مہینے پر بیچا کرتی ہے جو بعد میں سماج کی طنز وملامت سے بے زار ہو کر سرکس کی دنیا میں چلی جاتی ہے اور اپنی دونوں ٹانگیں کھو دیتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے ڈائنا اور جارج بیکٹ کی افلاس زدہ حال اور مجبوریِ زندگی کو بڑی رحم دلی سے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بھوک اور مجبوری انسان کو ہر عمل کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔جارج بیکٹ اور ڈائنا کی تصویرِ حال کو قرۃ العین حیدر نے اس طرح پیش کیا ہے۔

''مسٹر جارج بیکٹ ایک بے حد فاقہ زدہ اینگلو انڈین تھے اور پیلی صاحب کہلاتے تھے۔وہ سڑک کے سرے پر ایک خستہ حال کائی آلود کاٹج میں رہتے تھے اور بالٹی اٹھا کر صبح کو میونسپلٹی کے نل پر خود پانی بھرنے جایا کرتے تھے۔ان کی ایک لڑکی تھی جس کا نام ڈائنا تھا۔وہ پریڈ گراؤنڈ پر ایک انگریزی سنیما ہال میں ٹکٹ بیچتی تھی اور خوش رنگ فراک پہنے اکثر سامنے سے سائکل پر گزرا کرتی تھی، اس کے پاس صرف چار فراک تھے جنہیں وہ دھو دھو کر اور بدل بدل کر پہنا کرتی تھی۔''۲۶

''ڈالن والا'' کے مذکورہ پسماندہ طبقے کے کرداروں کے علاوہ بھی نچلے طبقے کے کردار نظر آتے ہیں جیسے غفور بیگم وفادار گھر کی انا، مسٹر رابرٹ سردار خان پھیری والا اور اس کی بیوی، دی گریٹ ایسٹ انڈین سرکس میں کام کرنے والی مس زہرہ ڈربی وغیرہ پسماندہ طبقے کے ہی کردار ہیں جن کی ضرورت کو دکھاتے ہوئے ان کی سماجی اور معاشرتی اہمیت کو مصنفہ نے ابھارا ہے۔'ڈالن والا' کے مذکورہ تمام کردار وقت کی جبریت کے سامنے بے بس ہیں اور اسی جبر سے نکلنے کی کوشش میں بعض اوقات موت کے منہ میں بھی چلے جاتے ہیں۔

''پت جھڑ کی آواز'' کا اگلا افسانہ ''یاد کی اک دھنک جلے'' ہے جس میں قرۃ العین حیدر نے پسماندہ طبقے کی گھریلو ملازمہ 'گریسی' کی زندگی اور اس کے جذباتی اتار چڑھاؤ کو موضوع بنایا ہے۔تخلیق کار اپنے بچپن میں چچا ناصر کے گھر گرمیوں کی چھٹی گزارنے آتی ہے تو گریسی اس کا استقبال انتہائی جوش وخروش سے کرتی

ہے۔گریسی گہری سانولی رنگت اور مضبوط کاٹھی کی اڑتیس سالہ وفادار اور محنتی عورت ہے۔وہ بمبئی کے بیشتر عوام کی مانند ہفت زبان خاتون ہے ۔ کوکنی ،مرہٹی ، گجراتی کے علاوہ ٹوٹی پھوٹی اردو انگریزی بھی بولتی ہے۔گریسی بیس سال کی عمر میں بیوہ ہوگئی تھی بمبئی میں اس کی زندگی خود کی محنت پر منحصر ہے، وہ لوگوں کے گھروں میں ملازمت کا کام کرتی ہے۔گریسی نے آٹھ سالہ قبل ناصر چچا کے یہاں ملازمت اختیار کی تھی اور سعیدہ چچی کے انتقال کے بعد سے وہ مستقل طور پر اس گھر کی ملازمہ ہوگئی، کیونکہ سعیدہ چچی نے مرتے وقت گریسی کو اپنے تین سالہ بیٹے کے ذمہ داری سونپی تھی، جسے گریسی بے حد دلسوزی سے پال رہی تھی اور اس پر اپنی جان بھی چھڑکتی تھی۔

> ''ناصر چچا کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ان کے اکلوتے بچے علی اصغر کی پرورش ایک گوانی آیا کے سپرد تھی۔سعیدہ چچی بچے کو تین سال کا چھوڑ کر اللہ میاں کے گھر سدھاری تھیں اور مرتے وقت اسے گریسی کو سونپ گئی تھیں،اور اس سے کہا تھا کہ اگر تم اسے چھوڑ کر چلی گئیں اور کہیں اور نوکری کر لی تو قیامت کے روز تم سے پوچھوں گی۔'' [۲۷]

اس افسانے میں قرۃ العین حیدر نے پسماندہ طبقے کی ملازماؤں کی زندگی اور ان کے جذبات ونفسیات کو بڑی ہمدردی کے ساتھ پیش کیا ہے۔گریسی وفادار ملازمہ کے ساتھ اخلاقی اعتبار سے بھی اہمیت کی حامل ہے۔ناصر چچا کے انتقال کے بعد گریسی بحیثیت ملازم، بیوی اور ماں کی اس گھر میں خدمت انجام دے رہی ہے۔وہ سماجی حیثیت سے پسماندہ طبقے کی غریب اور لاچار ہونے کے بعد جذباتِ انسانی سے بھرپور کردار نظر آتی ہے ۔اس کے دل میں خلوص اور محبت کا جذبہ موجود ہے۔سعیدہ چچی کے انتقال کے بعد علی اصغر اور گھر کی پوری ذمہ داری گریسی خود ہی سنبھالتی ہے۔گریسی اس گھر میں سینئر ملازمہ کی حیثیت سے رہتی ہے اور گھر کے دوسرے ملازماؤں پر حکومت چلاتی ہے۔گریسی کو یہ حق سعیدہ چچی نے مرتے وقت دیا تھا جسے ناصر چچا نے بھی قبول کرتے ہوئے اسے گھر کے خانہ داری کا مالک بنا دیا۔''یاد کی اک دھنک جلے'' قرۃ العین حیدر کا وہ افسانہ ہے جس میں ترقی پسند نظریات کی تردید نظر آتی ہے یہاں نچلے طبقے کی غریب ملازمہ کا

استحصال نہیں بلکہ گریسی کو ناصر چچا نے اپنے گھر کی پوری ذمہ داری سونپ دی ہے۔مصنفہ نے گریسی کے ذریعے اعلیٰ و پسماندہ طبقے کے ان حالات اور منظر کو اس طرح پیش کیا ہے۔

''جب ہم ادھر اپنی میم صاحب کے پاس نوکری کیا تو ہم کو لگا جیسے ہم جنت میں آ گیا۔۔ ہمارا میم صاحب بالکل اینجل کی موافق تھا۔اسی لیے جلدی سے ہیون HEAVEN کو چلا گیا۔''اس نے ساری کے کونے سے آنسو خشک کیے اور چٹائی پر اکڑوں بیٹھ کر کہتی رہی ۔۔ہم، صاحب میم صاحب کے پاس نوکری کیا تو جوزف کی ڈیتھ کے بعد ہم کو زندگی میں پہلی بار عزت ملا اور ہم کو لگا کہ ہمارے سر پر بھی چھت ہے۔۔۔صاحب ہمارا اب بھی بہت کھیال کرتا ہے۔۲۸؎

قرۃ العین حیدر نے گریسی کے ذریعے سماج کے پسماندہ طبقے کی زندگی اور مسائل کو پیش کرنے کے ساتھ ایک عورت کے طور پر گریسی کی داخلی کیفیات اور جذبات کو بھی دکھایا ہے۔سعیدہ چچی کے انتقال کے بعد علی اصغر، ناصر چچا اور پورے گھر کا خیال رکھتے رکھتے گریسی کے دل میں ماں کی محبت اور عورت کا جذبہ بیدار ہو گیا تھا وہ روحانی طور پر علی اصغر کی ماں بن چکی تھی۔گریسی کو علی اصغر کی ہمیشہ فکر رہتی ہے اسی لئے جب ناصر چچا کی شادی کی بات ان کی رشتہ دار عورتوں نے کی تو گریسی کو یہ فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ آنے والی سوتیلی ماں علی اصغر کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرے گی۔لہٰذا وہ آنکھوں میں آنسوں لئے مریم مقدس کے پاس جا کر دعا کرتی ہے اور گڑ گڑا کر کہتی ہے۔

''ماں۔۔۔تم مزے سے مسکرائے جا رہی ہو۔۔تم تو بیس کی عمر میں بیوہ نہیں ہوئیں۔۔۔تم تو جانتی ہی نہیں کہ آدمی کا پیار کیسا ہوتا ہے۔تم نے تو دس برس تک دردر کی ٹھوکریں نہیں کھائیں۔تم تو فٹ پاتھ پر کبھی نہیں سوئیں۔تمہیں کیا پتا کہ سکیورٹی اور گھر اور پوزیشن کا کیا مطلب ہے؟

''تمہارے اکلوتے بیٹے پر کوئی سوتیلی ماں نہیں آئی۔تم کو پتا بھی نہیں سو

تیلی ماں کیسی ہوتی ہے ۔۔۔مدر ۔۔۔ دیواچ مائے ۔۔۔دیواچ
مائے ۔۔۔۔اس نے اپنے ہاتھ میز پر پھیلا کر مجسمہ بانہوں کے حلقے
میں لے لیا اور اس کے ننھے منے سفید پیرو پر سر رکھ کر چپ ہوگئی۔[۲۹]

گریسی کی مذکورہ کیفیات اور انتشار کی گرمی محسوس کی جا سکتی ہے۔ مصنفہ نے گریسی کے جس نفسیاتی پہلو کو ابھارا ہے وہ دراصل عورت کا فطری پہلو ہے۔ وہ علی اصغر کے متعلق سوچ کر پریشان ہوتی ہے کہ یہ شادی بچے کے حق میں بہتر نہیں ہے۔ گریسی مقدس مریم سے رو رو کر دعائیں کرتی ہے کہ یہ کیسا ظلم ہے اس معصوم بچے پر جس کے لئے یہ قدم اٹھایا جا رہا ہے۔ کچھ دنوں بعد جب ناصر چچا کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو گریسی کو ایک عجیب سا سکون مل جاتا ہے۔ وہ مقدس مریم کے پاس جا کر کہتی ہے:

''ماں تم ایک دم فرسٹ کلاس ہو ماں ۔۔تم نے ہمارا نو دنیا قبول کر
لیا ماں۔۔''[۳۰]

گریسی کے اندر جو جذبہ دکھائی دیتا ہے وہ کسی مفاد پر مبنی نہیں ہے بلکہ ایک محنت کش عورت اور ایک ماں کا احساس ہے۔۱۹۴۷ کے بعد ملک کی تقسیم کے وقت بمبئی میں فساد شروع ہو جاتا ہے اس کے بعد چچا ناصر، علی اصغر اور گریسی پاکستان چلے جاتے ہیں۔ پاکستان میں گریسی کی شادی ناصر چچا سے ہو جاتی ہے اور وہ ملازمہ سے گھر کی مالکن بن جاتی ہے۔ گریسی اب بہت خوش ہے وہ اپنے شوہر اور بیٹے کی خدمت کرتی ہے لیکن اس کی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی اس وقت آتی ہے جب ناصر چچا کا انتقال ہو جاتا ہے اس کے بعد علی اصغر اپنی ماں کو در بدر بھٹکنے کے لئے تنہا چھوڑ دیتا ہے، گریسی اپنی زندگی کے آخری وقت میں ایسے راستہ پر کھڑی ہے جہاں پر ہر کسی کو سہارے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن گریسی کا کوئی پرسان حال نہیں، وہ دنیا کے بھیڑ میں کبھی نہ ختم ہونے والا احساس لیے گم ہو جاتی ہے۔ گریسی اتنی بڑی دنیا میں اب کہاں ہے کسی کو پتا نہیں۔ افسانے کے اختتام میں گریسی کے تعلق سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ کیا سماجی نظام کے تحت پسماندہ طبقے کی غریب ملازمہ کی قسمت میں یہی تھا؟ یا نچلے طبقے کی پسماندہ گریسی کا سماج میں کوئی اہمیت نہیں؟ بقول عظیم الشان صدیقی

''یاد کی اک دھنک جلے'' میں زندگی کے ان پہلوؤں کو تلاش کرنے کی

کوشش کی ہے جو عورت کو بھٹکنے سے بچا سکتے ہیں۔لیکن اس تلاش میں
انہیں عورت قوت اور کمزوری کا عجیب وغریب مرکب نظر آتی ہے، جو
حسن سیرت، حسن انتقام، خدمت وایثار اور وفا شعاری کے ذریعے سماج
کے تمام بندھن کو توڑ کر مرد کے دل اور گھر پر قبضہ کرسکتی ہے لیکن آخر میں
اس کا انجام وہی تنہائی، محرومی اور مجبوری ہے۔''یاد کی اک دھنک جلے''
عورت کی زندگی کے ایسے ہی پہلوؤں کو پیش کرتا ہے۔'' ۳۱

''یاد کی اک دھنک جلے'' میں قرۃ العین حیدر نے گریسی کی پسماندہ مسائل اوراس کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کے مختلف پہلو کو پیش کیا ہے۔اس پیش کش سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ نے پسماندہ طبقے کی ملازم پیشہ گریسی کی پوری شبیہ کو ابھارا ہے، ساتھ ہی پسماندہ طبقے کے ملازم پیشہ لوگوں کی روزمرہ زندگی، خواہشات، زبان و بیان، حالات، جذبات، نفسیات اوران کے سماجی زندگی کے مسائل سے بھی واقفیت رکھتی تھیں۔ قرۃ العین حیدر نے ''یاد کی اک دھنک جلے'' میں سماج کے نچلے طبقے کی ملازمہ کی زندگی اوراس کے مسائل کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

''پت جھڑ کی آواز'' کا ایک اور افسانہ ''کارمن'' کے نام سے ہے۔اس افسانے میں قرۃ العین حیدر نے کارمن اور نِک کی محبت اور دونوں کی تضاد زندگی کو پیش کیا ہے لیکن زیادہ توجہ کارمن کی زندگی کے مسائل اور اس کے ساتھ رہنے والی پسماندہ طبقے کی غریب دوستوں پر دیا ہے۔کارمن کے دوستوں میں ایمیلیاؔ، روزاؔ، مگدیلینیاؔ اور برنارڈاؔ ہیں جو وائی۔ڈبلیو۔سی میں اس کے ساتھ رہتی ہیں۔یہ نچلے طبقے کی پسماندہ لڑکیاں ہیں جو اپنی غربت و افلاس کی وجہ سے اس گندے ہاسٹل میں کم پیسوں پر روم لے کر رہتی ہیں اور یہیں تعلیم بھی حاصل کررہی ہیں۔بقول ڈاکٹر صاحب علی:

''وہاں نچلے طبقے کی عورتوں کی قسمت میں گندے ورکنگ وومن ہاسٹل
ہیں جہاں نہ تو انہیں کوئی سہولت حاصل ہے بلکہ انھیں ہر طرح کی
پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔مچھروں سے بھرے کمرے میں

راتیں گزارنی پڑتی ہیں۔اوروہ جہاں کام کرتی ہیں وہاں پراپنے بڑوں
کےاستحصال کاشکار ہونا پڑتا ہے۔''۳۲؎

کارمن اس خستہ ہال گرلس ہاسٹل وائی۔ڈبلو۔سی میں رہتے ہوئے نِک کا انتظار برسوں سے کرتی ہے۔کارمن سے مصنفہ کی ملاقات وائی۔ڈبلو۔سی میں ہی ہوتی ہے جہاں کارمن اپنی زندگی کی داستان سناتی ہے۔افسانے کے پس منظر پر کارمن کی بیچارگی اجاگر ہوتی ہے۔وہ حالات اور وقت کی ستم زدگی کا سامنا کرنے کے بعد یہاں تک پہنچی ہے۔مصنفہ نے طبقاتی عدم مساوات، افلاس اور پسماندہ زندگی کا احاطہ ہندوستان سے باہر یورپ بھی کیا ہے۔قرۃالعین حیدر نے ہاسٹل کی تصویرکواس طرح پیش کیا ہے کہ ہاسٹل میں رہنے والوں کی زندگی ابھرکرسامنے آجاتی ہے۔

''چلوتمھیں غسل خانہ دکھادوں''۔۔۔۔کارمن نے مجھ سے کہااور ہال
میں سے گزرکرایک گلیارے میں لے گئی جس کے سرے پر ایک ٹوٹی
پھوٹی کوٹھری سی تھی جس میں صرف ایک نل لگا ہوا تھا اور دیوار پر ایک
کھونٹی گڑی تھی۔اس کا فرش اکھڑا ہوا تھااوردیواروں پرسیلن تھی۔۳۳؎

اس افسانے میں قرۃالعین حیدر نے کارمن اور دیگر پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی اوران کے حالات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔وائی۔ڈبلیو۔سی دراصل ایک ایسا خستہ حال عمارت ہے جہاں غریب پسماندہ طبقے کی لڑکیاں رہتی ہیں۔سماج کا اعلیٰ طبقہ ہاسٹل اوراس میں قیام کرنے والے لوگوں کو حقارت بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔کارمن اوراس کے دوستوں کے دلوں میں انسان دوستی کا جذبہ بے انتہا نظرآتا ہے وہ خلوص وتمانت کے ساتھ مصنفہ کی خاطر کرتی ہیں اوراپنے استعداد کے مطابق خیال بھی رکھتی ہیں۔اس افسانے میں تخلیق کار کی ہمدردی اس طبقے کے ساتھ صاف نظر آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ مصنفہ نے اعلیٰ طبقے کے امیر شہریوں کے گھروں میں عیش وآرام کے ساتھ رہنے کے بجائے وائی۔ڈبلیو۔سی کے سیلن والے کمرے میں کارمن اوراس کے دوستوں کے ساتھ رہنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔وائی۔ڈبلیو۔سی شہر کے امیر طبقے کے لوگوں کے شیانِ شان نہ تھاان کی نظر میں یہ نہایت کم تر حیثیت کا ہاسٹل تھا جہاں رہنے کی اطلاع ملتے

ہی مسز کوسٹیلو افسانہ نگار کو لینے فوراً وہاں چلی آتی ہیں۔اس کے علاوہ ہوزے اور اس کے والد کے طرح شہر کے دوسرے امیر ترین لوگ جو مصنفہ کے جاننے والے تھے ان سبھوں نے پسماندہ ہال ہاسٹل میں رہنے پر تعجب کا اظہار کیا اور اپنے یہاں آنے کی دعوت کی لیکن مصنفہ نے سب کو منع کر دیا۔وہ لکھتی ہیں:

''اس وقت مجھے دفعتاً خیال آیا کہ میں ہر طبقے اور ہر قسم کے لوگوں کو اپنی افتادِ طبع کے ذریعے کم از کم اپنی حد تک ذہنی طور پر ہموار کرتی چلی جاتی ہوں مگر ہوزے اور اس کے والد اس ملک کے دس دولت مند ترین خاندانوں میں شامل تھے اور یہاں کے حکمران طبقے کے اہم ستون تھے اور ان لوگوں کو یہ سمجھنا بالکل بے کار تھا کہ مجھے وائی۔ڈبلیو کیوں اتنا اچھا لگا اور میں وہاں ٹھہرنے پر کیوں اس قدر مصر ہوں۔'' [۳۴]

قرۃ العین حیدر نے کارمن اور وائی۔ڈبلیو۔سی کے دوسری زندگیوں کے حالات اور ان کے مسائل کو دکھانے میں اس طبقے کے متعلق اپنے جذبات واحساسات کا اظہار زیادہ کیا ہے۔کیونکہ یہاں رہ کر مصنفہ نے ان کے حالات اور مسائل کو دیکھا اور خود تجربہ بھی کیا تھا،اس کے بعد جو محسوس ہوئیں انہیں افسانے کے قالب میں موضوع بنا کر پیش کیا۔یہ افسانہ پسماندہ طبقے کے لوگوں کے مسائل اور ان کی صورت حال کا واضح تصویر ہے۔اس میں زندگی کی ماہیئت کو اعلیٰ طبقے کے عیش گاہوں میں دیکھنے کے بجائے پسماندہ طبقے کے لوگوں کی سطحی زندگی اور معاشی بدحالی میں دیکھا ہے اور بڑی ہمدردی کے ساتھ ان کی زندگی کو پیش کیا ہے۔افسانہ کارمن کے طبقاتی زندگی کے متعلق سہیل بیابانی لکھتے ہیں کہ:

''کارمن..... میں قرۃ العین حیدر نے افلاس زدہ پسماندہ لوگوں کی زندگیاں بھی پیش کی ہیں،یہی نہیں بلکہ ''کارمن'' میں واضح انداز میں طبقاتی فرق کو بیان بھی کیا ہے۔اعلیٰ طبقے کے پاس دولت ہی ہر چیز کو ناپنے کا پیمانہ ہے جب کہ غریب طبقے کے پاس زندگی کی اعلیٰ انسانی قدریں ہیں۔محبت ،ایثار ،خلوص اور وفا ان کی پونجی ہے۔یہ تضاد

''کارمن''میں مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔''۳۵؎

روشنی کی رفتار:

''روشنی کی رفتار'' قرۃ العین حیدر کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔اس میں کل اٹھارہ افسانے شامل ہیں جو موضوع اور مسائل کے اعتبار سے اردو کی بہترین تخلیقات میں شمار کیے جاتے ہیں۔اس مجموعے کے بیشتر افسانوں میں ملک اور بیرون ملک کے لوگ دکھائی دیتے ہیں ساتھ ہی ملک کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی پس منظر میں سماج کا نچلا طبقہ کس طرح کی زندگی بسر کر رہا ہے قرۃ العین حیدر کے اس مجموعے میں نظر آتا ہے۔

''روشنی کی رفتار'' میں شامل افسانہ ''حسب نسب'' میں قرۃ العین حیدر نے زمینداری نظام اور اس کی تہذیبی روایت کو پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ شاہ جہاں پور کے اوسط درجے کے زمیندار، جمعہ خان کے خاندان کا بدلتا منظر نامہ اور خاندانی نسب العین پر لکھا گیا کامیاب افسانہ ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار جمعہ خان کی بیٹی چھمی بیگم کا ہے۔افسانے میں زمینداری نظام کے زوال کے بعد چھمی بیگم کی بے راہ روزندگی ساتھ پسماندہ طبقے کے ملازم ملّن خان، دھمّو خان اور کلو بائی طوائف کی زندگی اور حالات بھی نظر آتے ہیں۔افسانے کے ابتداء میں ہی چھمی بیگم اور اجّو میاں دونوں کے والدین انتقال کر جاتے ہیں۔اجّو میاں چند مقدموں کے معاملات سنبھالنے لکھنؤ چلا جاتا ہے جس کے بعد گھر کی پوری ذمہ داری چھمی بیگم کے سر پر آجاتی ہے۔اجّو میاں کے لکھنؤ جانے کے بعد گھر کا مردان خانہ زیادہ تر ویران پڑا رہتا تھا۔ چھمی بیگم کبھی کبھی ملازموں کو لے جا کر مردان خانے کی صفائی کروایا کرتی تھیں۔

> ''جمعے کے جمعے وہ مردانے مکان میں جاتیں۔دھمّوں خاں اور سلامت
> بوا کی لڑکیوں کے ساتھ مل کر باغ کے جھاڑ جھنکاڑ کی صفائی کرواتیں۔
> دالان کے جالے صاف کئے جاتے۔۳۶؎

قرۃ العین حیدر نے زمیندار خاندان کے بکھرتے حالات کے ساتھ چھمی بیگم کے یہاں کام کرنے والے پسماندہ طبقے کے ملازم پیشہ لوگوں کی زندگی اور ان کی طبقاتی حیثیت کو بھی دکھایا ہے۔آزادی کے وقت

زمینداری نظام پر زوال آیا اور زمینداروں کی زمینیں کسٹوڈین میں چلی گئیں، اس کے بعد ان کی آسودہ حال زندگی یکسر بدل گئی، معاشی ضرورت نے انہیں مجبور کر دیا اور زندگی میں متعدد مصائب و آلام نے آگھیرا۔ قرۃالعین حیدر 'حسب نسب' میں مذکورہ پس منظر کو دکھاتے ہوئے زمیندارانہ نظام اور چھمی بیگم کی پوری زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ مصنفہ نے چھمی بیگم کو اس دور کے زمینداری نظام کا نمائندہ بنا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ زمینداری کے خاتمے کے بعد بھی چھمی بیگم اپنے گھر کے ملازموں کی ذمہ داری اٹھاتی ہیں۔

> ''اب چھمی بیگم اپنے زیور بیچ کر گزر بسر کرنے لگیں۔ زیور ختم ہو گئے تو گھر کا قیمتی پرانا سامان کباڑی کے ہاتھ فروخت کر ڈالا لیکن بھوک ایک دائمی مرض ہے جس کا وقتی علاج کافی نہیں اور چھمی بیگم کو دھمّو خان، ملّن خان، سلامت بوا اور کے چینگڑ پوٹوں کا پیٹ بھرنا تھا۔ انہوں نے گھر قرآن شریف اور اردو پڑھانے کے لئے بچیوں کا مکتب کھول لیا۔ محلے والوں کی سلائی کرنے لگیں۔'' ۳۷

مذکور یہ ہے کہ افسانے میں زمیندارانہ نظام کے اس پہلو کو دیکھا جا سکتا ہے جہاں پسماندہ طبقے کے ملازموں کی زندگی کا گزر بسر زمینداروں کی مرہون منت ہے۔ لیکن آزادی کے بعد ہندوستان کی سماجی زندگی میں تبدیلی آئی جس کے بعد ان زمینداروں کی حالت اور زندگی بھی تنزل کا شکار ہوئی۔ معاشرے میں اب ان کی حالت ایک عام آدمی سے بھی دیگر گوں ہو گئی تھی۔

قرۃالعین حیدر اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں زمیندارانہ نظام کے پیش کش میں بہت بڑا فرق دکھائی دیتا ہے۔ ترقی پسند حضرات سرمایہ داروں کو جابر اور ظلم کرنے والا دکھاتے ہیں کہ زمیندار لوگ ہر طرح سے نچلے طبقے کے پسماندہ لوگوں کا استحصال کرتے ہیں جبکہ قرۃالعین حیدر کے اس افسانے میں منظر اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ یہاں پسماندہ طبقے کے لوگوں کا استحصال کے بجائے، چھمی بیگم کڑی محنت اور مزدوری کر کے اپنے ساتھ گھر کے ملازموں کا بھی پیٹ پالتی ہیں۔

افسانے میں قرۃالعین حیدر نے پسماندہ طبقے کی ایک لکھنوی طوائف کلّو جان کو بھی پیش کیا ہے۔ اجّو

میاں جب خاندان کے فوجداری معاملات سنبھالنے لکھنؤ گئے تھے تو اسی زمانے میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی تھی، بعد میں اجّو میاں نے کلّو جان سے شادی کر لی اور گھر لے آئے۔ طوائف طبقے کی کلّو جان کو قرۃ العین حیدر نے عورت کی نفسیاتی پس منظر میں پیش کیا ہے۔ کلّو جان شادی کر کے اجّو میاں کے ساتھ گھر آتی ہے تو اس کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی ہے کہ چھمی بیگم اسے بھابھی سمجھ کر اپنا لیں۔ مصنفہ لکھتی ہیں:

''بیشتر طوائفوں کی طرح جو شادی کر کے بے حد وفا شعار بیویاں ثابت ہوتی ہیں، کلّو بھی بڑی پتی ورتا عورت تھی۔ اس کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ چھمی بیگم اسے کنبے کی بہو اور اپنی بھاوج سمجھ کر املی والے مکان میں داخل کر لیں۔ اس کی تمنا کبھی نہ پوری ہوئی۔'' ۳۸

قرۃ العین حیدر کا افسانہ ''حسب نسب''، جس موضوع پر لکھا گیا ہے اس میں پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کم نظر آتے ہیں باوجود اس کے قرۃ العین حیدر نے اعلیٰ طبقے کی چھمی بیگم اور زمیندارانہ نظام کے زوال کو پیش کرتے ہوئے پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کو بھی پیش کیا ہے۔ دھمّو خان، سلامت بوا اور کلّو جان سماج کے نچلے طبقے کے پسماندہ کردار ہیں جن کے متعلق لکھتے ہوئے قرۃ العین کی واقفیت اس طبقے سے پوری طرح معلوم ہوتی ہے۔ عورت کی نفسیات اور انسانی زندگی کی ضرورت ہر کسی فرد کے یہاں دکھائی دیتی ہے جس کا بیان کرتے وقت وہ کامیاب نظر آتی ہیں۔

''روشنی کی رفتار'' کا اگلا افسانہ ''نظارہ درمیاں ہے'' کے نام سے ہے۔ اس افسانے میں قرۃ العین حیدر نے وقت کی ستم ظریفی اور شہری ماحول میں انسان کی معاشی مجبوری ممبئی اور روز مرہ زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ افسانے میں امیر خاندان کی مفاد پرستی کا اثر خورشید جیسے معاشی مجبور لوگوں پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے مصنفہ نے اس کی حقیقی تصویر کو پیش کیا ہے۔ افسانے کے پسماندہ کرداروں میں تارا بائی اور دستور پیرو جاہ کی متضاد زندگی اور ان کے مسائل تا دیر نظر آتی ہے۔

افسانے کی ابتداء بیگم الماس سعید کے گھر کام کرنے والی ملازمہ تارا بائی سے ہوتی ہے جو گھر کی ہر چیز کو متعجب نظروں سے دیکھتی ہے گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے چہرے پر صرف آنکھیں ہی آنکھیں

ہیں۔تارابائی گورکھپور کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی بال ودھواعورت ہے جس کے سسر اور ماں باپ مر چکے ہیں۔تارابائی کی معاشی حالات اور زندگی کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے اس کے ماما نے بمبئی اپنے پاس بلایا تھا۔ تارابائی بمبئی میں الماس بیگم کے یہاں گھر کی صاف صفائی کا کام کرتی ہے۔مصنفہ نے تارابائی کے ذریعے ممبئی شہر کے امیر گھرانوں میں کام کرنے والی غریب عورتوں کی زندگی کو پیش کیا ہے۔وہ یہ بھی دکھاتی ہیں کہ ایک معاشی طور پر مجبور عورت کس طرح سے امیر گھرانوں کی دولت و ثروت ،عیش وعشرت اور آسائش کی تمام رنگینیاں دیکھ کر متعجب ہوتی ہے اور خواہشات کے سیل رواں میں بہنے کے بجائے اس پہ قابو بھی پاتی ہے۔اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''تارابائی صبح بیڈروم میں چائے لاتی ہے۔بڑی عقیدت سے صاحب کے جوتوں پر پالش اور کپڑوں پر استری کرتی ہے۔ان کے شیو کا پانی لگاتی ہے۔جھاڑ پونچھ کرتے وقت وہ بڑی حیرت سے ان خوبصورت چیزوں پر ہاتھ پھرتی ہے جو صاحب اپنے ساتھ پیرس سے لائے ہیں۔''۳۹؎

چونکہ تارابائی کا یہ تاثر اس احساس کو ابھارتا ہے جو ایک پسماندہ طبقے کے غریب فرد کے دل میں مذکورہ قیمتی چیزوں کو دیکھ کر اٹھتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے اس منظر کو تارابائی کے جذبات سے جوڑ کر پسماندہ طبقے کے لوگوں کی خواہش کو پیش کیا ہے اور ساتھ ہی امیر اور غریب طبقے کے مابین پسماندہ طبقے کے لوگوں کی خواہشات کی ناتکمیلیت کو بھی دکھایا ہے۔

خورشید عالم تعلیم یافتہ نوجوان ہے لیکن معاشی تنگ دستی کے سبب غریب اور پسماندہ ہے۔خورشید عالم کی بے روزگاری کو دیکھتے ہوئے الماس بیگم کے خاندان والوں نے خورشید کو روزگار کا لالچ دے کر الماس بیگم سے شادی کرادی،الماس بیگم خورشید سے عمر میں بڑی ہے۔قرۃ العین حیدر نے اعلیٰ طبقے کے دولت مند لوگوں کی سطحی ذہنیت اور مفاد پرستی پر سخت تنقید کی ہے کہ کیسے مفاد پرست لوگ اپنے مفاد کے لیے خورشید عالم جیسے شریف اور ضرورت مندوں کو لالچ دے کر خواہشات کے آگے زیر کرتے ہیں۔خورشید عالم کی بے روزگاری

اورغریبی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی شادی ادھیڑ عمر کی عورت الماس بیگم سے کر دی جاتی ہے جس کے بعد خورشید کی زندگی الماس بیگم کی جاگیر بن جاتی ہے۔الماس بیگم اپنے مزاج کے مطابق خورشید عالم کی روزمرہ زندگی کے اوقات کا فیصلہ کرتی ہے کیونکہ خورشید عالم کی یہ نئی زندگی الماس بیگم کی مرہون منت ہے۔اس سے متعلق افسانے کا اقتباس ملاحظہ کریں:

''خورشید عالم بیوی کے بے حد احسان مند ہیں کیوں کہ اس کی شادی سے ان کی زندگی بدل گئی۔اور احسان مندی ایسی شے ہے کہ ایک سنگیت کار اپنی سنگیت کی قربانی بھی دے سکتا ہے۔خورشید عالم شہر کی ایک خستہ عمارت میں پڑے تھے، اور بسوں پر مارے مارے پھرتے تھے، اب لکھ پتی کی حیثیت سے کمبالا ہل پر فروکش ہیں۔مرد کے لئے اس کا اقتصادی تحفظ غالباً سب سے بڑی چیز ہے۔''[۴۹]

خورشید عالم ،معاشی تنگی اور بے روزگاری کے سبب حالات سے سمجھوتا کر لیتا ہے جو اس کی مجبوری ہے۔مصنفہ نے اس لاچار انسان کے احساس کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ برسوں محنت کے بعد اپنے شوق کی پرورش کرتا ہے اور محنت ولگن کے بعد وائلن بجانے کا ہنر حاصل کرتا ہے لیکن شادی کے بعد اس کے شوق کو اس سے چھین لیا جاتا ہے اور اس کی آزاد زندگی پر پابندی بھی لگا دی جاتی ہے۔خورشید عالم کی آزادی چھین لینا یہ اعلیٰ طبقے کا پسماندہ طبقے کے اوپر جبر واستحصال ہے۔مصنفہ نے سماج کے طبقاتی تفریق اور جبر واستحصال کے سماجی المیے کو پیش کرتے ہوئے اس کیفیت کو گھر میں کام کرنے والی تارا بائی کی زبانی بیان کیا ہے جو انسانی زندگی کی اہمیت، اس کے احساس اور زندگی کی قیمت کو مختلف زاویے سے دیکھتی ہے۔جس کا احساس مصنفہ نے قاری کے دل میں بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ کامیاب بھی ہوئی ہیں۔

اس افسانے کا ایک اہم کردار پیر جاہ دستور کا ہے۔پیروجاہ دستور ایک پارسی نژاد لڑکی ہے جس کے ماں باپ انتقال کر چکے ہیں، بھائی بہن کوئی بھی نہیں ہے۔وہ اپنے چچا اور چچی کے ساتھ مفلوک الحال پارسیوں کے محلے میں رہتی ہے۔چچا سنٹرل بینک میں معمولی ملازم تھے۔پیروجاہ دستور اور خورشید عالم دونوں ایک

دوسرے سے عشق کرتے تھے اور ان دونوں نے ایک ساتھ رہنے کا عہد و پیاں بھی باندھا تھا۔لیکن محرومیِ قسمت خورشید عالم کی شادی الماس بیگم سے ہو جاتی ہے جس کی خبر سن کر پیرو جاہ کو بہت بڑا صدمہ پہنچتا ہے۔ صدمے کی تاب نہ لا کر وہ دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے الماس بیگم اور پیرو جاہ کے ذریعے عورت کی نفسیاتی کیفیت کو دکھایا ہے جس میں حاصل اور لا حاصل کے زیر اثر وجود میں آنے والے حالات کو گرفت میں لیا ہے۔الماس بیگم اپنے وولت وثروت کی وجہ سے خورشید عالم کو حاصل کر لیتی ہے لیکن پسماندہ طبقے کی غریب پارسی لڑکی پیرو جاہ دستور اپنی محرومیِ قسمت کے سبب بسترِ مرگ پر لیٹی آخری بار خورشید عالم سے ملنا چاہتی ہے لیکن الماس بیگم اس کی اجازت نہیں دیتی۔ذیل کے اقتباس میں اس درد بھرے منظر کو ملاحظہ کریں۔

''کیا مسٹر عالم وہاں موجود ہیں؟''

''آپ بتایئے آپ کو مسٹر عالم سے کیا کام ہے؟''الماس نے درشتی سے پوچھا۔

''مس پیرو جاہ دستور ایک مہینے سے یہاں سخت بیمار پڑی ہیں۔آج ان کی حالت زیادہ نازک ہوگئی ہے۔انہوں نے کہلوایا ہے کہ چند منٹ کے لئے عالم یہاں آسکیں''

مسٹر عالم یہاں نہیں ہیں۔''

''آر یو شیور؟''

''یس آئی ایم ویری شیور۔''الماس نے گرج کر جواب دیا۔''[۱۴]

مذکورہ اقتباس میں قرۃ العین حیدر نے عورت کی متضاد ذہنی فکر کو نمایاں کیا ہے۔عورت کا نفسیاتی عمل یہ ہے کہ وہ جانتے ہوئے اپنے شوہر کو کسی دوسری عورت کے قریب جانے نہیں دے سکتی خواہ وہ کسی ضرورت کے تحت ہی کیوں نہ ہو۔پیرو جاہ،خورشید عالم سے دور ہونے کے بعد ایک لاعلاج بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔وہ زندگی کے آخری وقت میں خورشید عالم سے ملنا چاہتی تھی۔جب اس نے مقامی ہسپتال سے الماس بیگم کے گھر

خورشید عالم کے لیےفون کروایا تھا تو الماس بیگم نے بڑی سختی سے منع کر دیا کہ وہ یہاں نہیں ہیں کیونکہ وہ پیر جاہ سے خورشید عالم کو دور رکھنا چاہتی تھی۔لیکن افسانے کے اختتام میں تخلیق کار نے جوانکشاف کیا ہے وہ الماس اورخورشید عالم دونوں کے لیے دل دہلا دینے والا منظر ہے۔ وہ لڑکی جس کا وجود ختم ہو چکا تھا وہ تارا بائی کی شکل میں ان کے سامنے کھڑی تھی اور الماس بیگم کو چیلنج کر رہی تھی۔ پیرو جاہ،خورشید عالم کے سامنے سوال کرتی آنکھیں چھوڑ جاتی ہے۔ یہ نا کام عشق جوغریب پسماندہ طبقے کی پیرو جاہ کے دل کی تڑپ بن جاتی ہے وہ دائمی طور پر اعلیٰ طبقے کی مفاد پرستی کوشرمندہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

کا گا سب تن کھائیوں چُن چُن کھائیوں ماس
دوئی نینا جن کھائیوں پیا ملن کی آس

''نظارہ درمیاں ہے'' کردار نگاری کے حوالے یادرہ جانے والا افسانہ ہے۔افسانے میں اعلیٰ طبقے کی مفاد پرستی کے ساتھ پسماندہ طبقے کے غریب اور مفلس لوگوں کی زندگی زیادہ ابھر کر آتی ہے۔قرۃ العین حیدر حالات اور وقت کے کھیل میں پسماندہ طبقے کی زندگی کے ساتھ ہمدرد نظر آتی ہیں۔انہوں نے سماج کے تفریقی نظام پر ہمیشہ سے سوال کیا ہے یہ افسانہ بھی اس کی عمدہ مثال ہے۔

روشنی کی رفتار کا اگلا افسانہ ''فقیروں کی پہاڑی'' ہے۔ مذکورہ افسانے کا پورا پس منظر پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی اوران کے مسائل پر محیط ہے۔اس افسانے میں ایک بے روزگار نوجوان کی زندگی اوراس کے تبدیلیِ حال کو بیان کیا گیا ہے۔قرۃ العین حیدر نے اس نوجوان لڑکے کے ذریعے پہاڑ پر واقع ایک ایسی بستی کا احوال پیش کیا ہے جہاں بھیک مانگنے والے پسماندہ طبقے کے فقیر رہتے ہیں۔ مصنفہ نے ان کی زندگی اوران کے مسائل کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔افسانہ 'فقیروں کی پہاڑی' میں پہاڑ پر بھکاریوں کی بستی کے علاوہ مقدس گاہ بھی مقیم ہے،اس مقدس گاہ کی زیارت کے لیے چاروں طرف زائرین کی بڑی بھیڑ نظر آتی ہے۔مقدس گاہ کی طرف بڑھتے ہوئے عوام کے بیچ بستی کے بھکاریوں کا ہجوم بھی نظر آتا ہے جومختلف انداز میں ہر آنے جانے والوں سے بھیک مانگتے ہیں۔قرۃ العین حیدر نے انہی بھکاریوں کی زندگی کو افسانے میں پیش کیا ہےاور ساتھ ہی ان کے مکر وفریب کو بھی دکھایا ہے۔اقتباس ملاحظہ کریں:

''پہاڑی پر ہر وضع کا اپاہج موجود تھا۔ اندھے، لنگڑے، لولے، لنجے اور ایسے بھکاری اور بھکارنیں جن کے محض دھڑ ہی سالم تھے۔ چٹانوں پر آڑے ترچھے لیٹے صدائیں لگا رہے تھے۔ لمبے چوغے والے آنکھوں میں سرمہ لگائے، ہزار دانہ تسبیح پھراتے، قلندر، مجذوب، بھنگ کے نشے میں مگن سادھو۔......فقیروں کی یہ عظیم الشان ''کامن ویلتھ'' یقیناً لرزہ خیز اور حیرت انگیز تھی۔''۴۲؎

فقیروں کی یہ پوری جماعت پہاڑی پر عجیب وغریب انداز میں لوگوں سے بھیک مانگتے ہوئے نظر آتی ہے، کوئی زمین پر لیٹا پہاڑ پر چڑھنے والوں کی مرادیں پوری ہونے کی دعا کرتا ہے اور بابا کے نام پر اپنی مدد چاہتا ہے، کوئی مشکلیں آسان ہونے کی دعا دے کر اپنی خواہش کا اظہار کرتا نظر آتا ہے اور زائرین ان کی مدد کرتے اوپر نیچے کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے سماج کے نچلے طبقے کے پسماندہ بھکاریوں کی زندگی اور ان کی غربت زدہ مسائل کو بڑی ہمدردانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی طرزِ زندگی اور ان کے اَشکال کی جزئیات نگاری کے ساتھ ان کے حرکات وسکنات کا ایسا منظر پیش کیا ہے جس سے بھکاریوں کی تمام خصلتیں واضح نظر آتی ہے۔

''وہ ایک بے حد لمبا فقیر تھا، جو شاید اپنی پلکیں بھی نہیں جھپکاتا تھا۔ اور ایسا لگ رہا تھا گویا کسی قدیم مصری ممی کو سیدھا کھڑا کر کے اس میں کُوک بھر دی گئی ہو اور وہ ممی بے تکان رکے رٹے جا رہی ہو: ''بڑے بڑے سیٹھ آئے ہو.... بڑے بڑے....'' اس نے گیروا چوغہ پہن رکھا تھا اور ایک اونچی خطرناک اور تنہا چٹان پر ڈنڈا سنبھالے اس طرح کھڑا تھا جیسے زائرین کے مقدر میں جو کچھ لکھا ہے اس کا پیغامبر ہو۔''۴۳؎

قرۃ العین حیدر نے بھیک مانگنے والوں کی حالاتِ زندگی اور ان کے مسائل کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ان فقیروں کی پوری ٹولی اپنے تمام اعمال وافعال کے ساتھ نظر آتی ہے۔ لیکن افسانہ مزید آگے بڑھنے کے

بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ قرۃالعین حیدر نے ان فقیروں کی ظاہری زندگی کی تصویر کے ساتھ ان کی روزمرہ کی حقیقی زندگی کو بھی پیش کیا ہے۔یعنی نوجوان لڑکا بھکاریوں کی بستی کا معائنہ کرتے ہوئے صبح کے وقت ایک ایسی جگہ پر پہنچتا ہے جہاں پر کچھ لوگ نظر آتے ہیں یہ وہی لوگ تھے جو کل راستے میں بھیک مانگ رہے تھے، کسی کے پاؤں کٹے تھے کوئی زخم خوردہ درد سے چلارہا تھا، کوئی گندے میلے کپڑے میں پاگلوں جیسا بیٹھا تھا لیکن یہاں تو سب کے حالات بدلے ہوئے تھے۔حقیقتِ حال کی وضاحت کے لیے افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''جھونپڑی میں ابھی صبح ہوئی تھی خاتون خانہ چائے کے برتن دھورہی تھیں۔اس کام سے فارغ ہوکر انھوں نے ایک ٹرنک میں سے ایک چیتھڑا ساڑی نکالی۔اپنی ثابت ساری اتارکر گوڈر زیب تن کیا اور ایک رکابی میں سے بکری کا خون انگلیوں پر لے چہرے اور بانہوں پر زخموں کے نشان بنائے۔اس دوران میں صاحبِ خانہ اپنے پیروں پر گندی پٹیاں باندھ چکے تھے پھر شہتیر میں سے بیساکھی اتارکر انھوں نے اپنے نونہالوں کو آواز دی:''منگو.....چھٹکو......شبراتی.....۔''[۴۹]

دراصل مذکورہ افسانے میں افسانہ نگار نے بھکاریوں کی زندگی اور ان کے پیشہ ورانہ عمل دونوں کو پیش کیا ہے۔دنیا میں یہ عام خیال ہے کہ ایک کمزور اور مفلس انسان جو ہر طرح سے لاچار اور مجبور ہے وہ بھیک مانگ کر اپنی زندگی کا گزارا کرتا ہے لیکن موجودہ دور میں بھیک مانگنا ایک پیشہ بن گیا ہے۔افسانہ نگار نے اسی حقیقت کو پیش کیا ہے کہ انسان بحالتِ مجبوری سارے مکاری اور عیاری والے کام انجام دینے کو تیار ہے۔افسانے کا وہ نوجوان لڑکا جو پڑھا لکھا ہونے کے باوجود بھی روزگار سے محروم ہے وہ تین سال تک روزگار تلاش کرنے کے بعد بالآخر بھیک مانگنے کا پیشہ اختیار کر لیتا ہے۔نوجوان کا خط ملاحظہ کریں جو وہ اپنی والدہ کو لکھتا ہے:

> ''مجھے اطلاع ملی تھی کہ یہاں ایک ریستوراں میں کیشیر کی جگہ خالی ہے،

لیکن صبح جب میں یہاں پہونچا تو معلوم ہوا وہ جگہ بھر چکی ہے۔ بحر حال
آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اس شہر میں تین سال بے کار رہنے اور
دھکے کھانے کے بعد آج بالآخر ایک نہایت اچھا کاروبار میری سمجھ میں
آ گیا ہے۔ بہت آرام دہ کام ہے، اور آمدنی بھی امید ہے معقول ہوگی
۔قیام وطعام کا انتظام مناسب اور فضا بارونق ہے۔ میرے رفیقِ کار ہنر
مند، اہلِ فن بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ سچے فن کار ہیں۔'' ۴۵

مذکورہ افسانے میں قرۃ العین حیدر نے پسماندہ طبقے کے فقیروں کے جن حالات کو پیش کیا ہے اس کا احساس قاری کو بخوبی ہوتا ہے۔ نوجوان لڑکا جو اپنی بے روزگاری سے تنگ آ کر بھیک مانگنے کا پیشہ اختیار کر لیتا ہے یہ اس دور کے ملازمتی فقدان اور حکومتی نظام کا المیہ ہے۔ بھکاریوں کی زندگی اور ان کے مسائل کے ساتھ ان کے مفاد پرستی کو بھی ابھارا ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ اس پیشے کی حقیقت کو ابھارا ہے جو پہاڑی کے بھکاری اپنی اصل حقیقت کو چھپاتے ہیں اور محروم القسمت نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔قرۃ العین حیدر نے افسانے کا مکالمہ کرداروں کے حسب حال کو بڑی فنکاری سے پیش کیا ہے۔ فقیروں کی عملی زندگی کی جزئیات نگاری کو اتنی دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ افسانے کے صفحات پر یہ سارے منظر جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔

''اکثر اس طرح سے بھی رقصِ فغاں ہوتا ہے'' قرۃ العین حیدر کا یہ افسانہ محرومیِ قسمت اور حالات کی تبدیلی پر مبنی ہے۔افسانے کی ابتدا ایک رومان فضا سے ہوتی ہے، جمال آرا بہترین آواز کی مغنیہ ہے۔اس کے والد سرکاری محکمے کے عدلیہ حکومت میں پیش کار تھے۔ فالج کی بیماری کے بعد اب وہ مستقل طور پر کھاٹ پر پڑے رہتے تھے۔ والد کی بیماری کے بعد گھر کا معاشی ذریعہ منقطع ہو چکا تھا، تنگی گھر میں سایہ فگن تھی۔ اس تنگ دستی میں زندگی بڑی مشکل سے گزر رہی تھی۔

مذکورہ افسانے کا مرکزی کردار جہاں آرا، ایک چھوٹے قد کی لڑکی ہے۔ جہاں آرا کو تین سال کی عمر میں بخار کی بیماری نے اس کے قد کو بڑھنے نہیں دیا۔لہٰذا وہ اب مستقل طور پر گھر میں ہی رہتی تھی لیکن والد کو فالج لگنے کے بعد پیٹ کی آگ نے مجبور کرنا شروع کیا۔ وہ گھر کا قیمتی سامان بیچ کر گزارا کرتی تھی باوجود اس کے

زندگی کی مسافت طویل تھی مال و دولت اور گھر کے اسباب ختم ہونے کے بعد آگے کی زندگی کے لیے جب جمال آرا بڑھتی ہے تو وہ بندو خان کے ساتھ بمبئ میں بھیک مانگتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس وقت کے حالات کا جو منظر نامہ قرۃ العین حیدر نے پیش کیا ہے وہ قاری کے اندر کردار کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ہمدردی پیدا کر دیتا ہے۔

نجن میاں شادی کے بعد بیوی کے ساتھ مستقل طور پر بمبئ میں رہنے لگے تھے۔ نجن میاں ایک وقت میں جمال آرا کی آواز کے دیوانے تھے اور وقت کی مسافت کے ساتھ اس آواز کو بھول چکے ہیں۔ لیکن زندگی اور وقت کا کھیل دیکھئے جمال آرا کی وہ آواز جسے برسوں پہلے نجن میاں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ مدتوں بعد آج پھر اس کی گونج ان کے گھر میں سنائی دے رہی تھی۔ نجن میاں کی بیوی اور محلے کی دوسری عورتوں کے ساتھ جمال آرا کی زندگی کا تبصرہ چل رہا ہے۔ اس کے حال پر ان عورتوں کی ہنسی اور افسوس کی آواز نجن میاں کے کانوں تک جاتی ہے لیکن آواز کی سحر نے نجن میاں کو ساکت کر دیا تھا وہ بیڈ پر بے جان سے پڑے تھے۔ جمال آرا کی زندگی اور اس کے مایوس جذبات کا وہ منظر ملاحظہ کریں جس وقت نجن میاں کی بیوی نے جمال آرا سے اس کے متعلق پوچھا تھا:

> ''.....کیا نام ہے تمہارا؟'' رقیہ نے پوچھا۔
>
> '' آنکھوں کے اندھے ، نام نین سکھ۔ میرا نام جمال آرا ہے بیگم صاحب''۔
>
> ''بڑا جگرا ہے تمھاری بیوی۔ گلی گلی گھوم کر دنیا بھر کی باتیں سنو ہو۔ مذاق اُڑواؤ ہو اپنا۔''
>
> جب قدرت نے میرے ساتھ اتنا بڑا مذاق کیا ہے بیگم، تو میں دنیا والوں کے مذاق اڑانے کی کیا پرواہ کروں؟ اور گلی گلی نہ گھوموں تو کھاؤں کیا اپنا سر؟ ذرا یہ تو بتاؤ؟'' عورت نے چمک کر جواب دیا۔''[۴۶]

جمال آرا کے علاوہ اس افسانے کا پسماندہ کردار بہشتی بندو خان کا ہے۔ بندو خان، جمال آرا کے گھر کا

ملازم ہے۔ بندوخان کے اندر اپنائیت ،انسان دوستی اور امانت داری کا جذبہ موجود ہے۔اس نمک خوار نے پوری زندگی جمال آرا کا ساتھ دے کر نمک کا حق ادا کیا۔ بندوخان سقہ ذات کا نہایت غریب اور پسماندہ کردار ہے جس کے احساس اور وفاداری کو قرۃ العین حیدر نے انسانیت کا بہترین مثال بنا کر پیش کیا ہے۔ جمال آرا کے والدین کے انتقال کے بعد بندوخان ہی وہ واحد شخص تھا جو جمال آرا کے ساتھ کھڑا ہے۔لیکن وقت کی کروٹ اور تنگ دامنی نے اتنا مجبور کر دیا کہ دونوں کو اپنا وطن چھوڑ کر بمبئ جانا پڑا تھا۔اس سلسلے سے متعلق ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''بُندوخان اب یہاں سے کوچ کرو۔ میں نے بیگم صاحب بیٹیا کو کندھے پر بٹھالا اور بھیک مانگنے نکل پڑے دونوں جنے۔مگر جس شہر میں باپ منصرم تھے اس میں بٹیا کو بھیک مانگتے لاج آتی تھی۔ہم لوگ لکھنوَ چلے آئے۔ وہاں کئی برس بھیک مانگی۔ پھر کسی نے بتایا کہ بمبئ بڑے دھنوانوں کا شہر ہے۔ وہاں چلے جاؤ، تو ٹکٹ کٹا کر یہاں چلے آئے ۔ورلی پر جھگی ڈال لی ، وہاں سے میونسپلٹی والوں نے اٹھا دیا تو اِدھر اُدھر فٹ پاتھوں پر سونے لگے ۔ دن میں دو ڈھائی روپیہ کی آمدنی ہو جاتی ہے۔کبھی زیادہ کبھی کم۔'' [۲۷]

مذکورہ اقتباس میں قرۃ العین حیدر نے ایک مجبور انسان کی زندگی اور اس کے احساس کو پیش کیا ہے جو پیٹ کی آگ کی خاطر بھیک مانگنے پر بھی مجبور ہوتا ہے۔ بندوخان، جمال آرا کے ساتھ اس کی زندگی میں باپ کی حیثیت سے دکھائی دیتا ہے لیکن اصل میں بندوخان اس گھر کا ایک ملازم ہے اور وہ آج بھی اپنے حقوق کی پاسداری کرتا ہوا نظر آتا ہے۔وہ اپنا فرائض منصبی سمجھ کر سب کچھ ختم ہونے کے بعد بھی جمال آرا کا ساتھ اس لیے دیتا ہے کہ وہ اس گھر کا نمک خوار ملازم ہے۔

قرۃ العین حیدر کا مذکورہ بالا افسانہ 'فقیروں کی پہاڑی' کے موضوع سے الگ اہمیت رکھتا ہے چونکہ مصنفہ کے دونوں افسانے میں بھک مانگتے ہوئے کردار نظر آتے ہیں لیکن 'فقیروں کی پہاڑی' میں بھکاریوں

کی ایک لمبی لائن ہے جو بھیک مانگنے کو اپنا کام سمجھتے ہیں اور ہر روز صبح سے شام تک اس کام کو انجام دیتے ہیں۔جبکہ افسانہ' اکثر اس طرح سے بھی رقصِ فغاں ہوتا ہے' میں بھیک مانگنے والا کردار اپنی مجبوری کے تحت جگہ جگہ لوگوں کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے اور بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔دونوں افسانوں کے موضوع کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ قرۃ العین حیدر نے بھیک مانگنے والے پسماندہ زندگی کو پیش کیا ہے لیکن دونوں کی زندگی کی ضرورت بالکل مختلف ہے۔قرۃ العین حیدر نے مذکورہ دونوں افسانوں میں غریب پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل کو کامیابی کے ساتھ دکھایا ہے۔افسانوں میں پسماندہ طبقے کی زندگی کو عارضی اور سطحی طور پر بیان نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کی زندگی کی حقیقی جزئیات اور سچائی تک پہنچ کر ان کے اصل مسائل کے نقوش کو بھی ابھارا ہے۔

افسانہ''جن بولو تارا تارا'' منفرد موضوع پر لکھا گیا قرۃ العین حیدر کا بہترین افسانہ ہے۔اس افسانے میں نواب اور امیر خاندان کے منچلے لڑکوں کی عیش پرستی کو پیش کیا گیا ہے۔اعلیٰ طبقے کا کوئی نواب زادہ اپنی عیاشی کے سبب کسی مجبور غریب پسماندہ طبقے کی لڑکی یا پھر کسی نچلے ذات کی لڑکی سے نکاح کرتا ہے تو اس لڑکی کو خاندان میں برابری کا حصہ نہیں ملتا۔ بلکہ اس زنان بطن سے پیدا ہونے والے بچے''چھوٹی لائن'' کے بچے کہلاتے ہیں اور انہیں بھی ماں کی طرح باپ کے خاندانی حصے سے کچھ بھی نہیں ملتا۔چھوٹی لائن کے بچے اپنی پوری زندگی حاشیہ پر گزارتے ہیں اور سماج کے مختلف مسائل سے دوچار بھی ہوتے ہیں۔قرۃ العین حیدر نے اسی طبقاتی نظام اور سماجی المیے کو افسانے میں پیش کیا ہے۔اس تعلق سے افسانے کا اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''اتر پردیش کے قصباتی فیوڈل کنبوں میں اگر کوئی منچلے رئیس زادے کسی مغنیہ، ڈومنی، گھریلو ملازمہ، قحط زدہ کسان لڑکی یا کسی ''نیچ ذات'' عورت سے نکاح کر لیتے تھے یا اسے 'گھر ڈال' لیتے تھے تو اس کی اولاد ''چھوٹی لائن'' کہلاتی تھی اور کبھی اپنے باپ کے خاندان سے ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکتی تھی۔''[۴۸]

افسانے کا مرکزی کردار 'دلارے'، پسماندہ طبقے کی میراثین کا لڑکا ہے۔دلارے چا کو دو چیزوں کا

بہت شوق تھا ایک شکار کھیلنا اور دوسرا سنیما کا۔ سنیما کی ساری چھوٹی بڑی خبریں انہیں معلوم ہوتی تھیں۔ دلارے چا، چھوٹی لائن کے ہونے کے بعد بھی اپنے والد کے سارے زمین وزر کے مالک تھے کیونکہ دلارے چا کی ماں والد کی واحد منکوحہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ والد کے انتقال کے بعد ان کو خاندان کی ساری دولت نصیب ہوگئی تھی۔ باوجود اس کے دلارے چا نجیب الطرفین تھے اور وہ کسی اعلیٰ طبقے کی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے لاہور کی ایک مشہور اور بے حد حسین اداکارہ سے شادی کی اور اسے اپنے گھر لے آئے تو خاندان کے لوگوں نے اس شادی کو قبول نہیں کیا۔ مصنفہ نے لکھا ہے کہ:

> ''دلارے چا''بڑی لائن'' کے چشم و چراغ ہوتے تو ایک ایکٹرس سے شادی کرنے کی ہمت نہ کر سکتے۔ بے چارے پہلے ہی سے راندہ درگاہ تھے۔ محض اس وجہ سے کہ ان کی ماں میراثن تھیں ان کو''ٹاٹ باہر'' سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے خاموشی سے اسی اداکارہ سے عقد کر لیا اور برقع اڑھا کر اسے وطن لے آئے۔''[۴۹]

دلارے چا، کے مذکورہ عمل پر اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا جو ردِ عمل دکھائی دیتا ہے وہ سماجی نظام کا بالکل کھوکھلا پن رویہ ہے۔ کیونکہ یہ وہی اعلیٰ طبقہ ہے جس کے خاندان کا کوئی فرد کسی پسماندہ طبقے کی مظلوم عورت سے اپنی ذہنی اور جسمانی عیاشی کے لیے شادی کرتا ہے تو اسے سماجی عمل کا حصہ سمجھا جاتا ہے اور اس کے اس عمل پر یہ معاشرہ اعتراض بھی نہیں کرتا اور نا ہی اس سے خاندان کی عزت پر کوئی آنچ آتی ہے۔ لیکن وہی کام میراثین کا لڑکا دلارے چا (جو اب اعلیٰ خاندان کا حصہ بن چکا ہے) نے کیا تو اس سے خاندان کی عزت پامال ہوتی نظر آتی ہے۔ مصنفہ نے سماج کے اسی ذو طبقاتی نظام پر تنقید کی ہے۔

قرۃ العین حیدر کا یہ افسانہ سماج کے مذکورہ نظام کی تفریق اور سماجی اصول کو چیلنج کرتا ہے یعنی دلارے چا چھوٹی لائن کے ہیں لیکن والد کا سارا اثاثہ ان کے پاس ہے، لیکن دولت کی فراوانی طبقاتی سطح کو بدل نہیں سکتی وہ اب بھی نچلے طبقے کے ہی فرد تھے۔ قرۃ العین حیدر نے سماج کے نظامِ تفریق کو پیش کرتے ہوئے انسانیت کے زوال کو بھی دکھایا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے سماجی اصول کے پیش نظر انسان کی بے بسی، انسانیت کی پامالی

اور ذات پات کی صنعتی روا روی کے ذریعے سماج میں نچلے طبقے کے پسماندہ لوگوں کی زندگی پر ہونے والے استحصال کو بھی پیش کیا ہے۔ مصنفہ کا یہ افسانہ پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی کا صرف منظری بیانیہ نہیں ہے بلکہ ان کی زندگی کے احساسات اور جذبات کی عکاسی بھی بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ دلارے چا کی بیوی کی موت کے وقت قرۃ العین حیدر نے جس احساس کو پیش کیا ہے وہ ملاحظہ کریں:

> ''ان کی بیوی ان کی خدمت گذاری، نماز روزے اور خانہ داری میں مصروف سات پردوں میں مستور رہیں اور صرف دو سال بعد بعارضۂ یرقان راہی ملک عدم ہوئیں۔ سنا ہے مرتے وقت بہت خوش اور احسان مند تھیں کہ ایک باعزت گرہستن کی حیثیت سے دنیا سے جا رہی تھیں۔'' ۵۰؎

دنیا کا ہر انسان سماج میں اپنی عزت چاہتا ہے اور اپنی عزت کی خاطر مختلف طرح کے سماجی اصول کا پابند بھی ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے سماج کے پسماندہ طبقے کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ ابتداء میں فلمی دنیا اور پیشے سے منسلک لوگوں کی سماج میں کوئی عزت نہیں ہوتی تھی اور اس پیشے سے تعلق رکھنے والے لوگ سماج کے نچلے طبقے سے آتے تھے۔ لیکن عزت کی زندگی کون نہیں چاہتا، دلارے چا نے نچلے طبقے کی ایک فلم ایکٹریس سے شادی کر کے اسے عزت کی زندگی دی تھی جس کی وہ تا عمر احسان مند تھی۔ بیوی مرتے وقت بہت مشکور تھیں کہ انہیں آخری وقت میں عزت کی زندگی نصیب ہوگئی تھی۔

افسانے کا اصل موضوع سماج کے وہ لوگ ہیں جو مختلف سطح پر اپنی طبقاتی زندگی گزار رہے ہیں۔ چھوٹی لائن اور بڑی لائن کا طبقۂ تفریق، اور اس تفریق پر مصنفہ کا اعتراض سماج کے اصول پسند لوگوں سے ہے۔ فلمی دنیا اور اس سے منسلک لوگوں کی زندگی اور سماج میں ان کے پسماندہ حالات اصل افسانے کا موضوع ہے۔ اس افسانے میں سماج کے پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی پر خاص توجہ دی گئی ہے اس لیے ان کے جذبات، نفسیات اور احساسات کی عکاسی زیادہ نظر آتی ہیں۔ پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی کا مصنفہ نے بڑی باریک بینی سے ایک ایک جزئیات کو بیان کیا ہے، خاص کر فلمی دنیا میں کام کرنے والے افراد کے مسائل زیادہ

ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

'روشنی کی رفتار' کا آخری افسانہ ''کہرے کے پیچھے'' ہے۔ یہ افسانہ مسوری میں آباد انگلو انڈین لوگوں کی زندگی پر محیط ہے۔ مس سیلیا رچمنڈ کا 'رچمنڈ گیسٹ ہاؤس' اور ان کے یہاں کام کرنے والے نچلے طبقے کے جمعدار کے مسائلِ زندگی افسانے کا اہم پہلو ہے۔ قرۃ العین حیدر نے مسوری میں رچمنڈ ہاؤس کی انگریز مالکن مس سیلیا رچمنڈ اور ان کے یہاں ملازمت کرنے والے فضل مسیح اور مارتھا عرف کٹو آپا کے زندگی کے نشیب وفراز وقت کے بدلتے تناظر میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

'کہرے کے پیچھے' میں پسماندہ طبقے کے نچلی ذات والوں کی زندگی کے مسائل، سماجی اصول کی پابند، مجبور اور مظلوم سی زندگی کو مصنفہ نے بہترین اسلوب اور پیرائے میں پیش کی ہے۔ فضل مسیح اور اس کی بہن کٹو آپا 'مس سیلیا رچمنڈ' کے خاندانی ملازم ہیں اور ان دونوں کی پسماندہ زندگی مس سیلیا رچمنڈ کی مرہونِ منت ہے۔

فضل مسیح اور کٹو آپا، گورکھپور کے رہنے والے نچلے طبقے کے جمعدار (بھنگی) ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والدین بھی مس سیلیا رچمنڈ کے گھر کے خانہ زاد ملازم تھے۔ قرۃ العین حیدر نے مذکورہ طبقے کی جس پسماندگی کو پیش کیا ہے وہ طبقہ اپنے کام اور ذات کو اپنی قسمت کا حصہ سمجھتا ہے اور یہ لوگ اپنی زندگی سماج کے بنائے اصولی نظام کے تحت گزارتے نظر آتے ہیں۔ مصنفہ نے جمعدار طبقے کے ان کرداروں کی زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے جس میں ان کے جذبات اور احساس کا عمل دخل ان کے مالک کے حقوق کا محتاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کٹو کے بطن سے ایک بیٹی آرتھر بولٹن کی ہم شکل پیدا ہوئی تو مس رچمنڈ نے اسے اپنی ویران زندگی کا سہارا سمجھا اور بچی پر ماں کے بجائے مس رچمنڈ نے زیادہ حق سے کام لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب کٹو کی بیٹی کیتھرین بولٹن عرف کیٹی جوان ہونے لگی تو اسکول اور سماج میں اس کی خوبصورتی کے چرچے ہونے لگے۔ مس رچمنڈ کو اس کے مستقبل کی پرواہ ہونے لگی جس کے خاطر انہوں نے کیتھرین کے ساتھ آسٹریلیا جانے کا فیصلہ کیا۔ اس پس منظر میں مجبور ماں کی لاچاری اور سماج کے طبقاتی وتفریقی نظام کو مصنفہ نے بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سماج کے اصولی نظام میں ماں کی ممتا اور اس کی لاچاری دونوں

تقاضائے وقت کی محتاج نظر آتی ہے۔ذیل میں اقتباس ملاحظہ کریں:

''مس سیلیا رچمنڈ نے گمبھیر آواز میں کہا۔''کٹو ہم آسٹریلیا جا رہا ہے۔
کیٹی بابا ہمارے ساتھ جائے گا۔ ہمارا پیکنگ شروع کردو۔''
کٹّو اور فضل مسیح بھوچکّے رہ گئے۔اچانک یہ دونوں گوری عورتیں ان کو
اجنبی دیونیاں سی نظر آئیں۔وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔چند لمحوں
بعد کٹّو نے ناک سڑکتے ہوئے مضبوطی سے جواب دیا۔میم صاحب کیٹی
ہمارا پیٹ کا اولاد ہے۔ہم اسے نہیں جانے دے گا۔ہمارا بھائی بھی اس
کی صورت دیکھ کر جیتا ہے مس صاحب۔ہم نے اس کے مارے شادی
نہیں کیا سوتیلا باپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔''
''خاموش...'' بڑھیا نے چلا کر کہا۔''تم اپنا اوکات بھول رہا ہے کٹّو۔
تمھارے پاس کیا ثبوت ہے کہ کیٹی تمہارا اولاد ہے۔تمھارا یہ مجال کہ تم
اتنا بڑا بات بولو...؟''۵۱

مذکورہ اقتباس کے حوالے سے واضح ہے کہ کٹو کی بیٹی اس کے بطن سے پیدا ضرور ہوتی ہے لیکن اس کی پرورش مس سیلیا رچمنڈ کرتی ہیں۔لیکن اولاد کی محبت جو ایک ماں کے دل میں ہوتی ہے اسے مذکورہ اقتباس میں مصنفہ نے کٹّو کے احتجاجی عمل کے ذریعے پیش کی ہے۔لیکن قرۃ العین حیدر نے احتجاج کی اس آگ کو مجبوری اور لاچاری کے آگے سرد ہوتے ہوئے بھی دکھایا ہے۔یعنی کٹّو اپنی بیٹی کو اپنے سے دور جانے پر احتجاج تو کرتی ہے لیکن اس کے پاس اتنی استعداد نہیں کہ کیتھرین کی پرورش کر سکے۔سماج کے ذات پات نے زندگی کو ایک خانے میں قید کر دیا تھا یہی وجہ ہے کہ جمعداری اور مہترانی کی ملازمت سے سوائے خود کے پیٹ بھرنے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔سماجی نظام کے تحت بیٹی کی مستقبل بھی خاندانی رو پر نہ چلنے لگے اس ڈر سے کٹّو، مس سیلیا رچمنڈ کی ساری باتیں قبول کر لیتی ہے۔مصنفہ نے اس منظر کو یوں بیان کیا ہے:

''اب مس رچمنڈ نے ذرا سمجھانے کے انداز میں کہا۔''کٹّو تم ایک دم

پاگل ہائے۔تم سوچنا مانگتا۔ٹھنڈے دل سے۔ادھر ہمارا ڈیتھ کے بعد کیٹی کا فیوچر کیا ہوگا؟ مسوری میں تھوڑا بہت نیٹو لوگ اب بھی جانتا کہ وہ تمھارا چھوکری ہے۔اگر یہ بات سب کو معلوم ہو گیا تو؟ انڈیا میں کاسٹ سسٹم کا اتنا زور ہے۔اس سے شادی کون بنائے گا؟ پھر ادھر اینگلو چھوکری کا کیا عزت ہے؟ لوگ ایک طوائف کے ما فک سمجھتا۔کیا تم مانگے گا کہ تمھارا بیٹی ہوٹلوں میں ایک ایک کپڑا اتارنے والا ناچ کرے؟ یا تم میونسپلٹی کے جمعدار سے اس کی شادی کرے گا؟ سوچنا مانگتا۔بولو......؟''

کٹّو لاجواب رہ گئی۔''۵۲

مذکورہ اقتباس میں مس رچمنڈ کیتھرین کی بہتر زندگی کے حوالے سے سمجھاتے ہوئے کٹّو کو ہندوستان کی طبقاتی نظام کے بارے میں احساس دلاتی ہے۔یہاں پر ہندوستان میں پسماندہ طبقے کی سماجی حیثیت بھی سامنے آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ کٹّو اپنے دل پر پتھر رکھ کر کیتھرین کا آسٹریلیا جانے پر راضی ہو جاتی ہے۔مس رچمنڈ کا یہ رویہ دوہرے مفاد پر مبنی ہے،دراصل ہندوستان کے طبقاتی نظام اور مستقبل کا خواب دکھا کر مس رچمنڈ نے کٹّو سے اس کی بیٹی کو لے لیا جو حقیقت سے زیادہ خودغرضی پر مبنی ہے۔آسٹریلیا جانے کے بعد کیتھرین کی جو زندگی سامنے آتی ہے وہ مغربی تہذیب کی عریانیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔کیتھرین کی زندگی ایک جگہ ٹھہرتی ہوئی نظر نہیں آتی بلکہ اس سے ملنے والا ہر شخص اس کے ساتھ عیش وعشرت کے چند لمحات گزارتا ہے اور اس کے بعد اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔کچھ وقت بعد کیتھرین مزید آگے بڑھ کر زندگی کے سفر پر چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر مغرب کی سطحی زندگی اور صنعتی نظام پر طنز کرتے ہوئے انسان کی انسانیت اور اس کی پامالی کا احساس بھی دلاتی ہیں۔مغرب میں کیتھرین کی لمحاتی زندگی مختلف ممالک میں گزرتی ہے لیکن یہ زندگی عارضی اور مصنوعی ہے۔آخر میں اس کی ملاقات بنگال کے راجکمار شیلندر ناتھ سے ہوتی ہے،شیلندر ناتھ سے شادی کے بعد کیتھرین اب شیلجا دیوی بن جاتی ہے اور راجکمار کے ساتھ ہندوستان چلی آتی ہے۔طویل زندگی

کے اس مسافت میں کیتھرین نے کبھی اپنے غریب ماں اور ماما سے رابطہ نہیں کیا اور نا ہی ہندوستان آنے کی اطلاع دی۔ایک رسالے میں چھپی تصویر کے ذریعے اس کے ماں باپ کو جب یہ خبر ہوتی ہے کہ کیتھرین ہندوستان میں ہے تو وہ اس سے ملنے اس کے گھر جاتے ہیں۔ دروازے پر کھڑے ہوکر یہ پسماندگان جب اپنی بیٹی کو پکارتے ہیں تو والدین کے جذبات کا دھارا کیتھرین کو اپنی طرف کھینچتا ضرور ہے لیکن رنگین دنیا کا خواب رکھنے والی کیتھرین اپنے پسماندہ ماں باپ اور اپنی پسماندہ زندگی کو سوچ کر ان کے جذبات کو زیر کر دیتی ہے اور پہچاننے سے انکار بھی کر دیتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے سماج کے پسماندہ طبقے کے احساس کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اپنا ہی خون عیش وعشرت کے آگے اپنے والدین کو بھولنے پر اصرار کرتا ہے۔افسانے میں مصنفہ نے پسماندہ طبقے کی مفلوک الحال زندگی کی حقیقت کو اتنی تنگ اور غربت زدہ دکھایا ہے کہ اپنائیت اور انسانیت بھی دم توڑ دیتی ہے اور قاری اس افسانے کے ذریعے سماجی اصول کے پس منظر میں انسانیت کو شرمسار ہوتے دیکھ کر مایوس ہوتا ہے۔کیتھرین جب اپنے والدین کو پہچاننے سے انکار کرتی ہے تو والدین کا جذبہ مجروح ہو جاتا ہے۔اس منظر کو مصنفہ نے بڑی فن کاری سے پیش کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''ڈارلنگ! اس رسالے میں وہ تصویر اور مضمون چھپا غضب ہو گیا۔کوئی بدمعاشوں کی ٹولی آن پہنچی ہے بلیک میل کرنے۔خود کو میرے ماں باپ بتاتے ہیں۔تمہارے پتاجی الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں۔مجھے تو یہ اسی کا شاخسانہ معلوم ہوتا ہے تمھارے والد کے برہم ووٹ کو توڑنے کے لئے مخالفوں نے ایک ہریجن عورت کو سکھلا پڑھا کر ایک انگریز بڈھے کے ساتھ یہاں بھیج دیا کہ کہے کہ وہ میری ماں ہے۔ یہ بڈھا سی۔اے۔ آئی ۔اے ۔ کا ایجنٹ بھی ہوسکتا ہے۔ پولس کو فون کرو......فوراً.....''۵۴؎

مذکورہ اقتباس میں برہمن اور ہریجن سماج کے قدیم تفریقی نظام کا روایتی عکس ہے۔اس میں سیاسی مفاد کو ذریعہ بنا کر پسماندہ طبقے کی ہریجن برادری کو نیچ دکھایا گیا ہے جبکہ یہ عورت اس کی ماں ہے لیکن رتبے کی

اہمیت اور اصلیت چھپانے کے لیے اسے مجبوراً ایسا کرنا پڑتا ہے۔اس افسانے میں ماں بیٹی کے رشتے کو وقت کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے جو سماج کے پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔قرۃ العین حیدر نے اس طبقے کی زندگی اور حالات کو بڑی باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ان کے معاشی مسائل اور سماجی حقوق کو پیش کرنے میں مصنفہ نے حقیقی بیانیہ سے کام لیا ہے۔مس رچمنڈ کا مالکانہ رویہ نچلے طبقے کا استحصال کرتا ہے۔مس رچمنڈ نے کٹّو کی بیٹی کیتھرین کو اس سے چھین لیا اور اپنے ساتھ آسٹریلیا لے گئی جہاں اس کا اعلیٰ طبقے کے مغربی لوگوں نے بھی استحصال کیا۔اس افسانے میں ذات کے طبقاتی نظام کے ساتھ مذہبی رواداری بھی نظر آتی ہے جو مختلف راہ پر بدلتی رہتی ہے۔کیتھرین مختلف مذاہب کے لوگوں کے ساتھ اپنائیت کا رشتہ استوار کرتی ہے تو اسے ہر بار تبدیلیِ مذہب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔دراصل یہ افسانہ پسماندہ طبقے کی زندگی اور حالات پر مشتمل ہے جو سماج کے طبقاتی نظام کے زیر اثر مفلسی، غریبی اور پسماندگی کی زندگی گزانے پر مجبور ہیں۔قرۃ العین حیدر نے اسی سماجی نظام کے زیر اثر انسانی زندگی پر ہو رہے استحصال کو پیش کیا ہے۔

قندیل چین:

بعنوان ’’قندیل چین‘‘ قرۃ العین حیدر کا آخری افسانوی مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر جمیل اختر نے ترتیب دے کر ۲۰۰۷ء میں مجموعے کی شکل میں شائع کرایا۔اس مجموعے میں قرۃ العین حیدر کے کل ۲۱؍افسانے شامل ہیں جو اردو کے مختلف رسالوں میں بکھرے ہوئے تھے۔جمیل اختر نے ان بکھرے ہوئے افسانوں کو مختلف رسائل و جرائد سے جمع کر کے ’’قندیل چین‘‘ کے عنوان سے ایک نیا افسانوی مجموعہ مرتب کیا۔ڈاکٹر جمیل اختر کا یہ کام قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کو مکمل طور پر سمجھنے میں معاون ہوگا اور ان کے فکر و فن کے نئے گوشوں کا مطالعہ کرنے میں بھی اہم ثابت ہوگا۔

افسانہ ’’شربت والی گلی‘‘ قرۃ العین حیدر کے منفرد افسانوں میں سے ایک ہے۔یہ افسانہ جدید الٹرافیشن فلمی دنیا کے ماحولیات سے شروع ہوتا ہے جس کا تانا بانا قدیم زمانے کے فلم انڈسٹری سے جا ملتا

ہے۔افسانہ ''شربت والی گلی'' ناگ پاڑہ ،بمبئی کے ایک خستہ حال محلّہ 'شربت والی'' میں رہنے والے غریب اور نچلے طبقے کے لوگوں کا ہے ۔ یہ طبقہ نکڑ اور گلی پٹ پاتھ پر ٹین کی کرسیاں لگائے مفلوک الحال نظر آتا ہے۔شروع زمانے میں فلمی دنیا سے اسی طبقے کے لوگ وابستہ ہوئے۔ ہندوستان کا عزت دار طبقہ فلمی دنیا کے لوگوں سے دور رہتا تھا اور انہیں گری پڑی نظروں سے دیکھتا تھا۔قرۃ العین حیدر نے اس دور کی فلمی دنیا کے حالات کو پیش کرتے ہوئے طبقاتی تفریق اور انسانی زندگی کی اہمیت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

''نئی نئی ہندوستانی فلم انڈسٹری میں اینگلو انڈین اور یہودی لڑکیوں کا بول بالا تھا، جو زیادہ تر سماج کے ''بے عزت طبقے'' سے تعلق رکھتی تھیں۔ ڈولی جیکب لبنانی یہودن تھی۔اس کے ماں باپ اسی شربت والی گلی میں رہتے تھے۔باپ پرانے کپڑوں کا بیوپاری تھا۔وہ غریب لوگ تھے۔مگر ڈولی اپنے حسن کی بدولت فلمی دنیا میں پہنچ گئی اور بہت جلد صف اول کی ایکٹرس کہلانے لگی۔.......

اس نے بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی تھی۔سب کچھ تھا،مگر عزت نہیں تھی۔فلم ایکٹریسوں کو سوسائٹی میں بے حد ذلیل سمجھا جاتا تھا۔''[۵۴]

افسانہ ''شربت والی گلی'' میں قرۃ العین حیدر نے فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی معاشرتی اور سماجی زندگی کو پیش کیا ہے۔اس زمانے میں فلمی شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی سماج میں کوئی عزت نہیں تھی،انہیں سماج کے نچلے طبقے میں شمار کیا جاتا تھا۔فلم انڈسٹری کی مشہور اور حسین ایکٹریس ڈولی جیکب سے دیوان راج ناتھ کو عشق ہو گیا جو دلی کے بڑے رئیس اور اعلیٰ طبقے سے تھے۔ڈولی جیکب 'شربت والی گلی' میں رہنے والی پسماندہ طبقے کی لڑکی تھی ۔فلمی دنیا میں محنت اور خوبصورتی سے اسے شہرت اور پیسا تو ملا لیکن عزت نہیں ملی، ڈولی اور اس طبقے کے لوگوں کی ایک ہی خواہش تھی کہ سماج میں انہیں عزت مل جائے۔ دیوان صاحب نے ڈولی سے شادی کرتے وقت کہا تھا کہ'' ڈولی مجھے تمہارے ماضی سے کوئی مطلب نہیں ،صرف تمہارے مستقبل سے دلچسپی ہے، میں تم کو اتنا سکھ ، اتنی عزت ،اتنی محبت دونگا کہ تم اپنے پرانے دکھ بھول

جاؤ گی۔'' ص۲۹۹ ر جوہی، اسی وعدہ وفا کی نشانی تھی۔ چھ سال بعد جوہی کے والد دیوان راج نے بنارس کی ایک مشہور فلمی مغنیہ کی باتوں میں آکر ڈولی کو گھر سے نکال دیا جس کے بعد 'ڈولی' اپنی بیٹی 'جوہی' سے دور تاج گل اور ماں کے ساتھ پوری زندگی 'شربت والی گلی' میں معاشی بدحالی اور مفلسی میں گزارتی نظر آتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے جس طرح ڈولی جیکب کی زندگی، اس کی نفسیات اور جذبات کو پیش کیا ہے وہ ایک قابل رحم عورت کی طرح دکھائی دیتی ہے۔اس کے اندر احتجاج کا کوئی جذبہ نہیں ہے وہ وقت اور حالات کو اپنی قسمت سمجھ کر بیٹھی ہوئی ہے۔

> ''اب تاج گل ہی دنیا میں میرا واحد سہارا اور ساتھی تھا۔ پرانے مداح نظریں پھیر چکے تھے۔ پیٹ پالنے کے لیے تاج گل نے کئی دھندے کیے۔ میں نے بچا کھچا کر روپیہ ریس میں لگا دیا کہ شاید قسمت پلٹ جائے۔مگر قسمت روٹھ چکی تھی۔ نوبت یہ آئی کہ اس کھولی میں منتقل ہونا پڑا۔ میرا باپ مر چکا تھا۔ ماں وہ باہر بیٹھی ہے۔ اور اپنی اندھی دھندی آنکھوں سے گول یہودی ٹوپیاں سیتی رہتی ہے۔ یہ ٹوپیاں اوڑھ کر یہودی لوگ اپنے عبادت خانے میں جاتے ہیں۔ یہ ٹوپیاں اگر بک جائیں تو ہفتے میں تین چار روپے بن جاتے ہیں۔'' ۵۵

قرۃ العین حیدر نے ڈولی جیکب کی معاشی پسماندہ زندگی اور شربت والی گلی کی ایک ایک تصویر کو اس طرح نمایاں کیا ہے کہ اس گلی اور وہاں کے رہنے والے لوگوں کے حالات آنکھوں کے سامنے عکس بن کر ابھر آتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں معاشی پسماندگی اور سماج میں پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی کو بڑے تلخ انداز میں پیش کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا یہ افسانہ فلمی دنیا کے قدیم پس منظر کے ساتھ جدید دور کی فلم انڈسٹریز کی ترقی کا تجزیاتی تجربہ ہے۔ ڈولی جیکب کی بیٹی جوہی، بے شمار دولتوں کی مالک ہے لیکن اس کا تعلق جدید فلم انڈسٹری سے ہے جسے اب سماج میں پسماندہ طبقہ کے بجائے موڈرن اور آزاد خیال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ڈولی جیکب

اور جوہی کی زندگی کا تجربہ وقت کے بدلتے حالات، بدلتی سوچ اور مفاد پرستی کی نظر سے دیکھا جاسکتا ہے۔اعلیٰ طبقہ جو فلم انڈسٹری سے دامن بچاتا تھا اب وہ اسی کا حصہ بنتا جارہا ہے۔وقت نے سب کچھ بدل دیا، معیار زندگی اور نظام زندگی میں جو نیچ اور غلیظ سمجھے جاتے تھے آج سائنسی ترقی نے انہیں سماج کے عزت دار طبقے کا درجہ دلا دیا ہے جس کی خواہش کبھی ڈولی جیکب کو تھی آج اسے جوہی کی شکل میں معاشرہ نے قبول کرلیا ہے۔

اس مجموعے کا ایک افسانہ ''تار پر چلنے والی'' کے نام سے ہے۔ یہ افسانہ سرکس اور اس میں کام کرنے والے لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل پر مبنی ہے۔ سرکس ایک دنیا ہے اس میں مختلف مما لک کے لوگ ایک ساتھ بین الاقوام برادری کی طرح رہتے ہیں۔ سرکس میں اپنی جان پر کھیل کر خطرناک کھیل تماشے دکھانا سرکس کے لوگوں کا آبائی پیشہ ہے اور اسی پیشے کے ذریعے یہ لوگ اپنے خاندان کی معاشی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ روس اور جاپان کی طرح ہندوستان بھی بازی گری کی قدیم جنم بھومی ہے لیکن ان فنکاروں کی اب یہاں کوئی قدر، کوئی عزت نہیں ہوتی۔ سرکس کے ہندوستانی اداکاروں کی زندگی اور ان کے حالت کا ایک منظر ملاحظہ کریں:

> ''میں پہلے ہندوستانی فن کاروں سے ملنا چاہوں گا۔''
> ...''بہت خوب،'' سید صاحب نے کہا اور مجھے ٹین کے عارضی کمروں کی ایک قطار کی طرف لے گئے۔ یہ فاقہ مست مزدوروں کی بستی معلوم ہو رہی تھی جہاں عام گھریلو، شرمیلی، خستہ حال لڑکیاں پکانے ریندھنے، کپڑے دھونے اور بچے کھلانے میں مصروف تھیں۔ان کے گھر والے اِدھر اُدھر بیٹھے گپیں ہاک رہے تھے۔''۵۶

درج بالا اقتباس میں ہندوستانی اداکاروں کی پسماندہ زندگی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ 'کیرلا' دیہات کے افلاس زدہ لوگ ہیں جہاں سرکس کی روایت بہت پرانی ہے۔ کیرلا، کے فاقہ کش والدین چھ چھ سات سات برس کی عمر میں اپنے بچوں کو سرکس والوں کے حوالے کر دیتے ہیں، یہ لوگ سرکس میں کام کر کے اپنے والدین کی کفالت کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے سرکس کے پسماندہ کرداروں کی معاشی زندگی کو پیش کرتے

ہوئے ان کے حالات اور مسائل کی حقیقی تصویر کو ابھارا ہے۔ یہ افسانہ سرکس کے اندر کی زندگی کو پیش کرتا ہے۔ ورنہ ہم عام طور پر سرکس کے اداکاروں کو ظاہری طور پر ہی دیکھتے ہیں جو ان کی خارجی چمک دھمک سے ظاہر ہوتی ہے لیکن ان کی زندگی کے حقیقی مسائل کچھ اور ہی ہیں۔ بھوک، افلاس اور بے چارگی انسان کو ہر طرح کے اعمال کرنے پر امادہ کر دیتا ہے چاہے اس میں جان کا خطرہ ہی کیوں نا ہو۔

''تار پر چلنے والی'' میں ہندوستانی کرداروں کے ساتھ عالمی کردار بھی نظر آتے ہیں۔'مادام تمارا'، 'اولگا' اور'مس لارا' غیر ملکی اداکارہ ہیں جو ہندوستانی سرکس میں کام کرتی ہیں۔ مادام تمارا، سفید روسی تھی جو انقلابِ روس کے ہنگام سے بچ کر ایران سے ہندوستان آن پہنچی تھی۔ ہندوستان میں ایک سرکس کے بازی گر سے شادی کر لی، جو چند سال بعد مادام تمارا اور بیٹی اولگا کو چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ مادام تمارا کی بیٹی بھی اسی سرکس کا حصہ ہے۔ قرۃ العین حیدر کا یہ افسانہ سرکس میں کام کرنے والے مجبور، مفلس، مظلوم اور معصوم لوگوں کا ہے جو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ستم کھائے ہوئے ہیں۔ مادام تمارا کا احساس ختم ہو چکا ہے وہ اب وقت کے ساتھ سمجھوتا کر چکی ہے۔ تمارا کی بیٹی اولگا بھی ماں کے ساتھ سرکس کا حصہ بن چکی ہے۔

افسانے کا اہم کردار'کیتھرین دوپال مس لارا' کا ہے۔ مس لارا، ٹرک سائیکلسٹ، ٹائٹ روپ ڈانسر، افسانہ نگار اور شاعرہ بھی تھی۔ مس لارا، عشق میں ناکام ہوئی تو ذہنی توازن کھو گیا، بھائی اور باپ کے مرنے کے بعد مسلسل افلاس زدہ زندگی سے تنگ آ کر'ماما' نے سرکس کے ایک آدمی سے شادی کر دی۔ سرکس اب مس لارا، کا گھر اور زندگی کا مقصد ہے، باوجود اس کے مس لارا کے دل اور دماغ میں ماضی کی یاد اب بھی باقی ہے۔ وہ اب بھی اپنی یادوں کے جذبے کو سمیٹ کر رکھی ہوئی ہے، اس کا جذبۂ عشق آج بھی زندہ ہے اور وہ اسے بھول نہیں پائی ہے لیکن اس کا عشق اب سوائے یاد کہ کچھ بھی نہیں۔ قرۃ العین حیدر نے مس لارا، کے جذبۂ احساس کو جس طرح بیان کیا ہے قاری اس احساس میں شامل ہو جاتا ہے اور مس لارا سے ایک طرح کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔

> ''اپنے محترم بوس سے کہنا کہ سرکس کی ایک گم نام، بے عزت، بے تکی
> ٹائٹ روپ ڈانسر نے انہیں معاف کر دیا ہے۔''[۵۷]

قرۃ العین حیدر کے اس افسانے کا اختتام انسان کی المیاتی احساس پر ہوتا ہے۔ یہ افسانہ زندگی کے متعلق ایک سوال بھی قائم کرتا ہے کہ انسان کی ایک چھوٹی سی غلطی اپنے عزیز کو کس مقام پر لا کھڑا کرتی ہے کہ وہ اس کی تباہی کی وجہ بن جاتا ہے؟ اور وہ دربدر کی ٹھوکرے کھاتا زمانے میں رسوا ہوا پھرتا ہے۔ مس لارا، کی زندگی میں پروفیسر کا داخل ہونا اور یوں بنا بتائے اس کی زندگی سے چلے جانا، انسانی رشتے کی بے قدری اور انسان کی بے حرمتی کی دلیل ہے۔ جسے قرۃ العین حیدر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

''سنگھاردان'' موضوع کے اعتبار سے قرۃ العین حیدر کا منفرد افسانہ ہے۔ اس میں طوائفوں کی زندگی اوران کے حالات کو وقت کے بدلتے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ لندن سے شروع ہوتا ہے، لندن میں افسانہ نگار کی ملاقات ایک لکھنوی خاتون 'زمرد پری' سے ہوتی ہے۔ 'زمرد پری' جب احوال سناتی ہے تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ عورت لکھنو کی مشہور طوائف اور ''پرستان منزل'' کی 'زمرد پری' ہے۔ پرستان منزل، لکھنو کے خاندانی طوائفوں کا مکان ہے۔ قرۃ العین حیدر نے زمرد پری کی زندگی کے حوالے سے طوائف کی زندگی اوران کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ معاشرے میں یہ عام رائے ہے کہ طوائفیں معاشرے کی سب سے نیچ اور گھٹیا عورت ہوتی ہیں۔ اس کی دولت اس کا جسم ہے اوراس کی پونجی اس کی جوانی۔ سماج میں طوائف برادری کو ناچنے، گانے والی فاحشہ عورت سے زیادہ حیثیت نہیں سمجھی جاتی ہے۔ یہ طوائفیں صرف اورصرف دوسروں کے خواہشات کی تسکین کا سامان ہوتی ہیں جسے سماج میں پسماندہ طبقے کی نچلی ذات میں شمار کیا جاتا ہے۔ طوائفوں کا یہ طبقاتی تعین سماجی اور معاشی طبقۂ نظام کا مرہونِ منت ہے۔ 'زمرد پری' اپنے خاندان کا ذکر کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ:

> ''ہمارا گھرانہ ڈیرے دار طوائفوں کا گھرانہ تھا جو شاید نواب آصف الدولہ کے زمانے میں فیض آباد سے لکھنؤ آ گیا تھا۔ میری نانیاں، پرنانیاں بڑے معرکے کی طوائفیں تھیں۔ میری پردادیاں صاحبِ دیوان شاعرہ تھیں۔ اکثر تذکروں میں ان کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ ہمارے خاندان کی شاہی دربار تک رسائی تھی۔ میری دادی

> خدا بخشے، اس گھرانے کی آخری مغنیہ تھیں۔ بولتے سنیما اور ریڈیو کے دور میں ہمارے گھرانے کا وہ شہرہ نہیں رہا لیکن اللہ بخشے دادی کی گائی ہوئی ٹھمریوں کے ریکارڈ آج بھی خاصے کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ حسن پری اور حسین علی ان کی اولاد تھے۔۵۸؎

مذکورہ اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ طوائفوں اور مغنیوں کا یہ پیشہ ماضی بعید سے چلا آ رہا ہے اور یہ سماجی تاریخ اور تہذیب کا حصہ بھی ہے۔ افسانہ نگار نے جس طرح 'زمرد پری' کے خاندانی پیشہ اور طبقۂ پسماندگان کا ذکر کیا ہے اس سے قاری بھی اس طبقے کے مسائل سے واقف ہوتا ہے اور سماجی نظام کی عارضی تفریق کو بھی محسوس کرتا ہے۔

افسانے کا مرکزی کردار 'زمرد پری' کم عمر حسین لڑکی ہے۔ اس کی پرورش 'حسن پری' اپنی نگرانی میں کرتی ہے کیونکہ طوائف پیشے میں لڑکیوں کی بڑی قیمت اور اہمیت ہوتی ہے۔ زمرد پری، پرستان منزل کی اکلوتی اور آخری امید ہے جس سے اس خاندان کی قسمت بدلنے والی ہے۔ 'زمرد پری' خاندانی پیشے کے بجائے نئے سماج میں شامل ہونا چاہتی تھی، اس کا شوق پڑھنے لکھنے کا تھا۔ 'زمرد پری' کے احتجاج کے باوجود 'حسن پری' اور 'بھائی مجن' نے اس کو دھوکے سے راجا جگمگ پور کو پندرہ ہزار نقد اور بیس ہزار زیور کے بدلے بیچ دیا۔ قرۃ العین حیدر نے یہاں طوائف طبقے کے متضاد حالات کو ایک ساتھ پیش کیا ہے۔ معاشی بدحالی کے سبب 'حسن پری' نہ چاہتے ہوئے بھی 'زمرد' کے ساتھ دھوکا کر گزرتی ہے وہیں 'زمرد' کسی بھی حال میں طوائف پیشے سے بچنا چاہتی ہے۔ اسی غرض وسبب وہ مرض کے بہانے سے ڈاکٹر کا سہارا لیتی ہے اور بعد میں راجا جگمگ پور کے ساتھ اس پیشے سے دور جانے پر راضی ہو جاتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے 'زمرد' کی زندگی کو قسمت کے حصار میں دکھانے کی کوشش کی ہے کہ 'زمرد پری' کی قسمت اس کے پیچھے وحشی جانور کی طرح ساتھ ساتھ چل رہی تھی جو ہر موقع پر شکار کرنے کو آمادہ ہے۔ لندن کے سفر پر راجا جگمگ پور، بھائی مجن اور پھوپھی حسن پری کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے تو 'زمرد' کا دل دہل جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے شعوری سازش کے انکشاف پر زمرد کی کیفیت کا اظہار یوں کیا ہے:

''اس لمحے میری روح کی گہرائیوں سے ایک ایسی گالی نکلی جو اس کے آبائی پیشے کے متعلق تھی۔کم بخت اصل پر گیا نا آخر۔میرا لاڈلا، چہیتا ماں جایا مجن۔میرا رنگ فق ہو چکا تھا اور میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔اس عظیم الشان، تیرتے ہوئے روشنیوں کے شہر میں، اتھاہ سمندر اور رات کی تنہائی کے بھنور میں اس خوف ناک راجہ کے سامنے بے بس کھڑی تھی اور اس وقت اپنی حرافہ پھوپھی کی ساری چال بازی میری آنکھوں کے سامنے عیاں ہوگئی۔''۵۹؎

زمرد پری کا غصہ یہاں فطری عمل ہے وہ لاکھ احتجاج کے باوجود بھی وہیں کھڑی ہے جہاں سے وہ چلی تھی، جس پیشے سے وہ دور جانا چاہتی تھی۔لیکن اس کا پیشہ اس کی جسم اور روح کے ساتھ لازم وملزوم کی طرح پیچھے پڑا تھا، جو سات سمندر پار بھی اس کی زندگی کا حصہ بنا ہوا ہے۔قرۃ العین حیدر نے زمرد کی مجبوری کو اس پیشے اور سماج کے دستوری نظام کے ساتھ اس طرح ایک کر کے پیش کیا ہے کہ وہ پوری زندگی اپنے پیشے سے بغاوت کرتے اور پیچھا چھڑاتے ہوئے نظر آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ''سنگھار دان'' میں طبقۂ طوائف کے مسائل کو سماجی نظام کا ہی ایک حصہ بنا کر پیش کیا ہے۔کیونکہ طوائف کو سماج کے اس طبقے میں شمار کیا جاتا ہے جس سے معاشرہ نفرت کرتا ہے۔باوجود اس کے معاشرے کا شریف طبقہ طوائف کے کوٹھے کی زینت بننے میں اہم رول بھی ادا کرتا ہے۔محرم کے مہینے میں طوائف مغنیہ شرفاء کے گھروں میں جاتی ہیں اور اپنی آواز سے مرثیہ خوانی کا اہم حصہ بنتی ہیں۔اب یہاں سماج کا دوہرا رویہ دیکھئے کہ مرثیہ خوانی کے لیے طوائف گھر تو آ سکتی ہیں لیکن اس کے گھر جانا معیوب سمجھا جاتا ہے اور اس کے گھر کا تبرک کھانا گناہِ عظیم۔''کنچنی کے گھر کا حصہ لے آئے۔چھی چھی......آخ تھو...... جاؤ ہاتھ دھوؤ۔توبہ کرو۔چھی چھی...... گناہ ہوگا......''۶۰؎ قرۃ العین حیدر نے اس تفریق کو اس طرح دکھایا ہے کہ طوائف کا جسم، طوائف کی آواز اور طوائف کی محفل طبقاتی تفریق کو واضح نہیں کرتی، لیکن طوائف کی زندگی سے دائمی رشتہ یا اس کے گھر کے کھانے کا سامان وغیرہ اس کے طبقے کی نشان دہی ضرور کرتا ہے۔دراصل قرۃ العین

حیدر کا یہ افسانہ سماج کے اسی دوہرے طبقاتی نظام کے کھوکھلے پن پر طنز ہے۔

ہندوستانی تہذیب میں طبقاتی تفریق کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ پسماندہ طبقے کا کوئی فرد نچلی ذاتی سے اٹھ کر یا الگ ہو کر اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہے تو سماج قدم قدم پر اس کے حوصلے کو مسمار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی اور تقسیم نے سماجی تہذیب اور انسانی فکر کے سارے پیمانے کو بدل دیا، لیکن معاشرے میں طبقاتی تفریق کا پیمانہ اب بھی وہی ہے۔ زمرد پری، لندن میں طوائف پیشہ کے بجائے گھروں اور فیکٹریوں میں کام کر کے اپنی معاشی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اس کی یہ محنت اور مشقت اس لیے تھی کہ معاشرے میں عزت کی زندگی نصیب ہو جائے لیکن طبقات کی جڑ نے یہاں بھی اپنے نقش ابھارے۔ ہندوستان سے آنے والے لوگوں نے زمرد کو پرستان منزل کی طوائف اور راجا جگ مگ پور کی داشتہ ہی کہا اور سماج کے عزت دار طبقے نے اسے گری پڑی نظروں سے گھور کر دیکھا۔ دراصل قرۃ العین حیدر نے سماج کے طبقۂ اشرافیہ اور پسماندہ طبقے کے بیچ جو فرق ہے اس کو نمایاں کرتے ہوئے اس کے منفی اثرات کو واضح کیا ہے۔ سماج کی اس طبقاتی تفریق نے کس طرح سے انسان کی حوصلہ شکنی کی ہے اور اس کے جذبات کو چوٹ پہنچایا ہے۔ اقتباس دیکھیے کہ:

> ''اس شرافت، اس پارسائی، اس محنت کشی سے مجھے کیا فائدہ ہوا؟ یہ معاشرہ مجھے کبھی عزت نہ دے گا۔ میں یہاں سات سمندر پار بھی، اپنے ہم وطنوں کی نظروں میں مہاراجا جگ مگ پور کی سابق داشتہ زمرد بائی آف لکھنؤ ہی رہوں گی۔ میں اس طرح خون پسینہ ایک کر کے اپنی جان کیوں ہلکان کر رہی ہوں؟ کیا جب میں وطن جاؤں گی تو مجھے کسی اسکول میں نوکری مل جائے گی؟ زمرد پری کو اسکول ٹیچر بننے کی اجازت ملے گی؟ شاید آپا ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ مجن ٹھیک ہی کہتا تھا۔ کوئی شریف آدمی مجھ سے نکاح کرنے کو تیار نہیں۔ کہاں جاؤں......؟ کیا کروں؟[۶۱]

افسانہ ''سنگھاردان'' آزاد ہندوستان سے قبل اور بعد کی تہذیب یافتہ لکھنؤ شہر کی زندگی کو پیش کرتا

ہے۔ بالخصوص لکھنؤ کی طوائفوں کی زندگی اوران کے حالات نظر آتے ہیں۔افسانے کے ذریعے ہمیں بدلتے وقت کے تناظر میں طوائف پیشے سے وابستہ لوگوں کی زندگی کے عروج وزوال اوران کی زندگی کی بحرانی کیفیت بھی دکھائی دیتی ہے۔قرۃالعین حیدر نے افسانے کے ذریعے طوائفوں کی نفسیات، جذبات اوراحساسات کو بنتے بگڑتے حالات اورمواقع پران کی بہترین ترجمانی کی ہے۔یہ افسانہ سماج کے طبقاتی نظام اورسماجی اصول کی حد بندی پرلکھا گیا اہم افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار نے پسماندہ طبقے کی طوائفوں کی زندگی کے مختلف مسائل کوپیش کیا ہے۔

اس مجموعے کا اگلاافسانہ ''ایک پرانی کہانی'' کے عنوان سے ہے۔اس افسانے میں قرۃالعین حیدر نے لوگوں کی معاشی پسماندگی،غریبی، بھوک مری اور افلاس زدگی جیسے مسائل کوموضوع بنایا ہے۔معاشی پسماندگی اور پیٹ کی بھوک کے آگے انسان ہرفعل کرنے پرآمادہ ہوجاتا ہے،حتیٰ کے وہ بھیک مانگنا بھی قبول کر لیتا ہے۔دنیا کے ہرگلی محلے میں بھیک مانگنے والے لوگ مل جائیں گے جومختلف مجبوری کے تحت لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔قرۃالعین حیدر نے اس افسانے میں بھکاریوں کی زندگی اوران کے مسائل کوپیش کیا ہے جواپنی مجبورزندگی کا کارواں خودہی اٹھائے چلے جارہے ہیں۔اقتباس ملاحظہ کریں کہ:

> ''یہ ایک بالکل سچی کہانی یہ جوان گنت اندگے فقیرہمیں سڑکوں کے کنارے کنارے چلتے ،درختوں اورشکستہ دیواروں کے سائے میں بیٹھے ،المونیم کا میلا کٹورہ ہاتھ میں لیے بھیک مانگتے نظرآتے ہیں،کبھی ہم نے اپناروشن راستہ طے کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیےٹھٹھک کرسوچا ہے کہ ان کی زندگیوں کی کہانی کیا ہوگی؟ یہ کہاپیدا ہوئے۔ان کے ماں باپ کون تھے،گھر بار کیسا تھا، انہوں نے کب اورکس طرح آنکھیں کھوئیں۔کب سے اس طرح ٹٹول ٹٹول کر چلتے ہوئے، گھگھیا گھگھیا کرخیرات مانگ رہے ہیں اورایک دن اسی طرح مرجائیں گے۔یعنی ایک گمنام اندھیرے سے نکل کردوسرے گمنام اندھیرے میں داخل ہو

جائیں گے۔''۶۲؎

افسانہ نگار کے گھر کا خانساماں انگریزوں کے زمانے سے ہی باورچی کی ملازمت کرتا ہے۔خانساماں کی بیوی اللہ دی بھی شوہر کے ساتھ گھر کے دوسرے کام کیا کرتی تھیں۔ ہندوستان کے بدلتے حالات میں ان کی زندگی بھی مختلف مسائل سے دوچار ہوئیں،اللہ دی کی موت کے بعد خانساماں نے اپنی درازیِ عمر اور کمزور بینائی کے سبب اپنا خانساماں کا پیشہ ترک کر دیا۔آنکھوں کی بینائی جانے کے بعد پیٹ بھرنے کے لیے اب وہ گلی چوراہے پر بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔قرۃ العین حیدر نے اندھے خانساماں جواب فقیر ہیں ان کی زندگی کی حقیقت کو بڑی رحم دلی سے پیش کیا ہے۔وقت کے ساتھ بدلتے حالات میں ان کا تجزیہ کرتے ہوئے تخلیق کار سیاسی رہنماؤ سے سوال کرتی ہیں کہ ان فقیروں کی زندگی پر کیوں کسی کی نظر نہیں پڑتی؟ کیوں کوئی ان کے مسائل کو حل کرنے کی بات نہیں کرتا؟ یا پھر یہ مظلوم اور بے بس لوگ کسی رحم و عافیت کے لائق نہیں؟ تقسیم کے وقت قرۃ العین حیدر بٹوارہ کرنے والے دانش مندوں سے سوال کرتی ہیں کہ:

''ایک بات بتائیے......'' آنکھوں والوں کی سیاست میں اندھوں کی کوئی جگہ ہے؟

کیا مطلب......؟

''مطلب یہ کہ فوج،تہذیب،زبان،خاندانوں اور دلوں کا بٹوارہ تو ہو گیا لیکن ہندوستان اور پاکستان کی گلیوں میں بھیک مانگتے اندھوں، اپاہج فقیروں اور لاچاروں کی تقسیم کسی نے کی......؟ مگر یہ کہ آج ہم سب اپنی بینائی کھو چکے ہیں۔''۶۳؎ص

یہ افسانہ تقسیم ہند کے وقت ہندوستان اور پاکستان کے بٹوارے میں مذہب ، فوج،زبان، تہذیب،خاندان اور دلوں کے ساتھ ملک کے بھکاریوں کا کیا ہوا؟ منٹو نے بھی ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تقسیم کے حوالے سے پاگلوں کے لیے بھی یہی سوال کیا تھا۔یہ دانش مند سیاست داں جو ایک بڑے رہبر اور رہنما کے طور پر خود کو ایک بڑا انٹلیکچو ل سمجھتے ہیں،اس افسانے کے ذریعے قرۃ العین حیدر نے انہی دانشمندوں کو پسماندہ

طبقے کے فقیروں کی زندگی کے حوالے سے ان کے مسائل پر اہم بات کی ہے۔

مجموعی طور پر قرۃ العین حیدر کے افسانوں کو دیکھا جائے ان کے یہاں موضوعات کا تنوع بہت زیادہ ہے۔ کرداروں کا ایک جمِ غفیر نظر آتا ہے جو چاروں طرف آتے جاتے نظر آتے ہیں۔افسانے کے یہ کردار اپنے حالات اور مسائل کے ذریعے اس عہد کی سماجی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور طبقاتی سطح پر بہترین نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس باب میں قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا مطالعہ ان کے افسانوں کے پسماندہ کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کے مختلف پہلوؤں سے کیا گیا ہے جو سماجی، طبقاتی، معاشرتی، معاشی اور ذاتی سطح پر کمزور اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر کام کرتے ہوئے بنیادی ماخذ سے زیادہ سروکار رکھا گیا ہے جبکہ ثانوی ماخذ سے کم مدد ملی ہے۔ کیوں کہ قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا نقاد افسانہ نگار کی موضوعاتی تفہیم سے کم سروکار رکھتا ہوا نظر آتا ہے جبکہ ان کی تکنیک، اسٹائل، زبان اور اسلوب پر زیادہ بات کرتا ہے۔ بہرکیف قرۃ العین حیدر کے مذکورہ تمام افسانوں کے پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی ان کے مسائل کا جائزہ متن کے حوالے سے لیا گیا ہے جو قرۃ العین حیدر کے افسانوی تفہیم اور معنوی جہت میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔

....

حواشی:

۱۔ قرۃ العین حیدر کا سانحہ: ایک عہد کا خاتمہ، گوپی چند نارنگ، مشمولہ، ماہنامہ رسالہ کتاب نما کا خصوصی شمارہ، قرۃ العین حیدر شخصیت اور فن، شمارہ نمبر ۹، جلد ۴۷، ستمبر ۲۰۰۷ء ص ۷

۲۔ قرۃ العین حیدر سے متعلق ایک سمینار کی افتتاحی تقریر، سید محمد اشرف، مشمولہ سہ ماہی رسالہ، روشنائی، جلد ۹، شمارہ نمبر ۳۴، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء ص ۱۳۔۱۴

۳۔ ''ستاروں سے آگے'' ایک تاثر، وارث علوی، مشمولہ سہ ماہی رسالہ، روشنائی، جلد ۹، شمارہ ۳۴، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء ص ۳۴

۴۔ ''ستاروں سے آگے'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'پرواز کے بعد'، ایجوکیشنل بک ہاوس دہلی، ۲۰۱۷ ص ۲۵

۵۔ ایضاً (پرواز کے بعد) ص ۲۸

۶۔ ایضاً (پرواز کے بعد) ص ۲۶

۷۔ ایضاً (پرواز کے بعد) ص ۲۶۔۲۷

۸۔ ''ستاروں سے آگے'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'ٹوٹتے تارے'، ایجوکیشنل بک ہاوس دہلی، ۲۰۱۷ ص ۶۱۔۶۲

۹۔ ایضاً (ٹوٹتے تارے) ص ۶۴

۱۰۔ ایضاً (ٹوٹتے تارے) ص ۶۵

۱۱۔ ''ستاروں سے آگے'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'رقص شرر'، ایجوکیشنل بک ہاوس دہلی، ۲۰۱۷ ص ۱۳۴۔۱۳۵

۱۲۔ ''ستاروں سے آگے'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'یہ باتیں'، ایجوکیشنل بک ہاوس دہلی، ۲۰۱۷ ص ۱۴۷

۱۳۔ ایضاً (یہ باتیں) ص۱۴۸

۱۴۔ تہذیب و تاریخ کی داستان گو، از ڈاکٹر سید احمد قادری، مشمولہ، ماہنامہ رسالہ نیا دور، خصوصی شمارہ ۱۱۔ ۱۲، جلد نمبر ۶۳، فرروری تا مارچ ۲۰۰۹ء ص۶۴

۱۵۔ ''شیشے کے گھر'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'برف باری سے پہلے' ایجوکیشنل بک ہاوس دہلی، ۲۰۱۰، ص۱۰۷

۱۶۔ ایضاً (برف باری سے پہلے) ص۱۰۷

۱۷۔ ایضاً (برف باری سے پہلے) ص۱۱۰

۱۸۔ ایضاً (برف باری سے پہلے) ص۱۲۷

۱۹۔ قرۃ العین حیدر کی افسانی نگاری از عظیم الشان صدیقی، مشمولہ قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ، مرتب پروفیسر محی الدین بمبئی والا، مطبع، ماڈرن پبلشنگ ہاوس نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص۲۱

۲۰۔ ''شیشے کے گھر'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'جلاوطن' ایجوکیشنل بک ہاوس دہلی، ۲۰۱۰، ص۲۸۴

۲۱۔ ایضاً (جلاوطن) ص۳۰۲

۲۲۔ ایضاً (جلاوطن) ص۳۰۳

۲۳۔ قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری از ڈاکٹر سہیل بیابانی، مطبع، عفیف پرنٹرس، لال کنواں، دہلی ۱۹۹۸ء ص۸۰

۲۴۔ ''پت جھڑ کی آواز'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'ڈالن والا' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۵ء ص۳۶

۲۵۔ ایضاً (ڈالن والا) ص۱۰

۲۶۔ ایضاً (ڈالن والا) ص۱۴

۲۷۔ ''پت جھڑ کی آواز'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'یاد کی اک دھنک جلے' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۵ء ص۹۵

۲۸۔ ایضاً (یاد کی اک دھنک جلے) ص۹۷

۲۹۔ ایضاً (یاد کی اک دھنک جلے) ص ۱۱۷

۳۰۔ ایضاً (یاد کی اک دھنک جلے) ص ۱۲۲

۳۱۔ قرۃ العین حیدر کی افسانی نگاری از عظیم الشان صدیقی، مشمولہ قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ، مرتب پروفیسر محی الدین بمبئی والا، مطبع، ماڈرن پبلشنگ ہاوس نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۷۔۱۸

۳۲۔ مضمون، قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ، از ایم۔مبین، مشمولہ، قرۃ العین حیدر: شخصیت وفن، مرتب، ڈاکٹر صاحب علی، ۲۰۰۸، ص ۲۳۷

۳۳۔ ''پت جھڑ کی آواز'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'کارمن' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۵ء ص ۱۷۳

۳۴۔ ایضاً (کارمن) ص ۱۹۶

۳۵۔ قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری از ڈاکٹر سہیل بیابانی، مطبع، عفیف پرنٹرس، لال کنواں، دہلی ۱۹۹۸ء ص ۸۶

۳۶۔ ''روشنی کی رفتار'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'حسب نسب' ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۲۰۱۴، ص ۴۱

۳۷۔ ایضاً (حسب نسب) ص ۴۴

۳۸۔ ایضاً (حسب نسب) ص ۴۴

۳۹۔ ''روشنی کی رفتار'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'نظارہ درمیاں ہے' ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۲۰۱۴، ص ۷۰

۴۰۔ ایضاً (نظارہ درمیاں ہے) ص ۷۱

۴۱۔ ایضاً (نظارہ درمیاں ہے) ص ۸۳

۴۲۔ ''روشنی کی رفتار'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'فقیروں کی پہاڑی' ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۲۰۱۴، ص ۱۲۵

۴۳۔ ایضاً (نظارہ درمیاں ہے) ص ۱۲۶

۴۴۔ ایضاً (نظارہ درمیاں ہے) ص ۱۲۷

۴۵۔ ایضاً (نظارہ درمیاں ہے) ص۱۳۴

۴۶۔ ''روشنی کی رفتار'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'اکثر اس سے بھی رقصِ فغاں ہوتا ہے' ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۲۰۱۴، ص۱۵۱

۴۷۔ ایضاً (اکثر اس طرح سے بھی رقصِ فغاں ہوتا ہے) ص۱۵۳

۴۸۔ ''روشنی کی رفتار'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'جن بولو تارا تارا' ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۲۰۱۴، ص۲۹۷

۴۹۔ ایضاً (جن بولو تارا تارا) س۳۰۴

۵۰۔ ایضاً (جن بولو تارا تارا) ص۳۰۶

۵۱۔ ''روشنی کی رفتار'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'کہرے کے پیچھے' ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۲۰۱۴، ص۳۱۹

۵۲۔ ایضاً (کہرے کے پیچھے) ص۳۱۹

۵۳۔ ایضاً (کہرے کے پیچھے) ص۳۳۶

۵۴۔ ''قندیل چیں'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'شربت والی گلی' مرتب، ڈاکٹر جمیل اختر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء ص۲۹۸

۵۵۔ ایضاً (شربت والی گلی) ۳۰۰

۵۶۔ ''قندیل چیں'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'تار پر چلنے والی' مرتب، ڈاکٹر جمیل اختر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء ص۳۰۷

۵۷۔ ایضاً (تار پر چلنے والی) ص۳۱۶

۵۸۔ ''قندیل چیں'' از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'سنگھاردان' مرتب، ڈاکٹر جمیل اختر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء ص۳۲۵

۵۹۔ ایضاً (سنگھاردان) ص۳۲۵

۶۰۔ ایضاً (سنگھاردان) ص ۳۲۶

۶۱۔ ایضاً (سنگھاردان) ص ۳۳۵

۶۲۔ ''قندیل چیں''، از قرۃ العین حیدر، افسانہ 'ایک پرانی کہانی' مرتب، ڈاکٹر جمیل اختر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء ص ۳۴۳

۶۳۔ ایضاً (ایک پرانی کہانی) ص ۳۴۷

☆☆☆

باب سوم

قرۃ العین حیدر کے ناولٹ میں پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل کا تجزیاتی مطالعہ

اردو میں ناولٹ نگاری کو فروغ ۱۹۶۰ء کے بعد ہوا۔اس عہد میں اوراس کے بعد بے شمار ناولٹ لکھے گئے۔تقریباً ادب کے ہر فکشن تخلیق کار نے اس کی طرف توجہ کی مگر ہر کوئی ناولٹ کے فن پر دسترس حاصل نہ کر سکا۔اسی وجہ سے لوگ آج تک ناول اور ناولٹ کے مابین فرق کو لے کر الجھن کا شکار ہیں۔کیونکہ اس کے فن کو سمجھنا ہر کسی کے لیے آسان نہیں ہے۔ناولٹ کا فن نہایت توجہ اور دل سوزی کا متقاضی ہوتا ہے۔مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو ادب میں خوب سے خوب تر ناولٹ لکھے گئے ہیں مگر ان میں چند ہی ناولٹ اپنے فن پر پورے اتر پائے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی ناولٹ نگاری اردو فکشن کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ان کے ناولٹ موضوعاتی پس منظر اور کردار نگاری کے اعتبار سے بہترین تخلیقات ہیں۔قرۃ العین حیدر کے ناولٹ سماج میں پیدا ہونے والے مختلف مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں۔جس میں مشرقی تہذیب کا زوال،نئی تہذیب کا عروج، انسانیت کی بے قدری اور سماج کے طبقاتی نظام کے زیر اثر پسماندہ طبقے کی زندگی میں پیدا ہونے والے مسائل بطورِ خاص ہیں۔قرۃ العین حیدر کی ناولٹ نگاری کے متعلق وضاحت حسین رضوی لکھتے ہیں:

> ”قرۃ العین حیدر، جدید اردو فکشن کی معمارِ اول بھی ہیں اور معمارِ اعظم بھی،مصنفہ پہلی خاتون ناولٹ نگار ہیں جنہوں نے اپنی فنی صلاحیت اور فکری بصیرت نیز تخلیقی صلاحیت کے ذریعے اردو فکشن میں ناولٹ کی روایت کو عام کیا۔اپنی تخلیقات کو ناولٹ کے نام سے منسوب کر کے انہوں نے محققین و ناقدین کو اس صنفِ ادب سے متعلق سوچنے اور سمجھنے کی دعوتِ فکر دی۔شعوری طور پر ناولٹ کے فن و تکنیک کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے اس صنف کے ارتقائی سفر کو تقویت بخشی۔“[۱]

قرۃ العین حیدر کی ناولٹ نگاری میں ناولٹ کے تمام فنی لوازمات موجود ہیں، بلکہ مصنفہ نے اس فن کو صنفِ ادب کا درجہ دلایا۔ان کے ناولٹ میں ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، ''دلربا''، ''چائے کے باغ''، ''سیتا ہرن'' اور''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' ہے۔''ہاوسنگ سوسائٹی''،تقسیم سے قبل ہندوستان سے شروع ہوکر پاکستان کی فضا پرختم ہوتا ہے۔یہ ناولٹ ہندوستان کے پسماندہ کسانوں کی غربت اور ان کی تہذیبی زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔مصنفہ نے مخصوص انداز میں ناولٹ کا پلاٹ تعمیر کیا ہے اور گاؤں کی سماجی ،تہذیبی اور معاشی مسائل کو ہاؤسنگ سوسائٹی میں پیش کیا ہے۔''چائے کے باغ''، قرۃ العین حیدر کا دلکش ناولٹ ہے اس میں چائے کے باغات میں کام کرنے والے مزدوروں کی زندگی اور تقسیم کے دوران اپنے زمین سے کٹ کر 'سلہٹ' میں بے نام سی زندگی جینے والے پسماندہ کرداروں کے سماجی ،سیاسی اور معاشی مسائل کو پیش کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اپنی تخلیقات میں اعلیٰ طبقے کے مسائل کے ساتھ نچلے طبقے کے مسائل کو بھی قابلِ قدر توجہ دی ہے۔''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو''موضوع کے اعتبار سے مصنفہ کا منفرد ناولٹ ہے،اس ناولٹ میں پسماندہ طبقے کے غریب اور مفلس زدہ کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کی تصویر کو پیش کیا ہے۔ناولٹ کے پسماندہ کردار لکھنؤ کی گلیوں میں اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے گانے بجانے کا کام کرتے ہیں۔اور یہی ان کے معاش کا واحد ذریعہ بھی ہے۔ بدلتے وقت کے ساتھ ان کی قسمت تھوڑے وقت کے لئے بدلتی ضرور ہے مگر حالات ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے سب کچھ برباد ہو جاتا ہے۔''دلربا'' ناولٹ بھی نچلے طبقے کی طوائفوں کی زندگی کا بھر پور عکاسی کرنے والا ناولٹ ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ناولٹوں کو تخلیق کر کے ناولٹ کے صنف کو بام عروج عطا کیا۔ان سے پہلے ناولٹ کو اردو ادب میں علیحدہ صنف کی حیثیت حاصل نہ تھی بلکہ ناولٹ کو ناول کا ہی چھوٹا حصہ سمجھا جاتا تھا۔یا اگر ناولٹ کے نام سے لوگ اپنی تخلیقات پیش بھی کر رہے تھے تب بھی ادب میں اس کو مختصر ناول کے نام سے پہ جانا جاتا تھا۔ناولٹ نگاری پر قرۃ العین حیدر کا احسان ہے کہ انہوں نے منفرد اور قیمتی ناولٹ لکھ کر اس کو ادبی درجہ دلایا۔

قرۃ العین حیدر نے پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی ،ان کے حالات اور سماجی مسائل کو افسانوں

کی طرح ناولٹ میں بھی فنی گہرائی اور مخصوص انفرادیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ زمانی اعتبار سے ان کے ناولٹ سیتا ہرن ۱۹۶۰ء، چائے کے باغ ۱۹۶۴ء، ہاؤسنگ سوسائٹی ۱۹۶۶ء، دلربا ۱۹۷۶ء اور اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے مذکورہ ناولٹ سماجی اور معاشرتی حقائق کو پیش کرتے ہوئے ادبی منظرنامے پر اپنا منفرد وجود رکھتے ہیں۔ ان تمام ناولٹ میں مصنفہ نے سماج کے طبقاتی تشخیص کو پیش کرنے کے ساتھ اس وقت کی سماجی، تہذیبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور انسانی رویے کو بڑی خوبی کے ساتھ دکھایا ہے۔

چائے کے باغ:

قرۃ العین حیدر نے ناولٹ ''چائے کے باغ'' ۱۹۶۴ء میں تخلیق کیا۔ پہلی بار یہ ناولٹ رسالہ ''حلقہ ادب''، ممبئی سے شائع ہوا۔ مصنفہ نے خود ہی اس ناولٹ کا انگریزی ترجمہ '' Tea Gaerden of sylhet'' کے نام سے کیا ہے۔ ناولٹ 'چائے کے باغ' ایک دلکش ناولٹ ہے جس میں ناولٹ کے تمام فنی لوازمات پائے جاتے ہیں۔ مصنفہ نے اس میں چند مخصوص واقعات کو مختصر کینوس میں فلیش بیک کی تکنیک کے ذریعے پیش کیا ہے۔

'چائے کے باغ' کی کہانی ۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس چھوٹے سے ناولٹ میں مصنفہ نے زندگی کو لامحدود معنوں میں پیش کیا ہے جس میں بڑی وسیع النظری اور عمیق مشاہدے کا مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اگر صرف کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کو پیش نظر رکھا جائے تو مشرقی پاکستان کے اسٹیٹ سلہٹ میں بسنے والے لوگوں کی زندگی میں رونماں ہونے والے واقعات کو تخلیق کار نے فن کاری کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔

ناولٹ کے مطالعے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اس میں اعلیٰ اور پسماندہ دونوں طبقے کے لوگوں کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ چائے کے باغات کے درمیان رہائش پذیر مختلف افراد کی پیچیدہ زندگی، قدیم وجدید سوسائٹی کے امتزاج کی تصویروں میں لوگوں کا طبقاتی اور نفسیاتی رویہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ سوسائٹی کے تشکیلی

نظام نے انسانی اقدار اور ذہنی فکر کو جس طرح تبدیل کیا ہے اور نتائج میں جو صورتِ حال پیدا ہوئی ہے یہ ناولٹ اس کی وضاحت کرتا ہے۔ ناولٹ کے کرداروں میں راحت کا شانی، صنوبر، زرینہ اور غریب طبقے کی پاربتی اور غفور الرحمٰن کی محبت کی داستان ہے، اس کے علاوہ کئی اور ضمنی کردار بھی ہیں جن کی اہمیت اور انفرادیت سے ناولٹ کا اثر اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ ناولٹ کے متعلق اعجاز الرحمٰن لکھتے ہیں کہ:

> ''بیسویں صدی سے تعلق رکھنے والے ان کرداروں کے ساتھ پچاسوں مسائل ہیں، جن کو اتنی فن کاری سے نمایاں کیا گیا ہے کہ ہر مسئلے کے تمام پہلوؤں سے قاری آشنا ہو جاتا ہے۔ وراثت کا مسئلہ، ماحول کا کردار اور شخصیت پر اس کے اثرات، تقسیم ملک کے بعد پیدا ہونے والے مسائل، نئے دولت مند طبقے کا ابھرنا، جن کی زندگی کا مقصد صرف دولت کمانا ہے۔ زندگی و معاشرے پر اس کے اثرات قدیم اقدار کا زوال، نفسیاتی الجھنیں، امیر و غریب طبقے کی زندگیوں کے بعد صنعتی اور شہری زندگی کے شاخسانے، سرحد کی غیر فطری تقسیم کے ذریعے انسانی دلوں کی تقسیم کی ناکام کوششیں، مغربی پاکستان والوں کی بنگلہ دیشی عوام سے بے تعلقی، برصغیر کی جدید تعلیم یافتہ عورتوں کے مسائل اور اسی دور میں زندگی گزار رہی مزدور طبقے کی عورتوں کے مسائل ان سارے مسائل کا احاطہ، جہاں مصنفہ کی فن کارانہ صلاحیت کی دلالت کرتا ہے، وہیں اس ناولٹ کو بہت گنجلک اور پیچیدہ بھی بنا دیتا ہے۔''[۲]

''چائے کے باغ'' میں قرۃ العین حیدر نے انسانی زندگی میں پیش آنے والے معاشی، معاشرتی اور سماجی مسائل کو بڑی سنجیدگی سے دیکھنے، سمجھنے اور بتانے کی کوشش کی ہے۔ اس ناولٹ میں مصنفہ خود مشرقی پاکستان (موجودہ وقت میں بنگلہ دیش) میں چائے کے باغات میں کام کرنے والے مزدور طبقے کے لوگوں پر مشتمل دستاویزی فلم بنانے گئی تھیں۔ یہاں ان مزدور پیشہ لوگوں سے ملاقات کرنے کے بعد ان سے بات

چیت کی ان کے مسائل دریافت کیے، جس کے بعد ان کے تاثرات، ان کی تہذیب وثقافت، تہوار اور رسوم ورواج کو اصل شکل میں لانے کی کوشش کی ہے۔ اس ناولٹ کے پس منظر میں جن افراد کی کہانی ہے وہ دو مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طبقاتی تقسیم میں ایک طرف امیر طبقہ ہے تو دوسری طرف غریب اور مزدور طبقے کے پسماندہ لوگ۔ پسماندہ طبقے کے یہ فاقہ کش مزدور مشرقی پاکستان اور آسام کی سرحد پر چائے کے باغوں میں مزدوری کرتے ہیں یہ ان کا بنیادی ذریعۂ معاش ہے جس سے ان کی زندگی کا گزر رہوتا ہے۔ ناولٹ کا یہ پسماندہ طبقہ آزادی سے قبل یو پی اور بہار کے مختلف علاقوں سے یہاں معاشی ضرورت اور روزگار کی تلاش میں آیا تھا۔ لیکن تقسیم ہند کے نتیجے میں یہ سارے مزدور بے وطن ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ اب اپنوں سے جدا ہو کر اپنے ہی ملک میں مہاجر کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ 'مس درخشاں' نے ''چائے کے باغ'' کے کرداروں کا تجزیہ کرتے ہوئے طبقاتی تفریق اور پسماندہ کرداروں کی زندگی کے حالات کے متعلق لکھا ہے کہ:

> ''ناولٹ میں امیری اور غریبی کے تضاد کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں پس ماندہ طبقے، چائے کے باغات کے مزدور طبقے کے مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سے سرمایہ داری نظام کے جبر وتشدد کو ان بدحال غریب مزدوروں کے فاقے سے سٹے ہوئے پیٹ، پھٹے ہوئے کپڑوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ غریب طبقے کی پاربتی اپنی مرضی سے اس بنا پر شادی نہیں کر سکتی کیونکہ وہ کسی اور کے نام سے منسوب کی جا چکی ہے اور غفور الرحمٰن جیسے غیر مرد کے بارے میں سوچنا بھی اس کے لیے گناہ ہے۔''[۲۳]

ناولٹ میں موجود پسماندہ طبقے کے کرداروں کی کہانی کو مختصر اور سرسری انداز میں دیکھتے ہیں کہ کس طرح تخلیق کار نے اس طبقے کے موجودہ مسائل اور ان کی زندگی کو پیش کیا ہے؟ اسے اچھے سے سمجھ سکیں۔ چائے کے باغوں میں کام کرنے والے مزدور یو پی اور بہار کے مختلف علاقوں کے باشندے ہیں۔ مزدوروں کا مکھیا رام نندن، مزدوروں کا نمائندہ ہے۔ گلجریا، رام نندن کی بہن وہ اپنے بھائی کے ساتھ مزدوری کا کام کرتی ہے۔ پاربتی اٹھارہ سالہ سانولی لڑکی ہے جو بہت اچھا ناچتی ہے اس کے علاوہ مزدور طبقے میں ترلوچن، سکھ نندن

، رام کرن، اور بس بیتا وغیرہ ہیں۔ مذکورہ تمام کردار کسی نہ کسی پسماندہ حالات سے دوچار ہیں اور یہ لوگ اپنے حالات کو بہتر بنانے اور زندگی کے زوال سے ابھرنے کی کوشش میں وقت کے ساتھ سمجھوتا کیئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان مزدور طبقے کے لوگوں کی ایک پسماندگی یہ بھی ہے کہ ملک کے تقسیم کے بعد برسہا برس یہاں رہنے کے بعد بھی مشرقی پاکستان والے انہیں ہندوستانی اور آسام میں ان کو پاکستانی سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال وہ بے روزگاری، غربت اور خراب معاشی حالات کے ہاتھوں تنگ ہیں اور ان کے سامنے کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا۔

ناولٹ میں زرینہ کا کردار خود مصنفہ کا ہے جو چائے کے باغات میں کام کرنے والے پسماندہ طبقے کے مزدوروں کی زندگی اور ان کے مسائل پر ایک ڈاکومنٹری فلم بنا رہی ہے۔ وہ سلہٹ کے مزدوروں کا انٹرویو لیتی ہے جس سے پسماندہ طبقے پر کیے جانے والے مظالم، استحصال اور دکھ درد نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر مزدوروں کے حالات اور ان کی زندگی کے مسائل کو جاننے کی غرض سے ان کے بارے میں پوچھتی ہے، جس سے ان کی حالاتِ زندگی کی سچائی کھل کر سامنے آتی ہے۔ ناولٹ سے ایک مکالماتی منظر ملاحظہ کریں:

> ''تم لوگ... بارہ بنکی سے آئے ہو یا غازی پور سے؟ کون ضلع سے آئے ہو....؟
>
> ''سیتا پور سے بیگم صاحب....'' مکھیا اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے تعجب اور پریشانی ہویدا تھی۔
>
> ''گھبراؤ نہیں رام نندن۔ تمہاری لکھا پڑھی نہیں ہوگی۔ یہ بٹیا بڑی دور کراچی سے آئی ہیں۔ تم لوگوں کا سینما بنانے۔'' ارسلان بھائی نے کہا۔
>
> ''سلیما۔'' ایک نوجوان نے خوش ہو کر کہا۔
>
> ''پھوٹو کھینچے۔'' عورتوں نے آپس میں سرگوشی کی۔
>
> ''تو کب آئے تم لوگو یہاں؟ میں نے سوال کیا۔
>
> ''بہوت جمانا ہوا۔''

''اتنی دور سلہٹ کیسے آئے؟''

''ای کی کھاتر بٹیا۔''بوڑھے مکھیا رام نندن نے اپنا پچکا ہوا پیٹ بجایا۔''[۴۴]

قرۃ العین حیدر نے مشرقی پاکستان کے جن مزدور پیشہ طبقے کی تصویر کو پیش کیا ہے وہ سماجی اور سیاسی اعتبار سے غور طلب ہے۔ تقسیم کے سانحے نے بٹوارے کے ساتھ ساتھ انسانی اقدار کی پامالی کو بھی جنم دیا تھا، جس کے بعد انسانی زندگی کی اہمیت اس کی علاقائی پہچان پر منحصر ہوگئی تھی، جس کا ناولٹ کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مصنفہ نے اس زمانے کے مشرقی پاکستان اور آسام کے سرحدی علاقوں کے موجودہ حالات کو موضوع بنا کر ان پسماندہ طبقے کے مسائل کو پیش کیا ہے جو آسام اور مشرقی پاکستان میں لایعنی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ تمام کردار محنت ومشقت کر کے چند وقت کی روٹی پانے کی بمشکل کوشش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ پسماندہ طبقے کے غریب اور مفلس زدہ لوگوں کے لیے بھوک ایک اہم مسئلہ ہے جس پر قرۃ العین حیدر نے نہایت فن کاری اور حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔

اس ناولٹ میں تصویر کا دوسرا رخ یعنی دوسری کہانی بے یار و مددگار، غریب مزدور چوکیدار رام پرساد اور اس کی بیٹی کی ہے۔ پاربتی کا کردار مشرقی مزدوروں سے تعلق رکھتا ہے جو جاہل اور گنوار ہے۔ پاربتی جہاز پر چائے لادنے کا کام کرتی ہے۔ جہاں اس کی ملاقات غفور میاں سے ہوتی ہے اور یہ ملاقات عشق کی جذباتی کیفیت میں بدل جاتی ہے۔ لیکن پاربتی کی منگنی اس کے باپ سے بڑے عمر کے شخص سے ہوچکی ہے اس لیے پاربتی اور غفور میاں کی شادی ممکن نہیں ہے۔ پاربتی عشق کے جذباتی کیفیت میں گرفتار ہے وہ غفور میاں کے ساتھ بھاگنے کے لیے بھی تیار ہو جاتی ہے، یہ اس کے لیے بڑا جذباتی فیصلہ ہے۔ پاربتی کا غفور میاں کے ساتھ اپنے خاندان اور برادری کو چھوڑ کر بھاگنے کا فیصلہ اس کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ میں بہت بڑی بغاوت ہے۔ وہ بے بس اور لاچار تو ہے لیکن اپنے فیصلے پر آخر دم تک قائم رہتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے انسانی کیفیت کا اظہار جس دانشمندی کے ساتھ کیا اس کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ناولٹ کے تمام پہلوؤں کو غور سے دیکھا جائے تو یہاں امیر اور غریب طبقے کے حقوق پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ جہاں اعلیٰ طبقے کی صنوبر شادی شدہ ہونے کے بعد بھی قاسم سے بہ آسانی شادی کر لیتی ہے وہیں پاربتی

صرف کسی کے نام منسوب ہونے کی وجہ سے غفور الرحمٰن سے شادی نہیں کرسکتی۔ کیونکہ اس کا تعلق غریب طبقے سے ہے۔ سماج کا طبقاتی نظام پسماندہ طبقے پر زیادہ عائد ہوتا ہے اس لیے عزت کی پاسداری کرتے ہوئے پاربتی کو اپنے من پسند زندگی گزارنے کا حق حاصل نہیں۔ پاربتی اور غفور الرحمٰن زبردست سماجی شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں یہاں سے ان کے لیے فرار ممکن نہیں۔ افسانے کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشرقی تہذیب کے تمام فرائض غریب پاربتی کے کاندھوں پر لدے ہوئے ہیں۔ کیونکہ سماج کی تمام بندشیں، اخلاقیات اور روایات کی پاسداری صرف اور صرف غریب طبقے کے پسماندہ لوگوں تک ہی محدود ہوکر رہ گئیں ہیں۔ یہ اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کی نمائندگی کرنے والا دلکش ناولٹ کہا جاسکتا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے پاربتی کے احساس پر سماجی تہذیب کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ پاربتی اور غفور الرحمٰن کے حوالے سے جس چوپال کے پنچایتی فیصلے کو قرۃ العین حیدر نے دکھایا ہے وہ غریب مزدوروں کی بستی کا ہے، یہ بستی پسماندہ طبقے کے رام نندن اور پاربتی جیسے لوگوں کی ہے۔ مصنفہ نے جس طرح سے پنچایت اور پنچائتی قانون کے بارے میں لکھا ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرۃ العین حیدر کو وہاں کے مزدوروں کی سماجی اور اصولی زندگی کے بارے میں اچھی خاصی معلومات تھی۔ مزدوروں کی زبان اور انداز بیان کو اس طرح سے ترتیب دیا ہے کہ ساری چیزیں ایک کڑی کی طرح دکھائی دیتی ہیں اور یہی مصنفہ کا تخلیقی طرۂ امتیاز بھی ہے۔ وہ جہاں اور جس منظر کو بیان کرتی ہیں اس کی حقیقت سے واقفیت کے بعد ہی فن پارے میں جگہ دیتی ہیں۔

ناولٹ ''چائے کے باغ'' پر بعض ناقدین ادب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مصنفہ کو غریب اور مزدور طبقے کے پسماندہ لوگوں کی زندگی پر جس قدر تفصیل سے لکھنا چاہئے تھا نہیں لکھا۔ اس حصے میں غفور الرحمٰن میاں اور پاربتی کی کہانی کو تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت تھی جو نہیں کیا گیا۔

جب ہم ناولٹ کے مطالعہ کے بعد تمام پس منظر کو یکجا کرکے اس کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ تخلیق کار نے کسی مخصوص فرد کی ترجمانی نہیں کی ہے بلکہ اس ناولٹ میں مشرقی یوپی کے غریب اور مزدوروں کا المیہ پیش کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ناولٹ میں انگریزی دور حکومت کے پس منظر بھی پیش کیے ہیں کہ کیسے انگریز ہندوستان کے مزدور اور پسماندہ طبقے کا استحصال کرتے تھے؟ آزادی سے قبل انگریزوں نے

ہندوستان کے غریب پسماندہ لوگوں کو کس طرح دوسرے ممالک بھجوا کران پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے، ان کوغلام بنائے رکھا، اس کے بعد ان کے بچوں سے بھی وہی مزدوری کرواتے رہے۔ انگریزوں نے ہمیشہ کے لیے انہیں نوکر اور قیدی بنالیا اور اس طرح ترقی کے تمام دروازے ان پر بند کر دیے تاکہ ان کی حالت بہتر نہ ہو سکے۔ ناولٹ کا اقتباس ملاحظہ کریں:

''صاحب لوگ کاشی اور کلکتے جاتا تھا۔ مجوری بھرتی کرنے۔ اس نے جنگل مابندوبست کیا۔ دکھل کیا۔ پھر سردار لوگ۔''

''سردار لوگ مزدوروں کے ہیڈ مین تھے۔ گرگے...'' ارسلان بھائی نے مکھیا کی بات کاٹ کر مجھ سے وضاحت کی۔ ''سوسال قبل انگریزوں نے مشرقی یو، پی۔ کے بھوکے ننگے کسانوں کو اپنے گرگے کے ذریعے یہاں بلوایا تھا۔ یہ گرگے یا سردار انگریزوں کا دیا ہوا روپیہ خود رکھ لیتے تھے اور مزدوروں کو صرف دووقت کی روٹی دیتے تھے۔''

ارسلان بھائی کی بات سن کر مکھیا نے سر ہلایا اور کہنا شروع کیا۔ ''سردار لوگ ہمرے باپ دادا کو روٹی کپڑے کا لالچ دے کر ادھر لے آیا۔ او جمانے میں ریل کا رستہ نہ رہی۔ ہمرے باپ دادا ماٹی کاٹے رہن۔''[۵]

قرۃ العین حیدر نے ''چائے کے باغ'' میں کہانی اور کردار سے زیادہ فضا اور ماحول کو اہمیت دیا ہے اسی وجہ سے ناولٹ کا پلاٹ غیر منظّم ہے، کئی کہانیاں ایک ساتھ چلتی ہیں۔ ناولٹ میں کوئی ہیرو ابھر کر سامنے نہیں آتا اور نا ہی کہانی کسی ایک مرکزی کردار کے اردگرد گھومتی ہے۔ اس ناولٹ میں کرداروں کی بہتات ہے، جس سے ناولٹ کا روایتی فن مجروح ہوگیا ہے۔ دراصل مصنفہ نے کسی شخص کی زندگی پر کہانی کا پلاٹ ترتیب نہیں دیا ہے بلکہ ملک کی تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان اور آسام کے پسماندہ طبقے کی زندگیوں کو موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر نیلم فرزانہ نے ناولٹ کے حوالے سے اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کی مختلف طبقاتی زندگیوں کا تقابلی تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''چائے کے باغ'' میں دوطبقوں کی زندگی کو پیش کرنے سے فن کار کا
مقصد ان کا تضاد پیش کرنا نہیں ہے بلکہ وہ ان دوطبقوں کے افراد کی
زندگیوں کے وسیلے سے زندگی کی تفہیم چاہتا ہے۔ جب وہ ان کا مطالعہ
کرتا ہے تو اسے کچھ افراد کی زندگیاں تضادات سے بھری ہوئی، لا
مرکزیت اور روحانی کھوکھلے پن کا شکار نظر آتی ہے۔ راحت کا شانی،
صنوبر، قاسم، واجد اس تضاد کے نمائندے ہیں۔ یہ محبت کرتے ہیں لیکن
اپنی محبت کو لباس کی طرح بدلتے ہیں۔ ان کا کوئی اخلاقی معیار نہیں۔ وفا
دوستی اور اعتماد ان کے لیے بے معنی الفاظ ہیں۔ یہ اپنی موہوم آرزوؤں کی
تلاش میں اپنی شناخت کھو کر بے چہرہ ہو چکے ہیں، دوسری طرف غریب
طبقہ ہے۔ دو محبت کرنے والے دل ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے قربانی
دینے کی تمنا کرتے ہیں لیکن ان کی محبت حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو
جاتی ہے۔''[۶]

آزادیِ ہند اور تقسیم کے بعد جدید تہذیب اور بدلتے حالات کے پیش نظر مشرقی تہذیب میں جو تبدیلی آئی تھی، اسے راحت کا شانی کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ راحت کا شانی جو پہلے محمودہ تھی، واجد کے دھوکے کے بعد دردر بھٹکتی ہے۔ بہت جلد راحت کا شانی ہجر و فراق سے نکل کر دولتِ عیش و گلیمر کی دنیا میں پناہ لیتی ہے۔ ظاہر ہے راحت کا شانی کی یہ تبدیلی حالات کے سبب ہے۔ اب وہ ایک ماڈرن طوائف بن چکی ہے، گویا اس کی زندگی اور اس کا مزاج آوارہ بن گیا ہے۔ جنسی تلذذ، جنسی بے راہ روی اور حصول زر کی تلاش اس کا پیشہ بن چکا ہے۔ دراصل عشق میں ناکامی کے بعد راحت کا شانی کی زندگی تہذیبی اور ثقافتی زوال کا شکار بن جاتی ہے۔ لہٰذا وہ سماج میں پبلک سیکٹر کی طوائف کی حیثیت سے مشہور ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اس دورِ زندگی کے تلخ و شریں دونوں طرح کے حقائق کو موثر انداز سے نہ صرف پیش کیا ہے بلکہ بڑا ہی واضح انداز میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کو ابھارا ہے۔ سابق الذکر پسماندہ طبقے

کے لوگوں کی زندگی کے پیش کش کے حوالے سے اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس ناولٹ میں مصنفہ نے ان کے حالات اور المیاتی احساس کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ لوگ اپنوں اور اپنی زمین سے دور ہو کر در بدری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ملک تقسیم کے بعد انہیں کسی ملک نے جگہ نہیں دی، ان کے اپنے بے گانے ہو گئے اور وہ دوبارہ کبھی اپنے گھر بھی نہیں جا سکے۔ آج بھی یہ سرحدی لوگ ہمہ وقت موت کے نشانے پر ہوتے ہیں۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'چائے کے باغ' میں قرۃ العین حیدر نے صنعتی دور کی زندگی کی بدحالی، بداخلاقی، بدکرداری اور نفسیاتی کشمکش کے شکار لوگوں کی تباہ حالیوں کی عکاسی فن کارانہ انداز میں کی ہے۔ ناولٹ میں قرۃ العین حیدر نے جتنے بھی کردار تراشنے کی کوشش کی ہے وہ سب اپنے طبقے، اپنے ماحول اور حیثیت کے اعتبار سے بہت حد تک مختلف ہیں لیکن ان کی ذہنی و فکری پرواز ایک جیسی ہے۔ ان میں مذہب، فلسفہ، روایت اور سماجی بندشوں سے بغاوت اور اس کے خلاف کسی نہ کسی شکل میں احتجاج بھی موجود ہے۔ یہ تمام کردار اپنی صلاحیت کے اعتبار سے ناساز گار حالات کا مقابلہ بھی ڈٹ کر کرتے نظر آتے ہیں۔

اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو:

قرۃ العین حیدر کا ناولٹ ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' ۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ناولٹ رسالہ ''بیسویں صدی'' دلی سے ۱۹۷۷ء میں قسط وار شائع ہوا۔ یہ چار قسطوں میں مکمل ہوا۔ ۱۹۷۹ء میں قرۃ العین حیدر نے اس کا انگریزی میں ترجمہ ''A Woman life'' کے نام سے کیا لیکن انگریزی کے بالمقابل اردو میں اسے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے اس ناولٹ کی تعریف میں لکھا ہے کہ:

> ''میرے خیال میں میرا جو سب سے اچھا ناولٹ ہے وہ آپ لوگوں نے پڑھا ہی نہیں اور وہ ہے ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو۔'' [۷]

''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' پسماندہ طبقے کے دو کرداروں کی داستان حیات پر مشتمل ہے۔ ناولٹ کے مرکزی کرداروں میں رشک قمر اور جمیلن کا تعلق پسماندہ طبقے سے ہے۔ یہ طبقہ سماج کے تفریقی نظام کا وہ

حصہ ہے جو پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے اعلیٰ طبقے کے مہذب اور تعلیم یافتہ سماج کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔لیکن پوری زندگی جفاکشی کرتے ہوئے ان کرداروں کی زندگی میں سوائے ایک رکشہ والے کے کوئی ان کا خیر خواہ نظر نہیں آتا جو خود ہی ان کا محتاج بھی ہے۔

اس ناولٹ کا عنوان ایک لوک گیت کا ٹکڑا ہے۔اس عنوان سے ناولٹ کی پوری توجہ عورت کی اس التجا پر مرکوز ہے جو تخلیق کائنات کے بنائے اصول پر سوال کرتی ہے کہ ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو؟'' یہ سوال ناولٹ کے پس منظر پر پسماندہ طبقے کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلوؤں کو عیاں کرتا ہے جس سے اس طبقے کی حقیقی زندگی واضح ہوتی ہے۔عورت کا احساس فکر دنیا کے لیے ایک سوالیہ نشان ہے۔قرۃ العین حیدر نے عورت کے اس جذباتی لمحے کو بڑی فن کاری سے نبھایا ہے۔ناولٹ کے پسماندہ کرداروں کی زندگی کے متعلق اعجاز الرحمٰن لکھتے ہیں کہ:

> ''قرۃ العین حیدر کا یہ ناولٹ ان کے دیگر ناولٹ سے ان معنوں میں مختلف ہے کہ اس میں سماج کے بے حد پسماندہ، بے گھر، بے سہارا اور روٹی روٹی کے لیے محتاج لڑکیوں کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے اور خاص طور سے اس سلسلے کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایسی لڑکی کی زندگی کے تجربات و مشاہدات کو بھی سمیٹ لینے کی کوشش کی گئی ہے جو بے سہارا، بے گھر ہونے کے ساتھ ساتھ اپاہج بھی ہے۔ناولٹ کے نمایاں کرداروں میں رشک قمر، جمیل النساء، موتی اور ماہ پارہ ہیں۔'' ۸

ہندوستان کے طبقاتی پس منظر میں یہ ناولٹ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس میں قرۃ العین حیدر نے پسماندہ طبقے کے مسائل کو فنی گرفت کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس میں ناولٹ کے تقاضے کے تحت زندگی اور سماج کے کئی مسئلے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو کرداروں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' جس وقت تخلیق کیا گیا اس وقت آزادی کے بعد ہندوستان میں ایک نیا طبقہ اپنا قدم جما چکا تھا۔اس دور کے سماجی، معاشی، تہذیبی واخلاقی اقدار کو پسماندہ طبقے کی مفلس زدہ عورت کے ذریعے نمایاں کیا گیا ہے۔

ناولٹ ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو''میں قرۃ العین حیدر نے ایسے افراد کی زندگی کو موضوع بنایا ہے جو اقتصادی اور سماجی لحاظ سے دبے کچلے پسماندہ طبقے کے لوگ ہیں۔اودھ کے زوال آمادہ معاشرے میں یہ ہندوستان کی مجبور، مفلس اور کچلی ہوئی خاندان کی داستان ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔مصنفہ نے اس ناولٹ کے پسماندہ کرداروں کے احساس اور جذبات کے اندر اتنا دکھ درد بھر دیا ہے کہ ان کی داستانِ حیات پڑھ کر دل دہل سا جاتا ہے۔

ناولٹ کا مرکزی کردار رشکِ قمر (امرتی) کی زندگی کے پیچ وخم سے ہی ناولٹ کے بنیادی مسائل سامنے آتے ہیں اور پلاٹ کی تعمیر ہوتی ہے۔یہ ایک نچلے طبقے کا خاندان ہے۔اس خاندان میں رشکِ قمر کے علاوہ دق زدہ ہرمزی خالہ، جمّن خان عرف کانٹرے بھانڈ اور اپاہج بہن جمیلن (جلیبی) ہے۔زمانے کی گردش اور نامساعد حالات نے ان لوگوں کو خانہ بدوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا ہے۔ان کے گھر میں کوئی مرد موجود نہیں ہے اس لیے ان لوگوں نے گانے بجانے کا پیشہ اختیار کیا ہے۔یہ لوگ مختلف جگہوں پر ڈیرا ڈال کر، گا بجا کر اور تماشے دکھا کر اپنی زندگی کا گزر بسر کرتے ہیں۔دراصل ناولٹ کا مقصد فرد کا وہ اقتصادی مسئلہ ہے جس کے لیے رشکِ قمر اور جمیلن النساء پوری زندگی جدو جہد کرتی ہیں لیکن ان کی زندگی میں کسی طرح سے کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے۔لہٰذا وہ غریب اور مفلوک الحال زندگی گزارتے ہوئے آخر کار موت کے آغوش میں چلی جاتی ہیں۔

اس ناولٹ کے پسماندہ کرداروں کی زندگی اور ان کے حالات کی تبدیلی کو اختصار سے دیکھا جائے تو رشکِ قمر کی خالہ تلاش معاش میں سب کو شہر لکھنو لے کر آتی ہے۔لکھنؤ میں یہ سارے لوگ ڈپٹی صاحب کی حویلی 'فرقان منزل' کے تہہ خانے میں کرایے پر رہتے ہیں۔ڈپٹی صاحب کے صاحبزادے فرہاد میاں رشکِ قمر کے حسن اور اس کی آواز دونوں سے متاثر ہوتے ہیں۔رشکِ قمر کی زندگی میں سب سے پہلے فرہاد میاں آتے ہیں جو ''کیریر بنانے'' کے نام پر اس کا خوب استحصال کرتے ہیں۔لیکن بیوی کے طور پر رشکِ قمر کو قبول نہیں کرنا چاہتے۔یہاں تک کہ فرہاد میاں سے دو اولادیں بھی ہوئی ہیں لیکن فرہاد میاں نے رشکِ قمر پر الزام لگاتے ہوئے شادی سے انکار کر دیا۔ذیل میں اقتباس ملاحظہ کریں:

''اس طبقے کی چھوکریوں کے پاس بلیک میل کا یہ سہل ترین نسخہ ہے، کسی آئے گئے کی اور کسی مالدار شناس کے سر منڈھ دی۔ قمرن کے پاس ثبوت کیا ہے۔''[۹]

مذکورہ اقتباس سے سماج میں پسماندہ طبقے کی زندگی اور اس کی بے قدری کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ فرہاد میاں کے توسط سے رشکِ قمر کی ملاقات ورما صاحب سے ہوتی ہے اور وہیں سے رشکِ قمر کی زندگی میں ایک بڑی تبدیلی آتی ہے۔ اس کی شہرت کے چرچے ہر خاص و عام تک پہنچ جاتے ہیں۔ رشکِ قمر ترقی کی منزل حاصل کرتے ہوئے ورما صاحب کے بعد مختلف لوگوں سے ملتی ہے، انہیں میں ایران سے آیا ایک آغا شب آویز ہمدانی بھی ہے جس نے رشک قمر کو شادی کا لالچ دے کر پھانس لیا ہے۔ ہمدانی کے متعلق جمیلن اپنی بہن کو مشورہ دیتی ہے اور کہتی ہے ''شکردان، چائے دان، ہمہ دان معقول۔ بس ذرا خیال رکھنا کہ کہیں یہ بھی نہ چونا لگائیں''، رشک قمر عزت کی زندگی گزارنے کی خواہش میں آغا ہمدانی کے دھوکے میں آجاتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ ہمدانی، شادی کر کے اپنے ساتھ لے جائے گا لیکن آغا ہمدانی رشک قمر کا جنسی اور جسمانی استحصال کرنے بعد اسے زندگی کے دوراہے پر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

رشکِ قمر نے ہمدانی کی یاد میں اور اس کی نشانی ماہ پارہ کے سہارے زندگی کے سولہ سال انتظار میں کاٹے، بالآخر ناامید ہو کر اس کی تلاش میں کراچی گئی۔ لیکن اس کے حصے میں صرف مایوسیاں اور ناکامیاں ہی ہاتھ آئیں۔ وہ بیٹی جس کے مستقبل کی خاطر اس نے بڑے بڑے مصائب اٹھائے، دردر کی ٹھوکریں کھائیں وہ کراچی کے انڈر ورلڈ دنیا کی چکا چوندھ میں کھو گئی اور بیٹا بھی بمبئی کے انڈر ورلڈ کا شکار ہو گیا۔ رشکِ قمر کراچی سے ناکام واپس لوٹ آتی ہے۔ اس کی اپاہج بہن جمیلن اس کا انتظار کرتے کرتے موت کے آغوش میں جا چکی تھی۔ رشکِ قمر نے یہاں واپس آ کر اپنی پچھلی زندگی میں لوٹنے کی کوشش کرتی ہے، وہ اپنے ان پرانے شناساؤں سے ملتی ہے جو ایک زمانے میں اس کی راہ میں پلکیں بچھاتے تھے لیکن اب وہ حسن و جوانی سے محروم تھی، نتیجہ ظاہر تھا سب نے نگاہیں پھیر لیں۔ مجبوراً اب اس نے جمیلن کے ٹھیکیدار سے چکن کاڑھنے کا کام منگوانا شروع کر دیا، رشک قمر اب اپنا ماضی یاد کر کے اکثر رونا شروع کر دیتی تھی۔

''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' کی ابتداء میں پسماندہ طبقے کے چاروں فاقہ کش ہنڈے شاہ کے مزار پر قوالی گاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہنڈے شاہ کے دربار میں پسماندہ طبقے کے غریب اور مفلس اپنی منت وسماجت کے لیے آتے ہیں، یہاں رشک قمر اور اس کے اقاربین اپنے مخصوص انداز میں ہنڈے شاہ داتا کی توصیف بیان کرتے ہیں اور سامعین ان کے بیان کے آگے مبہوت بیٹھے ہیں۔ قوالی ختم ہونے کے بعد رشکِ قمر امداد کے غرض سے افلاس زدہ سامعین کی طرف آنچل پھیلائے کھسکے ڈبل۔ کھسکے ڈبل کہتی جاتی ہے، غریب سامعین اس کی طرف ایک آنے دوآنے اور اٹھنّی چونی پھینکتے ہیں، رشکِ قمر مایوسی سے پیسوں پر نظر ڈال کر ان کو اپنے دوپٹے میں سمیٹ کر بے اختیار رو پڑتی ہے۔ کیونکہ اس کو صرف ساڑھے نو روپے کی ہی آمدنی ہوئی تھی جو اس خاندان کے تمام افراد کے پیٹ کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے ناکافی تھے۔ ہنڈے شاہ کے دربار میں امید سے کم ملے پیسوں کے تعلق سے مصنفہ نے کانٹرے بھانڈ کے جذبات کو اس طرح بیان کیا ہے:

> ''کانٹرے بھانڈ چلتے چلتے ایک لمبا سانس لے کر درگاہ کو مخاطب کرتا ہے..... ''واہ پیر ہنڈے شاہ.....بڑی آس مراد لے کر آپ کے دربار میں آئے تھے.....ملا کیا....نو روپے سوا چھ آنے.....'' [۱۰]

قرۃ العین حیدر نے پسماندہ طبقے کے غریب افرادوں کی زندگی اور ان کے مسائل کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہنڈے شاہ پیر کے دربار سے کم پیسے ملنے کے بعد جمیلن اور کانٹرے بھانڈ دونوں مایوس ہو جاتے ہیں مفلس زدہ لوگ اپنی حالت سے بعض اوقات اس حد تک مایوس ہو جاتے ہیں کہ وہ کفر کا راستہ بھی اختیار کر لیتے ہیں، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مایوسی کفر ہے۔ جب انسان افلاس کی وادی میں بری طرح پھنس جاتا ہے تو اسے اپنے چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے اور جب مایوسی حد سے زیادہ پیدا ہو جائے تو اس کا خدا پر سے بھی اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ بعض اوقات تو ایسی نوبت آجاتی ہے کہ لوگ اپنا مذہب تک تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس مذہب نے ہمیں کیا دیا؟ مصنفہ نے جمیلن کا کردار بھی اسی پس منظر میں دکھایا ہے۔ زندگی سے مایوس جمیلن عیسائی مذہب اپنانے کے لیے تیار ہے۔ مذہب کی تبدیلی کے متعلق جمیلن اپنے خالہ سے کہتی ہے کہ کیوں نا ہم عیسائی مذہب اپنا لیں تا کہ ہماری مشکلیں تمام ہو جائے اور آگے

آنے والی زندگی بہتر سے بہتر ہو جائے۔اس سے متعلق ناولٹ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''افضل گڑھ میں عیسائیوں کا مشن تھا۔ایک دفعہ انہوں نے اشارتاً ہم سے کہا کہ تم سب عیسائی ہو جاؤ اور ہماری تبلیغی ٹولی میں شامل ہو کر گاؤں گاؤں اسی طرح یسوع مسیح کے بھجن گاؤ تو تمہارا علاج بھی کرا دیں گے۔ اسکول کالج پڑھا بھی دیں گے۔میں نے خالہ سے کہا، ہو جاؤ عیسائی۔ خدا نہ یہاں ہے نہ وہاں، فرق کیا پڑتا ہے۔تمہارا اور میرا علاج تو ہو جائے گا۔بجیا اسکول میں داخل ہو جائے گی۔ان کی زندگی بن جائے گی۔''[۱۱]

جمیلن جسمانی اعتبار سے کمزور ہونے کے سبب زندگی کے بدترین حالات سے دوچار نظر آتی ہے۔ ناولٹ میں پسماندہ طبقے کے کردار کے حوالے سے جمیلن کا کردار کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔اس کی پہلی وجہ عورت ہونا، دوسرا اپاہج اور تیسرا سماج کا وہ نچلا طبقہ جسے معاشرے میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔قرۃ العین حیدر نے جمیلن کے ساتھ دنیا کا تلخ اور اذیت ناک پہلو نمایاں کیا ہے۔ایک تو عورت ہونا ہی پسماندگی کا سبب ہے اوپر سے اپاہج۔غربت کی وجہ سے اس خاندان کو جو مشقت اٹھانی پڑتی ہے جمیلن کی ذات اس میں مزید اضافہ کرتی ہے یہ خاندان ایک ایک روٹی کا محتاج ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اس ناولٹ میں دورِ جدید کے پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل کے ساتھ ان کے نا آسودہ خواہشات کو بھی بیان کیا ہے۔ناولٹ کے تینوں کردار رشکِ قمر، جمیل النساء بیگم اور صدف آرا بیگم دیگر کرداروں کی نسبت زیادہ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔جن کا تعلق سماج کے پسماندہ طبقے سے ہے۔یہ تینوں اپنے افلاس کے بدولت اپنی ضروریات کو پورا نہیں کر پاتیں۔وہ اپنی بہتر زندگی کے لیے ایک نئے سفر کا آغاز بھی کرتی ہیں، رشکِ قمر اور جمیلن اپنی شریں آواز کے باعث شاعرہ اور ریڈیو گلوکارہ بن کر چند سال خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے بعد مفلسی کے اسی خول میں واپس آ جاتی ہیں۔زندگی کے آغاز سے لے کر اختتام تک یہ غریب ہی رہتی ہیں۔اپنی اسی غربت سے نجات پانے کے لیے رشکِ قمر ہمیشہ کوشش کرتی ہے

لیکن اس کی کوششیں کسی طور سے کامیاب نہیں ہوتی بلکہ ان لوگوں کا ہر جگہ استحصال ہوتا ہے۔ رشکِ قمر اپنی مفلسی سے تنگ آکر کہتی ہے کہ:

اورے بدھا تا بنتی کروں توری پنیاں پڑوں بارم بار
اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو چاہے نرک دیجو ڈار

رشکِ قمر کی زندگی مختلف عروج وزوال، جدوجہد اور ماضی وحال میں الجھی ہوئی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کی بہن جمیل النساء عرف جل بالا لہری بہت صاف دل اور خوددار تھی، وہ ورما صاحب اور آغا فرہاد جیسے دولت منداور امیر لوگوں کی حرکتوں سے بے زار رہتی تھی۔ جمیلن نے صدف اور رشکِ قمر سے ان امیرزادوں کے عارضی وعدوں پر ہمیشہ سمجھایا تھا کہ یہ مطلب پرست لوگ ہیں چند دن ساتھ رہنے کے بعد ان کا ساتھ ''دلی دوراست'' کی مثال بن جائے گی۔ لیکن قسمت کا لکھا کون بدل سکتا تھا۔ رشکِ قمر کی زندگی میں پے در پے کئی مرد آتے ہیں مگر کوئی بھی اس کی غریبی اور مفلسی کا ساتھی نہیں بنتا سوائے ایک رکشے والے بفاتی کے۔ جس نے جمیلن اور رشکِ قمر کی مشکل وقت میں مدد کی۔ جب جمیلن اپنی بیماری سے یکدم بے حال ہوگئی تب بفاتی ہی اس کو دووقت کی روٹی گھر کے کرائے کے بدلے دیتا تھا۔ مگر جمیلن اس خوف سے کہ کہیں اس کے پیٹ بھر کھانا کھالینے سے بفاتی کے بچے بھوکے نہ رہ جائیں جمیلن صرف چند نوالے ہی کھاتی تھی۔ آخری وقت میں جمیلن نے بفاتی اور اس کی بیوی بچوں کے لیے اپنے دوا علاج کے پیسے دے کر انسان دوستی کا ثبوت دیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''جیسا عنوان سے واضح ہوتا ہے۔ یہ ایک دل دہلانے دینے والی داستانِ حیات ہے دوغریب عورتوں کی۔ ایک رشکِ قمر دوسری جمیلن، جو رئیس، مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کی بھری دنیا میں پیٹ پالنے کے لیے بے انتہا جفاکش کرتی ہیں اور گرچہ بعض امرا بھی کبھی کبھی کچھ نہ کچھ ان کی مدد کرتے ہیں یا کرنی چاہتے ہیں مگر ایک رکشے والے کے سوا کوئی صحیح معنی میں ان کا دمساز نہیں۔ وہ بے چارہ خود تنگ دست اور پریشان

ہے اور جمیلن جیسی مفلوج عورت اپنی دوا اور غذا تک کو نظر انداز کر کے
اس غریب کے لیے ایثار کرتی ہے، یہاں تک کہ مر جاتی ہے مگر زندگی
کے آخری سانس تک اتنی غیور اور خوددار رہتی ہے کہ کسی مخلص اور بہی خواہ
رئیس زادے کی بھی کوئی امداد قبول نہیں کرتی۔''۱۲

مذکورہ ناولٹ میں قرۃ العین حیدر نے نہ صرف پسماندہ طبقے کے افراد کے استحصال کو بیان کیا ہے بلکہ ان کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی بھی کی ہے۔ مصنفہ نے پسماندہ طبقے کے لوگوں کی مجبور زندگی کو پیش کرتے ہوئے معاشرتی نظام کی بے پرواہی اور آغا شب و فرہاد جیسے اعلیٰ طبقے کے لوگوں کی بے غیرت رویے کے اوپر سے نقاب بھی اٹھایا ہے۔ ناولٹ کا ایک اور کردار نریندر ورما کا ہے جو بظاہر عورتوں کی آزادی اور حقوق نسواں پر لمبی لمبی تقریریں کرتا ہے مگر عملی طور پر مجبور اور بے سہارا عورتوں کا استحصال کرتا ہے:

''ورما صاحب نے ہمیشہ اسی طرح بڑی اونچی اونچی باتیں کیں مگر خود
صدف سے بیاہ نہ کیا۔ ایسی وفادار عورت جس نے بیس ۲۰/۲۱ برس ان
کے پاؤں دھو کر پیئے کسی دوسرے پر نظر نہ ڈالی اسے انھوں نے پچھلے
دنوں جوتی کی طرح اتار پھینکا۔''۱۳

صدف اتنے لمبے عرصے تک ورما صاحب کی خدمت کرتی رہی۔ مگر اس کی خدمت بے کار چلی جاتی ہے کیونکہ ورما جی ایک دولت مند عورت سے شادی کر کے عیش کرتے ہیں۔ ایک طرف ورما شادی کا وعدہ کر کے صدف سے اپنا کام نکالتے ہیں۔ وہیں صدف جیسی مخلص عورت بنا کسی مفاد کے وفا کرتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ناولٹ میں ورما صاحب جیسے سوسائٹی کے مفاد پرست اور صدف آرا جیسی پسماندہ طبقے کی سادہ دل لوگوں کے ذہنی و جذباتی تفریق کو بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہے۔ دراصل مصنفہ نے پسماندہ طبقے کی عورت کے سماجی استحصال اور طبقاتی تضاد کو پیش کیا ہے جو اس وقت معاشرے میں موجود تھیں۔

مفلسی اور غریبی ایک ایسی بلا ہے جس کے ہاتھوں کتنے ہی لوگوں کی زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اسی کی زد میں شریفین بھی آجاتی ہے جو محنت مزدوری کر کے اپنی بیٹی کی شادی کرتی ہے۔ مگر اس کے سسرال

والے اس کو گنڈوں سے مروا کر اور پولیس کو کھلا پلا کر معاشرے میں آزاد گھومتے ہیں اور شریفین سوائے خاموشی اختیار کرنے کے کچھ نہیں کر سکتی۔ اسی مفلسی کا شکار ہو کر جمیلن دنیا سے روٹھ کر اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملی، وہ اپاہج ہونے کے بعد بھی غریبی میں اپنی عزت اور غیرت کا سودا نہیں کرتی بلکہ زندگی کے تمام مصائب برداشت کرتی ہے مگر لوگوں سے مصالحت نہیں کرتی، یہ اتنی خوددار ہے کہ ازراہِ ہمدردی آ گا فرہاد کچھ مالی امداد کرنا چاہتے ہیں تو یہ ان کی کوئی مدد نہیں لیتی۔ جمیلن، رشک قمر، ماہ پارہ، صدف، خالہ ہرمزی، شریفین اور اس کی بیٹی یہ پسماندہ طبقے کے تمام افراد اپنا پیٹ پالنے کے لیے زمانے کے تھپیڑے کھاتی نظر آتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ناولٹ میں ایک بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ ہرنا چنے، گانے والی طوائف نہیں ہوتی۔ وہ لوگوں کے سامنے ضرور جاتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ جسم فروشی کا کام کرتی ہو۔ گھر گھر جا کر درباروں وغیرہ پر گا، بجا کر مانگنے والیاں ضروری نہیں کہ پیشہ ور طوائف ہی ہوں۔ ہوسکتا ہے پسماندگی اور مفلسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسا کر رہی ہوں، جس طرح اس ناولٹ میں ہرمزی خالہ اور جمیلن کا کردار ہے۔ یہ لوگ اپنے بھوکے پیٹ کو بھرنے اور گھر چلانے کے لیے گھوم پھر کر گانا بجانا شروع کر دیتی ہیں۔ ناولٹ میں مصنفہ نے خانگی زندگیوں کو بھی پیش کیا ہے جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مصنفہ اس طبقے کے لوگوں کے مسائل سے بھی واقف ہیں اور ان کے حالات کو بیان کرنے میں قدرت بھی رکھتی ہیں۔ خانگیوں کے متعلق رشکِ قمر کہتی ہے کہ:

> ''انسان پیٹ کی خاطر سب کچھ کرتا ہے۔ شرافت و رافت سب دھری رہ جاتی ہے زیادہ تر خانگیاں سفید پوش بد حال گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔''[۱۴]

یہ حقیقت ہے کہ، نشیب و فراز زندگی کا حصہ ہوا کرتے ہیں، بعض لوگ غریبی کے مصائب سے گھبرا کر ایسا راستہ اختیار کر لیتے ہیں کہ بے شک ناجائز طریقے سے ہو، وہ راتوں رات امیری اور عیش و عشرت کے چکروں میں پڑ جاتے ہیں۔ رشکِ قمر کی بیٹی ماہ پارہ بھی کراچی میں کال گرل بن جاتی ہے اور ہفتے، مہینوں بعد ماں کے پاس آتی ہے۔ پسماندہ طبقے کی غریب ماہ پارہ کی زندگی یکسر بدل جاتی ہے، وہ امیری کی شان میں اپنی

ماں کے جذبات کو بھی پس پردہ ڈال دیتی ہے اور وقت آنے پر ماں کو ملازمہ کی حیثیت سے متعارف کراتی ہے۔ رشکِ قمر ماہ پارہ کی بے پرواہ زندگی سے خائف رہنے لگتی ہے، بالآخر رشکِ قمر اسے اسی دنیا میں چھوڑ کر ہندوستان چلی آتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اس منظر کو پیش کرتے ہوئے پسماندہ طبقے کی ذہنیت اور اس کے بے نام احساس پر طنز کیا ہے۔ اس تعلق سے ناولٹ کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> ''ماہ پارہ کے ہاں دولت کی یہی فراوانی مجھے مارے ڈال رہی ہے۔ وہ ایک مشتبہ قسم کے ہوٹل میں رہتی ہے اور طرح طرح کے مشتبہ لوگوں سے اس کی دوستی ہے۔ کبھی کہتی ہے اپنے ایک عرب فرینڈ کے ساتھ بیروت جا رہی ہے۔ کبھی فون کرتی ہے کہ کیبرے ڈانس سیکھنے ہانگ کانگ جانے والی ہے۔ ہفتوں، مہینوں غائب رہنے کے بعد صورت دکھاتی ہے تو لگتا ہے کوئی فلم اسٹار آگئی........ ہرمزی خالہ اور میں نے ساری عمر وہی نہیں کیا جواب ماۃ پارہ نہایت اعلیٰ پیمانے پر بڑے اسٹائل سے کر رہی ہے ....اب ایک علی الاعلان ہائی کلاس پارٹی گرل کی کمائی کھاتے مجھے شرم آتی ہے۔''۱۵

ناولٹ کا اختتام رشکِ قمر کی زندگی کے وقتی ہونے کا احساس دلاتا ہے بلکہ دنیا کے تمام انسانی زندگی کی قوت کو وقت کا جبر اسی طرح مضمحل کر دیتا ہے۔ رشکِ قمر کی طرح ہر عورت کا عروج اس کی جوانی تک محدود ہوتا ہے۔ یہ پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک بدنصیب کنبے کی کہانی ہے جس نے زندہ رہنے کے تگ و دو میں سب کچھ برباد کر دیا۔ سماج میں انہوں نے تلخ زندگی گزاری، اس تجربے نے ان کے لہجے میں تلخی پیدا کر دی، جس سے مصنفہ نے زندگی کی بے رحم حقیقتوں سے پردہ اٹھایا ہے کہ آج کے اس دور میں اخلاق، اصول اور مذاہب سب کی اہمیت صرف باتوں تک محدود ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' کے متعلق اپنی رائے کا ظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''یہ (ناولٹ) ایک دل دوز چیخ ہے، جو مکمل طور پر دل شکستہ عورتوں یا ان

کی داستان طراز قرۃ العین حیدر کی لبوں سے نکلتی ہے.......یہ تہذیب پر ایک طنز ہے، انسانیت کا ایک الم ناک نقشہ ہے، سماجی تفرقے، جاگیر دارانہ اقدار، سرمایہ دارانہ استحصال، معاشرتی خرابی اور اخلاقی زوال کی ایک دردناک کہانی اس ناولٹ میں ابھرتی ہے اور ہر حساس انسان کے لیے ایک لمحۂ فکریہ، ایک تازیانۂ عبرت اور ایک ورقِ نصیحت بن جاتی ہے۔''۱۶

''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو''میں پسماندہ طبقے کے حالات گزرے ہوئے وقت کے ساتھ بجائے سدھرنے کے بد سے بدتر ہوتے جاتے ہیں۔ رشکِ قمر کی ماں گھر کی چار دیواری میں رہ کر ہی مفلسی کا عذاب سہتی رہی، رشکِ قمر چار دیواری سے باہر ان مسائل سے دوچار ہوتی ہے اور اس کی بیٹی ماہ پارہ انڈر ورلڈ کا شکار ہو جاتی ہے۔ان پسماندہ طبقے کے کرداروں کے مسائل جنم جنم کے ہیں جس سے لڑنے کے لیے بار بار جنم لینا پڑتا ہے پھر بھی اس پسماندگی سے چھٹکارا ممکن نہیں۔اس کے متعلق محترمہ درخشاں فرماتی ہیں:

''ایک بڑا فن کار اپنی تخلیق میں ہر زمانے کے مسائل کو اجاگر کرتا ہے چنانچہ قرۃ العین حیدر نے''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو''میں غریب طبقے کی عورتوں کی زندگی کی کئی شکلیں پیش کر کے ہر دور کے پس ماندہ طبقے کی زندگی کی ترجمانی کی ہے۔غریب طبقے کے مسائل بیان کر کے نسل در نسل کے مصائب کا احاطہ کیا ہے۔''۱۷

اس ناولٹ کے ذریعے سماجی تفریق ذات پات، امیری و غریبی کا فرق بھی دیکھا جا سکتا ہے۔اس تفریق کی نمائندگی آغا فرہاد اور شری نریندر کمار برما کا کردار بجا طور پر کرتا نظر آتا ہے۔کیونکہ ورما جی نے تمام عمر زندگی صدف کو اپنے سے وابستہ رکھا مگر اس کے مفلسی کے باعث شادی نہیں کی۔اسی پس منظر اور حالات سے آغا فرہاد کا کردار بھی گزرتا نظر آتا ہے۔آغا فرہاد تمام زندگی رشکِ قمر سے محبت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر انہوں نے بھی امیر لڑکی سے شادی کر کے امیری اور غریبی کے فرق کو واضح کر دیا۔

دلربا:

''دلربا'' قرۃ العین حیدر کے نمائندہ ناولٹ میں سے ایک ہے۔ یہ ناولٹ اعلیٰ طبقے کا زوال اور پسماندہ طبقے کے عروج کی کہانی پیش کرتا ہے۔ انگریزی دور حکومت اور اشتراکی تحریک کی آندھی کے سامنے جاگیردارانہ تہذیب دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ناول کے پس منظر پر اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کی سماجی اور اقتصادی زندگی کے تصادم کو بھی بڑی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جسٹس رفاقت حسین شمالی ہند کا وہ اعلیٰ طبقہ ہے جو اپنی زوال آمادہ قدیم مشرقی تہذیب کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے۔ دوسری طرف پسماندہ طبقے کی ڈیرہ دار طوائفیں ہیں جو سماج میں عزت حاصل کرنے کی تگ ودو کرتی نظر آتی ہیں۔

مصنفہ نے ناولٹ میں وقت کی تبدیلی کا ایسا منظر پیش کیا ہے کہ اعلیٰ طبقہ جو تہذیب وثقافت کا نمائندہ تھا وہ جدید دور میں حاشیہ کی زندگی گزارتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہیں پسماندہ طبقے کی طوائفیں جو کبھی عزت اور سکون کی محتاج تھیں صنعتی ترقی کے ساتھ وہ اعلیٰ اور عزت دار طبقے میں شمار ہوتی ہیں۔ جدید تہذیب کی نمائندگی گلزار بائی اور اس کی بیٹی گلنار بائی کرتی ہیں۔ ''دلربا'' کے کرداروں کی زندگی کے متعلق وضاحت حسین رضوی لکھتے ہیں کہ:

> ''کردار نگاری کے لحاظ سے مصنفہ کے سارے کردار نیچرل اور انسانی زندگی سے بہت قریب تر ہیں۔ آج کے سماج میں حالات وواقعات اگر ساتھ دیتے ہیں تو انسان شریف نظر آتا ہے ورنہ گلنار وگلرو جیسا بن جاتا ہے۔ خون اور Heredity ماحول کے سامنے اپنا اثر کھو دیتے ہیں۔ جس ماحول میں انسان بڑھتا ہے۔ اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ سماج کا کوئی فرد نہ اچھا ہوتا ہے نہ برا، حالات وواقعات اس کے عامل و محرکات کسی کو اچھا اور کسی کو برا بناتے ہیں۔'' [۱۸]

قرۃ العین حیدر کا ناولٹ ''دلربا'' رابعہ بک ہاؤس لاہور سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ 'دلربا' ۶۲ صفحات

کے مختصر کینوس پر پھیلا ہوا دلکش ناولٹ ہے۔ مصنفہ کا یہ واحد ناولٹ ہے جو نو مختلف عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے، جب کہ باقی ناولٹوں میں ایسا نہیں ہے۔ ذیل میں عنوانات:

۱۔ پردہ گرنے کے بعد	۲۔ پام کورٹ ہوٹل	۳۔ طوطے والا بنگلہ
۴۔ راگ دل چمن	۵۔ بلبل بیمار	۶۔ گلروز رینہ
۷۔ جلتی نشانی	۸۔ گرد باد	۹۔ دلربا

ناولٹ کا عنوان ''دلربا'' اپنے موضوع سے یکدم مختلف نظر آتا ہے۔ کیونکہ 'دلربا' ایک کردار کا نام ہے جو کہانی کے اختتام پر ظاہر ہوتا ہے۔ جبکہ ناولٹ ''دلربا'' کا اصل موضوع ہندوستانی شو بز کی دنیا ہے۔ جس میں پہلے اسٹیج، فلم انڈسٹری اور پھر دورِ جدید کی فلمی دنیا کے ارتقاء و زوال کی داستانیں ہیں۔ جس طرح ہندوستانی اقدار تبدیل ہوتا گیا اسی طرح زمانے کے ساتھ ساتھ تھیٹر، اسٹیج اور فلم انڈسٹری کا ماحول بھی بدلتا گیا۔ قرۃ العین حیدر نے ناولٹ میں ہندوستانی تھیٹر میں کام کرنے والے مراثین طبقے کے لوگوں کی زندگی اور ان کے سماجی حالات کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس ناولٹ میں مصنفہ نے ہندوستان کے اعلیٰ و پسماندہ طبقے کے اصول نظام پر طنز بھی کیا ہے اور یہ طنز سماج کے طبقاتی نظام پر ہی نہیں بلکہ ہندوستانی شو بز اور سامعین کے مزاج کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

ناولٹ 'دلربا' کے پسماندہ کرداروں کی زندگی کی نفسیات، جذبات اور ان کے احساسات کا جائزہ لینے سے قبل ان کی نہایت مختصر پر مبنی کہانی پر نظر ڈالتے ہیں۔ ہندوستانی تھیٹر میں کام کرنے والی گلنار بائی پسماندہ طبقے کی ڈیرے دار خاندانی طوائف ہے، یہ روزگار کے لیے جگہ جگہ ڈراما اسٹیج کرتی ہے۔ ایک بار گلنار اپنا ڈراما تھیٹر کرنے لکھنؤ پہنچتی ہے۔ جہاں اس کی خوبصورتی اور اداری کی دھوم مچ جاتی ہے کچھ ہی دنوں میں گلنار تھیٹر کمپنی کی مشہور ہیروئن بن جاتی ہے۔ لکھنؤ میں گلنار بائی کی ملاقات نئی تعلیم و تہذیب کے داعی، تھیٹر اور رنگ رلیوں کے مخالف بیرسٹر رفاقت حسین کے کم عمر بھانجے شجاعت حسین عرف شجو سے ہوتی ہے جو اب باپ کی وفات کے بعد تعلقدار ہو چکے ہیں۔ شجو میاں اپنے تین دوستوں کے ساتھ برقع اوڑھ کر گلنار بائی کا ڈرامہ دیکھنے جاتے ہیں۔ واپسی پر راستہ بھول کر گلنار بائی کے ڈریسنگ روم میں چلے جاتے ہیں، وہاں چاروں کی

گلنار بائی سے تفصیلی بات چیت ہوتی ہے، پھر شجاعت حسین کو لینے رفاقت حسین کے منشی میر حقہ اور مرزا گڑ گڑی گلنار بائی کے تھیٹر آتے ہیں۔

گلنار جو مختلف ہوٹلوں اور سرایوں میں رہتے رہتے کافی تنگ آ چکی ہوتی ہے، کچھ دنوں کے لیے کسی کوٹھی یا بنگلے کی تلاش میں ہے۔ یہ بات سید شجاعت حسین، میر حقہ اور مرزا گڑ گڑی کے سامنے آتی ہے۔ شجاعت حسین اپنے پھونس والے بنگلے میں (جو اکثر کرایہ پر اٹھتا تھا یا مہمان خانہ تھا) گلنار بائی کو بلوا لیتے ہیں۔ گلنار کو یہاں آنے سے پہلے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ شجاعت حسین کے ماموں سید رفاقت حسین کا بنگلہ ہے۔

گلنار یہاں آ کر کافی خوش ہوتی ہے لیکن یہاں آنے کے کچھ دیر بعد ہی اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بنگلہ کس کا ہے اور کس نے دلوایا ہے؟ یہاں وہ سید رفاقت حسین کی تصویر دیکھتی ہے اور متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان ہو جاتی ہے کیوں کہ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ سید رفاقت حسین تھیٹر اور محفل عیش و نشاط کے سخت مخالف ہیں۔ اس پریشانی کا اظہار وہ اپنی ماں گلزار بائی سے کرتی ہے۔ گلزار بائی اسے سمجھاتی اور دلاسے دیتی ہے کہ بہت ممکن ہے کہ وہ بھی اپنی ماموں زاد بہن پنّا کی طرح بیگم بن جائے۔ گلنار سید رفاقت حسین کی تصویر دیکھتی ہے اور خوابوں کی دنیا میں کھو جاتی ہے۔ بنگلے میں رہتے ہوئے ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ سید رفاقت حسین سفر سے واپس آ جاتے ہیں، گلنار سے ان کی ملاقات ہوتی ہے، ساتھ ہی بیرسٹر صاحب اپنے بھانجے اور ان کے دوستوں کی تھیٹر میں دلچسپی کا علم ہوتا ہے۔ وہ یہ سب دیکھ کر سخت ناراض ہوتے ہیں، کچھ ہی دیر بعد گلنار کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیرسٹر صاحب کو اُس کا اِس گھر میں رہنا ناپسند ہے اور انہوں نے ایک دن کے اندر بنگلہ خالی کرنے کا حکم دیا ہے۔ گلنار کی وہ رات کرب اور بے چینی کے عالم میں گزرتی ہے، اسے اپنی بے عزتی اور مجبوری کا زبردست احساس ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہ رات کی تاریکی میں چھپ کر، یادوں سے معمور اور پیار بھری نظروں سے سوتے ہوئے سید رفاقت حسین کو دیکھتی ہے۔ امید اور ناامیدی کی ملی جلی کیفیات پر مشتمل یادیں اسے کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔

دوسری صبح گلنار بائی اپنے زخمی احساسات اور ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں سمیٹ کر بنگلے سے رخصت ہو جاتی ہے، لیکن بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ گلنار بائی اداکاری کے میدان میں نمایاں ترقی حاصل

کرتی ہے۔تھیٹر کے بعد خاموش سنیما اور پھر چند فلموں میں اداکاری کرنے کے بعد وہ فلم پروڈیوسر بن جاتی ہے۔

مذکورہ ناولٹ کے اختصار سے یہ واضح ہے کہ قرۃ العین حیدر نے جدید ترقی یافتہ دور میں لکھنو کی بدلتی ہوئی تہذیب اور اس کے سماجی حالات کو پیش کیا ہے۔طائفہ مس گلنار،گلزار بائی اور اس کا پورا عملہ کس طرح سماج کے طبقاتی نظام کے آگے زیر ہے ناولٹ میں قرۃ العین حیدر اسی حقیقت کو پیش کرتی ہیں۔مراثین طبقے کے پسماندہ کرداروں کی زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر نے ہندوستانی شوبز اور تھیٹر کے ساتھ ان کے روزمرہ زندگی کے حالات کے تمام پہلو کو بھی ابھارا ہے۔ناولٹ کے ابتداء میں ہی اسٹیج ڈرامے کے ختم ہونے کے بعد اچانک گلنار بائی کے ڈریسنگ روم میں شجو میاں اور ان کے دوست داخل ہو جاتے ہیں۔گلنار بائی اس فوری منظر کو دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے اور اپنے لواحقین پر برس پڑتی ہے۔اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''کندن...حرامزادی...چھنال...کہاں مرگئی۔'' ....
>
> ایک ٹرّی شکل والی عورت کمرے میں گھسی ۔ لال لہنگا، نیلہ شلوکہ، ہرا دوپٹہ، ناک میں بلاق، خاصی بندریا۔مسخ، پھٹکار زدہ صورت ۔گلنار بائی اس پر برس پڑیں.... ''کلموہی...مال زادی...میں یہاں لٹ جاؤں۔ ڈکیت آن پڑیں، ٹھگ آن گھسیں۔کھیل ختم ہوا نہیں اور تم سب چرس کا دم لگانے بیٹھ گئے، دروازہ کس نے کھلا چھوڑا؟.....ارے یہ تو خیر اسکول کے چھوکرے نکلے، چور بدمعاش اچکّے ہوتے تو؟....اور منڈوے کے چوکیدار سب انفلوئنزا میں مر گئے کیا......؟ منوا بھسم ہو گیا.....؟اس کی گور میں کیڑے پڑیں۔ڈھائی گھڑی کی آئی۔مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو......''
>
> ''منوا کے بچے....حرام زادے.....بھڑوے.....دروازہ تو کھلا چھوڑ گیا تھا؟۔''[۱۹]

ہندوستان کی تہذیبی روایت میں یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک بہن اپنے بھائی کو اتنی فحش گلیاں

دینے کی ہمت کر سکے۔ ایسا صرف طوائف طبقے میں ہی ممکن ہے۔قرۃ العین حیدر نے گلنار بائی کی ماحولیاتی زندگی اور اس کنبے کی عام بول چال کو بڑی فطری انداز میں پیش کیا ہے۔گلنار بائی کی مذکورہ لچر زبان ان کی شخصیت کی نشاندہی کرتی ہے۔تخلیق کار کے لیے اس طرح کی زبان کو ادا کرنا عام بات نہیں اس کے لیے پوری طرح اس طبقے کے لوگوں کی زندگی کا مشاہدہ کرنا ضروری ہے،اس کے بعد ہی اس طبقے کے لوگوں کی زبان، ان کے مسائل اور ان کے حالات کی پوری تصویر پیش کی جاسکتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے مراثین طبقے کی زندگی اور ان کی معاشی،معاشرتی اور تہذیب کے سبھی پہلو کو اچھی طرح پیش کیا ہے۔

ناولٹ ''دلربا'' میں پسماندہ طبقے کی طوائفوں کی دوہری زندگی اور ان کی حقیقت کو دیکھا جاسکتا ہے، جس میں ایک طرف پردے کے سامنے کی نامور اداکارہ جو سامع اور دیگر عوام کے سامنے کتنی سائستہ اور ادب سے پیش آتی ہے اور دوسری جانب یہی گلنار بائی اٹاوے والی، بھڑ بھوجنوں، بھٹیارنوں کی طرح گالیاں دیتی نظر آتی ہے۔مصنفہ نے لکھنؤ کے ڈیرے دار طوائفوں کی زندگی،ان کی ذاتی اور معاشرتی رویے میں فرق کے ساتھ ان کے عادات واطوار کی پوری تصویر دکھایا ہے۔ناولٹ سے اقتباس:

> ''یہی بی (گلنار) صاحبہ چند منٹ پہلے اپنے لواحقین کو گالی کوسنوں سے نوازتی کتنی بازاری اور لچر نا معلوم ہو رہی تھیں۔ پل کی پل میں دوسرا ماسک پہن لیا۔خوش اخلاق،مہذب،شفیق،ان کم عمر لڑکوں کو ابھی تجربہ نہ ہوا تھا کہ انسان کی شخصیت کے کتنے پہلو ہوتے ہیں۔ایک آدمی کے اندر کتنی مختلف اور متضاد ہستیاں چھپی رہتی ہیں اور بعض لوگ موقع ومحل کے لحاظ سے کس طرح اپنا رنگ بدلتے ہیں۔گلنار بائی کی اصلیت کیا ہے...؟ بازاری یا شریف....؟ غالباً دونوں....اور یہ بات شاید خود اسے معلوم نہ تھی۔''[۲۰]

ناولٹ کے پس منظر پر گلنار بائی کی دہری شخصیت دکھائی دیتی ہے۔ وہ اپنے لواحقین میں بازارو اور تھرڈ کلاس تو چاہنے والوں میں خوش اخلاق اور نہایت مہذب نظر آتی ہے۔گلنار بائی کی زندگی کا یہ طرز عمل شاید

طوائف خاندان کی پرورش کا نتیجہ ہے۔

ناولٹ میں قرۃ العین حیدر نے سماج کے نچلے طبقے کے مراثینوں کے مسائل اور ان کے جذبات کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لکھنؤ میں گلنار کو نواب رفاقت حسین کی تصویر دیکھ کر ان سے محبت ہو جاتی ہے اور وہ اپنے ماموں زاد بہن پنّا کی طرح خوشحال اور عزت کی زندگی گزارنے کا خواب دیکھتی ہے، لیکن گلنار کا یہ خواب محض پانی کے بلبلے کے مانند نیند سے بیدار ہونے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ رفاقت حسین اعلیٰ طبقے کے سخت نمائندہ تھے انہوں نے پسماندہ طبقے کے گلنار اور اس کے پورے عملے کو اپنی رسوائی کا باعث سمجھا اور اپنے پھونس والے بنگلے سے جلد از جلد نکل جانے کی فرمان سنا دی۔ قرۃ العین حیدر نے اس موقع پر گلنار کی ماں گلزار بائی کے جس احساس اور احتجاج کو پیش کیا ہے وہ لاچار انسانیت کی عمدہ مثال ہے۔ اس دورِ جہاں میں سماجی نظام کا وہ منظر نظر آتا ہے جہاں انسان ہی انسان کو اپنی رسوائی کا باعث سمجھتا ہے۔ دراصل مصنفہ نے اس ناولٹ کے ذریعے سماج کے اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کی طبقاتی تفریق کو پیش کیا ہے۔ ناولٹ سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''ہم، ہم بڑے بڑے والیان ریاست کے شاہی مہمان خانوں میں ٹھہرائے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے راجوں نوابوں نے ہم پر اپنے خزانے لٹا دیئے۔ ذرا جا کر اپنے خرد دماغ بالشٹر سے پوچھو، میاں تمھاری اوقات ہی کیا۔ دو ٹکے کے وکیل، ذرا ذہور زمینداری، ارے... ابھی کل کلاں کو میری اٹاوے کی جائداد املاک کا کوئی مقدمہ کھڑا ہووئے۔ میں ان کو فیس ادا کروں تو دوڑے آئیں۔ اور اب ہم سے ہیکڑی کی لیتے ہیں جیسے ان کی فیس ان کے کام کی، ہماری فیس ہمارے کام کی، ہم میں ان میں فرق کیا ہے ....ذلت کی زندگی، ذلت کی موت ....اللہ مجھے جہاں پیدا کیا وہاں پیدا ہوگئی، اس میں میرا کیا قصور۔''[۲۱]

مذکورہ اقتباس کردار کے احساس کی ترجمانی ہے۔لیکن سماجی سطح پر پسماندہ طبقے کی طوائف کے احساس کی کوئی اہمیت نہیں۔ رفاقت حسین کے بنگلے سے نکالے جانے پر گلنار بائی اپنی بےعزتی محسوس کرتی ہے، بڑی مشکلوں سے وہ خود پر صبر پاتی ہے۔گلناراور گلزار بائی کی ایسی توہین آج سے پہلے کسی نے نہ کی تھی یہ لوگ جہاں جاتے لوگ انہیں پلکوں پر بٹھاتے تھے۔ رفاقت حسین کے اس رویے سے گلنار بائی کو پہلی بار اپنے پیشے سے بہت شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔ کیونکہ پھونس والے بنگلے میں آنے کے بعد وہ خود کو حویلی کی عورتوں کی طرح محفوظ تصور کرنے لگی تھی۔لیکن گلنار بائی کی ایک جگہ ٹک کر رہنے والی خواہش طبقاتی تفریق کی آگ میں اس وقت جھلس جاتی ہے جس وقت بیرسٹر رفاقت حسین اسے بےعزت کر کے گھر سے نکال دیتے ہیں۔جس کے بعد وہ لکھنؤ چھوڑ کر جلاوطنی کی زندگی گزارنے لگتی ہے۔

ناولٹ کے ذریعے اس دور کے جاگیردارانہ نظام کی تہذیبی اقدار اوران کے حالات پر روشنی پڑتی ہے اور ساتھ ہی اس دور کی طوائفوں کی زندگی معاشرے میں کن شکست وریخت سے دوچار ہورہی تھی اس کی تصویر بھی نظر آتی ہے۔سماج میں طائفہ کی زندگی محض تفریحی سطح تک ہی محدود سمجھی جاتی تھی۔کوئی باعزت شخص ان کو اپنے خاندان کا حصہ بنانا پسند نہیں کرتا تھا۔بس یہ کوٹھے یا اسٹیج کی زینت ہوا کرتی تھی۔ پسماندہ طبقے کے طوائفوں کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی رئیس یا نواب اسے اپنالے تاکہ معاشرے میں عزت اورسکون حاصل ہو جائے ۔گلنار بائی رفاقت حسین سے یہی امید رکھتی ہے کہ وہ اپنا ہم سفر بنالیں تاکہ اس عذاب سے اسے نجات مل جائے ۔ وقت کے تناظر میں حالات کو سازگار بنانے کی گلنار بائی کی یہ خواہش بےسود ثابت ہوتی ہے ۔رفاقت حسین کے یہاں سے جاتے ہوئے وہ خوب روتی ہے۔اس کے بہتے ہوئے آنسوعزم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔گزرتے وقت کے ساتھ سائنس کی ترقی نے سماجی نظام کو پوری طرح بدل دیا۔گلنار بائی بےانتہا کوشش کر کے فلم انڈسٹری کی مشہور شخصیت بن جاتی ہے۔بمبئی شہر میں کلاس ون کی زندگی گزارتی ہے۔گویا زندگی کی ہر خوشی اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ناولٹ میں آزادی سے قبل لکھنؤ کی جو تصویر پیش کی ہے وہ مشرقی سماج کی تہذیب ہے۔ جہاں ہر طبقے اور مذاہب کے لیے سماجی اصول مقرر ہے۔گلنار بائی کی سماجی حیثیت پسماندہ طبقے کی ہے،

وہ ایک مراثین خاندان میں پیدا ہوئی تھی جس کی حیثیت معاشرے میں محض سامانِ تفریح کے کچھ نہ تھی۔ ان کا خاندانی پیشہ ناچنا، گانا، بجانا اور آوارہ گرد زندگی گزارنا ہے۔ اپنی حیثیت کا اعتراف کرتے گلنار خود کرتی ہے۔ ''ہم کون ہیں؟ خدائی خوار، اٹھائی گیرے، کنجرے۔'' لیکن سائنس کے ترقی کے بعد ہندوستان میں تھیٹر کا کلچر عام ہو گیا ہے جس کے بعد تھیٹر کے اثرات چاروں طرف دکھائی دینے لگے۔ ناولٹ میں یہ تبدیلی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے کہ جدید ترقی نے وقت کے ساتھ ہندوستان میں سب کچھ بدل دیا۔ سیاسی، سماجی، معاشرتی ،معاشی اور تہذیبی سطح پر ایک بہت بڑی تبدیلی آئی جس نے موجودہ اقدار کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ وقت کے اس نشیب وفراز میں شاہی خاندان کے افراد ''حقہ'' اور ''گڑگڑی'' بن جاتے ہیں اور سید رفاقت حسین کی پوتی حمیدہ فلم کی ہیروئن ''دلربا'' بن جاتی ہے۔

ناولٹ کا المیہ یہ ہے کہ جہاں آزادی سے قبل ڈیرے دار طوائف گلنار بائی کی سماج میں سوائے سامانِ تفریح کے کوئی حیثیت نہیں تھی وہ آزادی کے بعد ترقی کر کے فلم پروڈیوسر بن کر دولت بٹورنے لگتی ہے اور زمیندار رفاقت حسین جو آزادی سے قبل شان وشوکت کی زندگی گزارتے تھے۔ ملک آزاد ہونے کے بعد جاگیر دارانہ نظام کے خاتمے کے ساتھ افلاس زدہ زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی انقلابِ زمانہ کی بدترین مثال بن جاتی ہے۔

دلربا، جس کا اصل نام حمیدہ ہے۔ اس کا کردار مختصر ہوتے ہوئے بھی بہت اہم ہے۔ یہ جسٹس رفاقت حسین کی پوتی ہے جو بعد میں گلنار کے فلم انڈسٹری میں اداکارہ کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ دلربا آخر میں اسی پسماندہ طبقے کے خاندان میں جذب بھی ہو جاتی ہے۔ دلربا کا فلم انڈسٹری میں کام کرنے کا فیصلہ اعلیٰ طبقے کے روایتی اصول کے خلاف انقلابی فیصلہ تھا۔ جہاں دلربا کے فیصلے سے اس کے حوصلے کا اندازہ ہوتا ہے وہیں اس کی آزاد اور خود مختار ذہنیت کی دلیل بھی ہے۔ فلم انڈسٹری میں قدم رکھنے کے بعد دلربا کے خاندان والے بے حد خفا ہوتے ہیں لیکن دلربا کو اس کی پرواہ نہیں بلکہ وہ فلم میں لیے جانے کی وجہ سے بے انتہا خوش ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

''مجھے تو اب بھی یقین نہیں ہوتا کہ میں اتنی آسانی سے ایک بڑے بینر کی

پکچر میں لے لی گئی۔''۲۲؎

ناولٹ کے کرداروں کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو 'دلربا' کے کردار کی اتنی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس سے اعلیٰ اور پسماندہ دونوں طبقہ منسلک ہے اور 'دلربا' کا کردار دو طبقوں کے مابین پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ معاشی تنگی اور سماجی پسماندگی کے دور میں گلنار دلربا کے خاندان کا حصہ بننا چاہتی تھی لیکن سماج کے طبقاتی نظام کی ستم ظریفی نے گلنار کو رسوا کیا اور اسے ذلت و رسوائی کے ساتھ گھر سے نکالا گیا۔ گلنار بائی تو دلربا کے خاندان کا حصہ نہ بن سکی مگر دلربا اپنے اعلیٰ اور شریف خاندان سے بغاوت کر کے نہ صرف فلم ایکٹرس بن کر ابھرتی ہے بلکہ پسماندہ طبقے کے خاندان کا فرد بن کر گلرو کی بیٹی کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ جب گلنار سے ایک انٹرویو کے دوران پوچھا گیا تھا تو وہ کہتی ہے:

> ''گلنار بانوں باتوں کے موڈ میں تھیں۔ بتایا کہ دلربا ان کے ساتھ گلستان میں رہتی ہے۔ میں اور گلرو اسے اپنی اولاد کی طرح رکھتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں میری بیٹی گلرو کے ہاں تین لڑکے ہی لڑکے پیدا ہوئے۔ میری والدہ مرحومہ اپنی پرنواسی کا جشن ولادت دھوم دھام سے منانے کا ارمان دل میں لیے لیے دنیا سے رخصت ہو گئیں مگر خدا کا شکر ہے کہ اس نے گلرو کو ایک بنی بنائی بیٹی اور مجھے نواسی عطا کی اور اس کارسازِ حقیقی کی قدرت کے قربان جاؤں جس نے ایک بہت طویل مدت کے بعد میرے کلیجے میں ٹھنڈک ڈالی۔''۲۳؎

قرۃ العین حیدر نے ناولٹ ''دلربا'' میں شہر لکھنؤ کے اس معاشرے کو پیش کیا ہے جو وقت کے ساتھ تیزی سے بدل رہا ہے۔ دراصل یہ صرف لکھنؤ کا پس منظر نہیں بلکہ پورے ملک کا منظر نامہ ہے۔ پہلے کے مقابلے میں اشرافیہ طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں کی حالت دگرگوں ہو گئی ہے۔ جبکہ گلنار اور گلرو کی اولادیں انگریزی تعلیم حاصل کرنے مغربی ممالک جاتے ہیں۔ مصنفہ نے ان دونوں طبقے کے لوگوں کی زندگی کے عروج و زوال کو وقت کے تناظر میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ان دونوں طبقے کے لوگوں کی زندگی کی تبدیلی اور ان کے مسائل

سامنے آتے ہیں۔

ناولٹ کا پورا پس منظر حالات کے بدلتے منظر نامے کو پیش کرتا ہے۔ایک طرف ناولٹ کا وہ طبقہ جو اپنے قدیم تہذیب وروایت سے چپکا ہوا ہے اوراپنے زمانے کا جدید تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی وقت کی رفتار کو سمجھ نہیں پاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ طبقے کی تمام قدریں زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔پہلے تعلقہ، پھر بنگلہ، کوٹھی، حتیٰ کے گھر مکان سب فروخت ہو جاتا ہے اورانہیں اپنی زندگی ہی میں برے وقت سے گزرنا بھی پڑتا ہے۔دوسری طرف سماج کا پسماندہ طبقہ ہے جو اسی سماج میں نہایت پست اور پسماندہ حیثیت رکھتا تھا۔لیکن وقت کی تیز رفتاری میں اس طبقے نے آزاد خیالی سے کام لیا جس میں کامیابی بھی حاصل کی۔گلنار بائی ڈیرہ دار طوائف تھیٹر کمپنی سے جدید فلمی دنیااور ترقی کر کےفلم انڈسٹری کی مالکن بن جاتی ہے۔گلنار جدید تہذیب کی رنگ میں رنگی شاندارزندگی، جملہ سامان عیش وعشرت اورشہرت وعزت کے ساتھ گزارنے میں کامیاب ہوتی ہے۔

ہاؤسنگ سوسائٹی:

ناولٹ ’’ہاؤسنگ سوسائٹی‘‘ ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا جوقرۃ العین حیدر کے افسانوی مجموعہ ’’پت جھڑ کی آواز‘‘ میں شامل ہے۔یہ ناولٹ مصنفہ کے دوسرے ناولٹوں سے قدرے مختلف ہے۔اس ناولٹ میں مخصوص جذباتیت سے کام لیا گیا ہے۔اس میں صرف تقسیم وطن سے قبل اور بعد کی ہی تصویر نہیں ملتی ہے بلکہ انسانی قدروں کا تصادم بھی خوبی کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔

یہ ناولٹ تقسیم سے قبل ہندوستان کے کسان،ان کی زندگی اوران کی صورتِ حال کو بیان کرتا ہے۔ اس کا اصل موضوع تقسیم کے پہلے دیہات کی پسماندہ زندگی اور تقسیم کے بعد پاکستان میں پیدا ہونے والی اقتصادی اورسماجی صورتِ حال ہے جس میں تہذیب وثقافت کے مٹنے، جاگیردار طبقے کے زوال،نو دولیتے طبقے کا عروج اوراس مستزاد سرمایہ دار طبقے نےضمیر فروشی اور بے حسی سے کام لے کرغریبوں کا استحصال کیا، یہ سب کچھ اس ناولٹ میں شامل ہے۔قرۃ العین حیدر نے بالخصوص نو دولتیوں کی ہوس پرستی،خودغرضی اور بے حسی

پر گہرے طنز کے وار کیے ہیں، موقع پرست جن کا ایمان ہے۔ یہ طبقہ بے پناہ دولت کمانے کی دھن میں اپنی تہذیبی اقدار کو فراموش کر چکا ہے۔ انہیں میں جمشید بھی ہے جو پاکستان میں دولت ظاہری کو زندگی کی اصل حقیقت سمجھ لیتا ہے۔

جمشید علی اس ناولٹ کا اہم کردار ہے۔ جمشید علی اس نو دولتیوں کا نمائندہ ہے جس کے پاس تقسیم کے بعد دولت آئی۔ جمشید نے تمام اخلاقی اور سماجی قدروں سے انحراف کر کے حصولِ زر اور زندگی کی مادی آسائشوں کو حاصل کرنا ہی مقصد حیات جانا۔ اس نے بہت نچلی سطح پر آ کر زندگی سے سمجھوتا کیا تھا۔ جمشید علی کی عمر کا ایک بڑا حصہ غربت وافلاس اور پسماندگی میں بسر ہوا تھا۔ غریبی کے دور میں وہ غیور اور خوددار انسان تھا لیکن حالات کی سختی نے آہستہ آہستہ اسے بے حس اور بدتمیز بنا دیا۔ وہ اپنی معصوم بیوی منظور النساء کو طلاق دے دیتا ہے۔ منظور النساء ہندوستانی مسلمان عورت کی بے بسی، مظلومیت، بے چارگی اور پسماندگی کا مکمل نمونہ ہے۔ جس نے اپنی پوری زندگی افلاس اور دوسروں کی خدمت کرتے ہوئے گزار دی۔ لیکن خود محبت اور عزت دونوں سے محروم رہی، پھر بھی مرتے مرتے سید جمشید علی کو معاف کر گئی۔ منظور النساء کے متعلق سہیل بیابانی لکھتے ہیں کہ:

> ''اس افسانے میں منظور النساء کا المیہ گہرا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ اس المیے کی ذمہ داری جمشید کے سر ہے۔ جسے دیہاتی ماحول کے ماضی سے نفرت تھی۔ اور جو نئی چمک دمک کی زندگی کے خواب اپنے ذہن میں سجائے ہوئے ہے۔ اس کے نزدیک اپنے چچا کی لاڈلی، نازوں کی پلی لڑکی منظور النساء کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ اس سے شادی کر کے وہ صرف ایک رسم نبھاتا ہے۔ وہ اپنی دولت کے نشے میں کبھی منظور النساء کو یاد بھی نہیں کرتا۔ اسے طلاق دینے میں اسے کوئی جھجک نہیں ہوتی۔ اس کی یہ سخت دلی حیرت انگیز ہے۔ منظور النساء کے لیے جمشید پہلا اور آخری مرد تھا جو طلاق کے بعد بھی اسے عزیز تھا۔ منظور النساء ایک بے بس کی طرح

دیہات کے پسماندہ ماحول میں زندگی گزار دیتی ہے اور ایک روز اس کی
موت واقع ہو جاتی ہے۔'' ۲۴

ناولٹ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' میں دیہات اور دیہی سماج کی کہانی ہے جس میں مختلف طرح کے لوگ سامنے آتے ہیں۔منظور النساء سید مظہر علی کی لاڈلی بیٹی ہے۔منظور النساء کی شادی کے وقت اس کے والد نے قرض لے کر اس کی شادی جمشید علی سے کی تھی اور کہا تھا کہ یہ غریب کی بے زبان بچی ہے۔تمہاری کنیز بن کر رہے گی، اس کا دل نہ دکھانا۔سسرال جانے کے بعد مشرقی عورتوں کی طرح منظور النساء بھی سسرال کی پوری ذمہ داری بڑی خوبی سے نبھاتی ہے۔وہ جمشید کے ساتھ ساتھ گھر کے تمام افراد کا پورا خیال رکھتی ہے لیکن جمشید اس سے سیدھے منھ بات نہیں کرتا۔اس کی یہ انتھک محنت بے سود و زیاں ہے آخر میں جمشید اسے طلاق دے دیتا ہے۔

مصنفہ نے ناولٹ میں گاؤں کی تہذیبی، سماجی اور ماحولیاتی زندگی کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔محمد گنج میں سید مظہر علی کے گھر جب منظور النساء کی بیٹی ہوتی ہے تو گھر میں جشن کا ماحول ہوتا ہے اس خوشی میں گھر والوں کے ساتھ محلے والوں نے بھی جشن منایا تھا۔ناولٹ سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں

> ''محلے کی عورتوں نے چاول کے کھم بنا کر اور گلگلے تل کے خدائی رات منائی تھی۔نیم تلے چپاتی بھانڈ نے نقلیں دکھائی تھیں اور گانوں کی البیلی پاتر حشمت ٹھمکی لگا لگا کر ....کھسکے ڈبل........کھسکے ڈبل..........''
> آلا پتی سید مظہر علی کے نزدیک پہنچی تھی، جو احباب کے ساتھ کھاٹ پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور نواسی کی پیدائش کی خوشی میں انہوں نے بڑے رومال کی گرہ میں سے دو روپے نکال کر اسے دیے تھے۔اندر صحن میں جھینگا پاسی کی عورت گھونگھٹ کاڑھ کے اور کمر پر ہاتھ رکھ کے ناچی تھی۔ حیدر ڈومنی اور اس کی بہنوں نے ''جچہ گیریاں'' گائی تھیں۔۲۵

قرۃ العین حیدر نے بچی کی ولادت کے جشن میں شامل پسماندہ طبقے کے کرداروں کو سماجی ماحولیات کا

حصہ بنا کر پیش کیا ہے جس میں ڈومنی، بھانڈ اور ناچنے والیاں موجود نظر آتی ہیں۔افسانے کا یہ منظر ہندوستان کے دیہاتی سماج کا حقیقی پس منظر ہے۔مذکورہ پسماندہ طبقے کے کردار جشن یا مختلف موقعوں پر مخصوص کارگردگی کے لیے بلائے جاتے ہیں۔اس ناولٹ کے ذریعے سماج کا ایک مخصوص کلچر ہمارے سامنے آتا ہے۔مصنفہ کے بارے میں جو مخصوص ہیولا قائم کیا گیا ہے کہ وہ صرف شہری سماج اور اعلیٰ طبقے کی زندگی کو ہی پیش کرتی ہیں، یہ ناولٹ اس ہیولے کو توڑتا ہے۔اس میں دیہات کے پسماندہ طبقے کے کسانوں کی زندگی، کھیت کھلیان، گاؤں کے مزدور اور گاؤں کی چوپال بھی نظر آتی ہے، جس کی تصویر کو مصنفہ نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے منظور النساء کے ذیل میں کردار کی حقیقت کو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پیش کیا ہے۔انہوں نے اپنے طنز میں بڑی بے رحمی سے کام لیا ہے اور ایک ایسی عبرت ناک تصویر بنائی ہے جو کسی مصور کے بس کی بات نہ تھی، مصنفہ نے اس تصویر میں ساری جزئیات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔سید مظہر علی نے خط کے ذریعے جمشید کو اطلاع دی کہ:

> ''.......نور چشمی منظور النساء سلمہا، بعارضہ تپ محرقہ راہی ملک عدم ہوئی، انا للّٰہ و انّا الیہ راجعون۔
> اوس مرحومہ نے مرتے وقت تمھیں معاف کیا۔تمہارا خدا بھی تمھیں معاف فرمادئے!''[۲۶]

قرۃ العین حیدر نے منظور النساء کے کردار کو سماجی زندگی کا ایک ایسا نمونہ بنا کر پیش کیا ہے کہ ناولٹ کا ہر قاری منظور النساء کا درد محسوس کرتا ہے۔منظور النساء اپنی پسماندہ زندگی کو قسمت سمجھ کر جی رہی تھی۔ملک تقسیم کے بعد تو جمشید میاں نے پاکستان میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے اور اب گیارہ سال کی طویل مدت کے بعد محمد گنج لوگوں سے ملنے آر ہے ہیں۔یہاں بڑے احترام سے ان کا استقبال ہوتا ہے۔اسٹیشن پر گوبندا اپنا یکہ لیے اس کا منتظر ہے۔

''بھیّا آئے گئین......!'' گوبندوا نے آگے بڑھ کر کہا۔

''گوبند.....چاچا.....؟'' اس نے ذرا جھجھکتے ہوئے چاچا کے لفظ کا اضافہ کیا....''تم کیسے آئے......؟''

چھوٹے شاہ جی بتائے رہن کی آج کی گاڑی سے آوت ہو۔'' ۲۷؎

محمد گنج میں مظہر علی کے مکان پر سبھی لوگ جمشید کا انتظار کر رہے ہیں اور جمشید سب کو متحیر انداز میں دیکھ رہا ہے۔ بچے جوان ہو گئے تھے، جوان ادھیڑ ہو چلے تھے اور بوڑھے قبروں میں پیر لٹکائے تھے۔ مصنفہ نے گاؤں کے سبھی طبقے کے لوگوں کو ایک ساتھ جمع کر کے گاؤں کی تہذیب اور ماحول کی سچی تصویر کو پیش کیا ہے۔ ناولٹ سے اقتباس ملاحظہ کریں:

''جمشید کی نظروں نے بہت سے مانوس چہروں کو تلاش کیا، جو اب موجود نہ تھے۔ چپاتی بھانڈ مر چکا تھا۔ سلامو ہوڑن مر چکی تھی جو نکڑ پر سگریٹ پان بیچا کرتی تھی۔ نواب مُنّن خان اب بھی ڈاکے ڈالتے تھے اور ان دنوں جیل گئے ہوئے تھے۔'' ۲۸؎

ناولٹ ''ہاوسنگ سوسائٹی'' میں قرۃ العین حیدر نے گاؤں کی سماجی اور تہذیبی معاشرت کو پیش کرنے کے ساتھ گاؤں کے کسانوں، مزدوروں، نوکروں، ڈومنیوں اور بھانڈ جیسے پسماندہ طبقے کے کرداروں کو بھی پیش کیا ہے۔ ناولٹ کے یہ پسماندہ کردار واقعے کے ساتھ لازم و ملزوم نظر آتے ہیں۔ مصنفہ نے گاؤں کے جس مسائل کو پیش کیا ہے یہ پسماندہ طبقے کے کردار اس مسئلے کو حقیقت کا روپ دینے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ناولٹ کے غریب اور پسماندہ کرداروں کی زندگی کو مختصر طور پر دیکھا جائے تو ناولٹ کے پسماندہ کرداروں میں شبیروا، درور کا پرسادا اور مدار بخش ہیں جو کلکٹر صاحب کے یہاں نوکر ہے۔ جھینگا باسی سید مظہر علی کے یہاں رہ کر ان کے کھیتوں اور باغوں میں کام کرتا ہے۔ سید مظہر علی گاؤں کا ایک غریب کسان ہے جو اپنے کھیت اور باغات کے ذریعے گھر کی معاشی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ سید مظہر علی اور جھینگا باسی کے پسماندہ حالت کا ایک منظر ملاحظہ کریں:

''انھوں نے (مظہر علی) سوتی، چکن پر گاڑھے کی چادر کا بکّل مارا ہوا

تھااور کنٹوپ پہن رکھا تھا اور ادھوڑی کے جوتوں کے ساتھ ہاتھ کے
بُنے ہوئے سرخ موزے پہنے تھے جن کی ایڑیاں نکل چکی تھی ۔ان کے
پیچھے پیچھے بڑا سا جھوّا سر پر اٹھائے جھینگا باسی اچکتا اور لنگڑاتا ہوا تیز تیز
چلتا شبیروا کو بہت قابل رحم سا معلوم ہوا۔دونوں آدمی بہت قابلِ رحم
معلوم ہوئے ۔اس نے تختی پر پوڈر چھڑکا اور'راجا ہریش چندر' نوٹنکی کی'
چیز' آلاپنے میں مصروف ہوگیا:

''ہم محلن کے باسی رے پنڈت
کت تک دور کاسی ۔کت تک دور........'' ۲۹

مذکورہ اقتباس کے ذریعے قرۃ العین حیدر نے جس منظر کو پیش کیا ہے وہ غور طلب ہے۔سید مظہر علی اور جھینگا باسی کی غربت وافلاس اتنی قابل رحم ہے کہ شبیروا جیسے پسماندہ طبقے کے نوکر کو بھی ان پر رحم آرہا ہے۔ دراصل مصنفہ نے دیہات کے اس پسماندہ زندگی کو دکھایا ہے جو مفلوک الحال زندگی گزار رہے ہیں اور ان کی معاشی اور معاشرتی حالت قابل رحم ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اس ناولٹ میں اعلیٰ طبقے کے امیر لوگوں کی زندگی کو پیش کرنے کے ساتھ ان کے یہاں کام کرنے والے ملازمین کی روزمرہ زندگی کو بھی پیش کیا ہے۔کلکٹر صاحب،ان کی بیٹی اور میم صاحب کے ساتھ ان پسماندہ ملازمین کی امانت داری اور اپنی ذمہ داری صاف نظر آتی ہے۔شبیر،مدار بخش اور بلاقن تینوں ملازمین کی ذمہ داری گھر میں الگ الگ ہے۔

''شبیروا مشعلچی نے سارے خیموں میں جا جا کر گیس کے ہنڈے،لیمپ
اور لالٹینیں جمع کیں۔ان کو باورچی خانے کی چھولڈاری کے سامنے لاکر
ایک قطار میں رکھا۔مدار بخش خدمت گار آئے اور اس قطار کے سامنے
آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور انہوں نے جھاڑن سے شیڈ اور چمنیاں
صاف کرنی شروع کیں۔........مدار بخش نے چمنیاں صاف کرنے کے

بعد بتیاں روشن کرنا شروع کیں۔

''شبیر......! بُلاقن کو بھیجو..........جنم جلی نے ابھی تک استری گرم نہیں

کی ہے...'' دور خیمے سے میم صاحب کی آواز آئی۔'' ۳۰؎

ناولٹ کے معاشرتی پس منظر میں دوارکا پرساد، جھینگا باسی، شاہنور علی، محمد گنج کی خانقاہ کا شبیروا، منظوریا، گووندا، آنند موہن گھوش وغیرہ ایک ساتھ رہتے ہیں۔ان سب کے مسائل مشترکہ ہے ان کے درمیان کسی طرح کی کوئی لکیر نہیں ہے۔ناولٹ کا مذکورہ منظر پسماندہ طبقے کے نوکر پیشہ لوگوں کی حالاتِ زندگی کو پیش کرتا ہے۔مصنفہ نے جہاں اعلیٰ طبقے کے لوگوں کی زندگی اور ان کے روزمرہ کے حالات کو پیش کیا ہے وہیں پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی کو بھی ناولٹ میں بیان کیا ہے۔اس ناولٹ کا زیادہ تر حصہ گاؤں دیہات کے کھیت منڈیر، یکّے، اڈّھے، بہیلیاں، سائکلیں اور کسانوں پر مشتمل ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو قرۃ العین حیدر کے ناولٹوں کا ایک بڑا حصہ پسماندہ طبقے کی طوائفوں، خانگیوں اور سماج کے نچلے طبقے کی زندگی اور ان کے مسائل پر مبنی ہے۔یہ لوگ سماجی غیر مساوات کا بری طرح سے شکار ہیں۔ان کی زندگی غریبی، بھوک مری اور معاشی تنگی سے بے زار ہے جو خوشگوار مستقبل کی خواہشات کی تکمیل کے لیے خود کو بیچ ڈالنے پر مجبور ہیں۔شخصیت کا انتشار، جنسی خواہشات سے جنم لیتا ہے اور پھر جب، یہ خواہشات ناآسودہ رہ جاتی ہیں تو انسان ان کا مداوا کرنے کے لیے نئے نئے حربے استعمال کرتا ہے۔مذکورہ ناولٹ کے کردار بھی اس کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔مصنفہ نے ان کرداروں کو حقیقت کا روپ اس طرح دیا ہے کہ ان میں طبقاتی اور سماجی تفریق بھی نظر آتی ہے اور تہذیبی عمل داری بھی۔'چائے کے باغ'، 'ہاؤسنگ سوسائٹی'، 'دلربا' اور 'اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو' یہ چاروں ناولٹ ایسے ہیں جو نہ صرف ناولٹ نگاری کے فن پر پورا ترتے ہیں بلکہ اس کے کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل مصنفہ کے عمیق مطالعہ اور مشاہدے کا بہترین نمونہ ہے۔ناولٹ کے کرداروں کو اس کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اس طرح اجاگر کرتی ہیں کہ انسانی زندگی کا ایک مکمل ڈھانچہ سامنے آجاتا ہے۔

....

حواشی:

۱۔ قرۃ العین حیدر کی ناولٹ نگاری کا اجمالی تجزیہ، از ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی، مشمولہ، سہ ماہی رسالہ نیا دور، خصوصی شمارہ، قرۃ العین حیدر نمبر، محکمہ اطلاعات و عامہ اتر پردیش، فروری تا مارچ ۲۰۰۹ء، ص ۵۱

۲۔ تانیثیت اور قرۃ العین حیدر کے نسوانی کردار، از اعجاز الرحمٰن، مطبع، کلاسک آرٹ پریس، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۹۱

۳۔ قرۃ العین حیدر کے چار ناولٹ کا تنقیدی جائزہ، از درخشاں پروین، مطبع، جوہر آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۲۰۱۶ء، ص ۱۵۴

۴۔ ''چار ناولٹ''، از قرۃ العین حیدر، ناولٹ 'چائے کے باغ' ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء، ص ۲۷۰

۵۔ ایضاً (چائے کے باغ) ص ۲۷۱

۶۔ مضمون 'قرۃ العین حیدر کے ناولٹ' از نیلم فرزانہ، مشمولہ، قرۃ العین حیدر، خصوصی مطالعہ، مرتب، ڈاکٹر عامر سہیل، بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۳ء، ص ۴۲۱

۷۔ 'عادت پڑ گئی ہے نقادوں کو ادب میں حکمرانی کی' گفتگو، از ڈاکٹر جمیل اختر، مشمولہ، نوائے سروش، مرتب ڈاکٹر جمیل اختر، ۲۰۰۱ء، ص ۱۰۴

۸۔ تانیثیت اور قرۃ العین حیدر کے نسوانی کردار، از اعجاز الرحمٰن، مطبع، کلاسک آرٹ پریس، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۵

۹۔ ''چار ناولٹ''، از قرۃ العین حیدر، ناولٹ 'اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو' ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء، ص ۳۹۵

۱۰۔ ''چار ناولٹ''، از قرۃ العین حیدر، ناولٹ 'اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو' ایجوکیشنل بک ہاوس، علیگڑھ،

۱۹۹۸ء، ص ۳۴۲

۱۱۔ ایضاً (اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو) ص ۳۵۷

۱۲۔ قرۃ العین حیدر کا فن، از عبدالمغنی، ماڈرن پبلشنگ ہاوس، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۴۶

۱۳۔ ایضاً (اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو) ص ۳۶۰

۱۴۔ ایضاً (اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو) ص ۳۷۱

۱۵۔ ایضاً (اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو) ۳۷۶

۱۶۔ قرۃ العین حیدر کا فن، از عبدالمغنی، ماڈرن پبلشنگ ہاوس، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۹۶

۱۷۔ قرۃ العین حیدر کے چار ناولٹ کا تنقیدی جائزہ، از درخشاں پروین، مطبع، جوہر آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۲۰۱۶ء، ص ۱۷۱

۱۸۔ اردو ناولٹ کا تحقیقی وتنقیدی تجزیہ، از ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی، مطبع، فیضی آرٹ پریس، گورکھپور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۵۶

۱۹۔ ''چار ناولٹ''، از قرۃ العین حیدر، 'دلربا' ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰۔۱۱

۲۰۔ ایضاً (دلربا) ص ۱۵

۲۱۔ ایضاً (دلربا) ص ۴۹۔۵۰

۲۲۔ ایضاً (دلربا) ص ۶۹

۲۳۔ ایضاً (دلربا) ص ۵۱

۲۴۔ قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری از ڈاکٹر سہیل بیابانی، مطبع، عفیف پرنٹرس، لال کنواں، دہلی ۱۹۹۸ء ص ۹۳

۲۵۔ ''پت جھڑ کی آواز''، از قرۃ العین حیدر، ناولٹ 'ہاؤسنگ سوسائٹی' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۵ء ص ۲۶۳

۲۶۔ ایضاً (ہاؤسنگ سوسائٹی) ص ۳۳۴

۲۷۔ ایضاً (ہاؤسنگ سوسائٹی) ص ۲۸۵۔۲۸۶

۲۸۔ ایضاً (ہاؤسنگ سوسائٹی) ص ۲۸۶

۲۹۔ ایضاً (ہاؤسنگ سوسائٹی) ص ۲۳۵۔۲۳۶

۳۰۔ ایضاً (ہاؤسنگ سوسائٹی) ص ۲۴۶۔۲۴۷

☆☆☆

باب چہارم

قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں پسماندہ طبقے کے کردار اوران کے مسائل: ایک تنقیدی جائزہ

قرۃ العین حیدر اردو ادب میں ناول نگار کی حیثیت سے ایک اہم نام ہے۔ان کے ناولوں کی فنی اور فکری جہتیں دور تک پھیلی ہوئیں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں کے مطالعے میں بہت کچھ تفہیم کے بعد مزید تفہیم کی گنجائش باقی ہے۔ان کے ناول کا مطالعہ مختلف زاویے سے کیا جاتا رہا ہے لیکن کرداروں کی طبقاتی تفریق میں پسماندہ طبقے کی زندگی کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے۔کیونکہ پسماندہ طبقے کا نام آتے ہی ہمارا ذہن پریم چند اور ترقی پسند مکتبۂ فکر کی طرف چلا جاتا ہے۔جہاں پسماندہ طبقے سے مراد گاؤں دیہات کے کسان اور مفلس مزدور افراد لیے جاتے ہیں۔جبکہ قرۃ العین حیدر کے فکشن میں جو پسماندہ طبقے کے کردار ہیں ان کا تعلق شہری زندگی سے ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں کا کردار نگاری کے حوالے سے تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے دانشورانِ ادب نے ان پر تنقید کی ہے کہ ان کے یہاں کرداروں کی زندگی کا دائرہ اعلیٰ طبقے تک محدود ہے گویا مصنفہ صرف اعلیٰ طبقے کی زندگی اور انہی کے مسائل کو پیش کرتی ہیں۔اس رائے سے ادب کا حلقہ متفق بھی نظر آتا ہے اور کئی دہائی گزر جانے کے بعد آج بھی ان کی تخلیقات کا مطالعہ اسی پس منظر میں کیا جاتا ہے۔مفکرین ادب کی رائے سے قطع نظر قرۃ العین حیدر کے ناولوں کے پسماندہ کرداروں کے حوالے سے بات کی جائے تو ان کے یہاں شہروں کے مظلوم، مفلس، غریب اور سماجی سطح پر نچلے طبقے کے کرداروں کی زندگی بھی نظر آتی ہے۔مصنفہ نے پسماندہ طبقے کی زندگی اور ان کے مسائل کو حقیقی پس منظر میں بڑی فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔مصنفہ کے تخلیقی فکر کے حوالے سے علی احمد فاطمی لکھتے ہیں کہ:

> ''قرۃ العین حیدر نے ابتداً رومانی نوعیت کا فکشن لکھا۔ان پر پہلے اپنے والد اس کے بعد کرشن چند کا اثر رہا۔''سفینۂ غم دل''،''میرے بھی صنم خانے'' میں مخصوص قسم کی رومانیت اور جذباتیت نظر آتی ہے لیکن تقسیم

ہند کے فسادات اور ہجرت نے انھیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ان
کے سوچنے کا انداز ترقی پسندانہ ہوتے ہوئے بھی جداگانہ تھا۔ وہ سماجی
حقیقت و اجتماعی جدوجہد کو محض اشتراکیت، لمحاتی حقیقت اور مادّیت
کے حوالے سے راست طور پر دیکھنے کے بجائے تاریخ کے وسیع تناظر
میں دیکھنے کی سعی کرتی ہیں۔''[۱] ص ۴۷ مقالات وروداد سیمنار خدابخش

یہاں ہم قرۃ العین حیدر کے ناولوں کے پسماندہ کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کا جائزہ لیں گے۔ان کے تخلیقی ناولوں میں ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینۂ غم دل''، ''آگ کا دریا''، ''آخرِ شب کے ہمسفر''، ''کارِ جہاں دراز ہے'' (تین جلد) ''گردش رنگ چمن'' اور ''چاندنی بیگم'' ہے۔مصنفہ کے ابتدائی دو ناولوں میں اعلیٰ طبقے کے مستحکم قدروں کا زوال اور اس کے بکھراؤ کا المیہ نظر آتا ہے۔وہ اپنے وسیع النظری کی بدولت تعلقہ دار طبقے کے زوال، باہمی رواداری، خلوص، تہذیب وثقافت اور تاریخ وتمدن کو اشتراکی نظریات کے ذریعے تباہ ہوتے دیکھ کر شدید ردِعمل کا اظہار کرتی نظر آتی ہیں۔ان کی ابتدائی تحریریں ان کے فکری وفنی اٹھان کو ظاہر کرتی ہیں، اور یہ وہی ابتداء ہے جو آگے چل کر ان کی تخلیقات میں اعلیٰ فنی وفکری شکل اختیار کیے ہوئے ہے۔

میرے بھی صنم خانے:

یہ ناول تین حصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے کو مصنفہ نے کوئی نام نہیں دیا ہے۔اس میں کرداروں کا تعارف اور صرف ان کی معاشرتی فکر پر روشنی پڑتی ہے۔دوسرے حصے کو ''دھنستے ہوئے ساحل'' کا نام دیا گیا ہے جس میں کہانی اپنے نکتہ عروج کو پہنچتی ہے مذکور عنوان کے مطابق ایک عہد کی تہذیب منہدم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔تیسرے حصہ کا نام ''منزل لیلیٰ'' ہے جہاں کہانی کلائمکس کو پہنچ جاتی ہے۔

ناول کا آغاز دوسری جنگ عظیم سے ہوکر ۱۹۴۷ء کے پرآشوب دور کے بعد کے حالات پر ختم ہوتا ہے۔ ناول کے ابتدائی صفحات میں تمام کرداروں سے متعارف کرایا گیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر سلیم، شہلا رحمٰن، کنور عرفان علی، رخشندہ بیگم، اوشیر مہری اور سید افتخار جو ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوکر پسماندہ اور اعلیٰ طبقے کے مابین طبقات کی عدم توازن کی تحریک چلا رہے ہیں۔ مزید کرداروں میں، پولو، پی چو، کرن، ول، گنی، ڈائمنڈ، کرسٹابل اور حفیظ احمد ہیں۔

ناول میں ہندوستان کا ایک سیاسی طبقہ مارکسی نظریات سے بہت متاثر نظر آتا ہے جس کی نمائندگی خورشید عالم کرتا ہے۔ خورشید عالم مارکسی نظریات اور نئی روشنی سے متاثر مزدور طبقے کا ترجمان نظر آتا ہے۔ مارکسی نظریات نے عالمی سطح پر پسماندہ طبقہ کو ذہنی طور پر بہت متاثر کیا اور یہ طبقہ ہر حال اور ہر قیمت پر تبدیلی چاہتا ہے۔ ناول میں تبدیلیِ حالات کے پس منظر میں تخلیق کار نے یہ واضح کیا ہے کہ اعلیٰ طبقے کو پسماندہ طبقے کی نئی ذہنی فکر سے خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اعلیٰ طبقے کی تہذیبی روایت کے مٹنے کا المیاتی اظہار کے ساتھ اعلیٰ طبقے کے دلوں میں پل رہے نفرت کی بیج کو بھی ابھارا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں

> ''انھیں چند چیزوں سے بے پناہ نفرت تھی۔ مثلاً وہ ان حقیر نو دولتوں کا ناقابل معافی وجود کسی طرح برداشت نہ کر سکتے تھے جنھیں اب تکلفاً اوپری یا متوسط طبقہ کہا جاتا ہے۔ انھیں متوسط طبقے سے چڑھ تھی۔ اس طبقے نے ہر ملک میں، ہر جگہ، ہر زمانے میں بڑی گڑ بڑ پھیلائی ہے بڑی بڑی گستاخانہ جراتیں کی ہیں۔ اس لڑتی جھگڑتی خود غرض، کاروباری، بورژوا دنیا میں سب سے الگ تھلگ صرف اپنے طبقے کے مٹھی بھر افراد کے ساتھ وہ پرانی تہذیب، پرانی روایات کے ورثے کو لیے بیٹھے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مخالف ہوائیں بہت تیز ہیں۔ کہاں کی تہذیب اور کہاں کی وضع داری۔''[۲]

ناول میں طبقات کے مختلف موضوعات کے تعلق سے بحث کی گئی ہے۔ دوسری جنگ عظیم ۱۹۴۷ کے

پس منظر سے پیش منظر تک کے حالات ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔اس میں بیک وقت سوشلزم مارکسزم اور کمیونزم بھی ہے۔ جہاں ایک طرف یہ ناول تہذیب کا مطالعہ پیش کرتا ہے وہیں دوسری طرف طبقات اور طبقات کے درمیان پائی جانے والی کشمکش کو بھی اجاگر کرتا ہے۔اس ناول میں پسماندہ طبقے کے کردار نظر نہیں آتے لیکن سماجی، سیاسی اور معاشرتی سطح پر پسماندہ طبقے کی زندگی اور حالات سے آگہی ضرور ملتی ہے، جس کی نمائندگی ترقی پسند سیاسی رہنما سید افتخار صاحب کرر ہے ہیں۔ناول میں جہاں پسماندہ طبقے کے سماجی مسائل کو دکھایا گیا ہے وہیں اعلیٰ طبقے کی تہذیب کے منہدم ہونے کا المیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ملک کی تقسیم کے بعد سماج کی تبدیلی نے بڑے بڑے عہدے داروں اور انسان کے مقدر کو یکسر تبدیل کر دیا۔

اس ناول میں نچلا طبقہ اعلیٰ طبقے کے ملازمین کی حیثیت سے متعارف ہوا ہے وہ صرف وفادار انسان کے طور پر سامنے آتا ہے۔اس کی سائیکی، اس کی ضرورت اور ان کردار کی زندگی یا ان کی خصوصیات کا کوئی تجزیہ پیش نہیں کیا گیا ہے۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''میرے بھی صنم خانے'' میں اعلیٰ اور متوسط طبقہ تو دکھائی دیتا ہے مگر نچلے طبقے کا گزر نہیں ہے۔ جو کسی بھی سماج اور تہذیب کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔ ناول کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں اعلیٰ اور متوسط طبقے کے لوگ اور ان کے مسائل دکھائی تو دیتے ہیں مگر نچلا طبقہ سوائے وفادار ملازم کے کچھ دیگر نظر نہیں آتا۔ دراصل ناول جس دور کی تہذیب اور سماج کی عکاسی کرتا ہے اس دور میں ہندوستان کا اعلیٰ طبقہ، سماجی اور تہذیبی سطح پر بحران کا شکار تھا۔

ناول ''میرے بھی صنم خانے'' ۱۹۴۷ کے تقسیمی مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ ناول زندگی کے جس رموز کو پیش کرتا ہے وہ تخلیق کار کے تجرباتی مسائل کا عکاس ہے۔ تقسیم نے انسان اور انسانی نظام کو درہم برہم کر دیا ہے۔ طبقاتی نظام بھی تبدیل ہو چکے ہیں۔ بہت سی زندگیوں نے عروج و زوال کا سبق بھی پڑھا۔

سفینۂ غم دل:

قرۃ العین حیدر کا یہ بنیادی وصف ہے کہ وہ اپنے قصے اور کرداروں کے ذریعے اپنے عہد کی تہذیب،

مزاج اور زوال پذیر صورتوں کو بڑے سلیقے سے پیش کرتی ہیں۔اسی وجہ سے قرۃ العین حیدر اپنے ہم عصروں میں نہ صرف منفرد نظر آتی ہیں بلکہ ان سے ممتاز اور برتر بھی دکھائی دیتی ہیں۔اس ناول سے ناول نگار کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی رجحانات سے آشنائی ہوتی ہے۔بالخصوص ان کے سیاسی نظریات بڑے واضح صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔''سفینۂ غم دل'' قرۃ العین حیدر کا دوسرا ناول ہے جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔

ناول ''سفینۂ غم دل''، موضوع کے لحاظ سے کسی حد تک ''میرے بھی صنم خانے'' کا تسلسل محسوس ہوتا ہے۔یہ ناول بے شمار کرداروں کے زیر اثر تقسیم سے پہلے اور بعد کے حالات پر تبصرہ کرتا ہے۔کرداروں کے ساتھ مصنفہ بھی ناول میں بذات خود واحد متکلم ''میں'' کی حیثیت سے موجود ہیں جو کہانی سناتے ہوئے، بدلے ہوئے وقت اور حالات کا تجزیہ بیان کرتی ہیں۔فواد کے ذریعے اعلیٰ طبقے کی ذہنی فکر اور پسماندہ طبقے کی زندگی کو پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ

> ''اسے ہر وقت یاد رہتا تھا کہ معاشرے کی طبقاتی سیڑھیاں جو نیچے کی طرف اترتی تھیں، وہاں، اس سے کیسی ہیبت ناک بے روزگاری اور مصیبت اور پریشانی کا دور دورہ تھا۔''[۳]

اعلیٰ طبقہ جو پہلے سے ہی مذکورہ حالات سے ماورا تھا وہ پسماندہ طبقے کی زندگی اور روزمرہ کے مسائل کو دیکھ کر خوف کھاتا ہے کہ کیسی مصیبت زدہ زندگی ہے۔اعلیٰ طبقہ سماج کے نچلے طبقے سے ہمدردی تو کرسکتا ہے لیکن ان کی صفوں میں آ کر ان کی طرح زندگی بسر کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ایک جگہ اور اس کی تصویر موجود ہے اقتباس دیکھیں:

> ''سیاسی کشمکش اور نفرت روزمرہ کی زندگی کی تکالیف اور معاشی مجبوریوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔اوپر کا طبقہ ان مصیبتوں سے محفوظ بہت بلند تھا۔لہٰذا وہاں پر مکمل امن تھا اور مکمل مفاہمت۔''[۴]

اعلیٰ طبقہ دوہرے رویے کا حامل ہے، وہ افراد کی مشکلات کا تذکرہ اور بلند بانگ تقریر کر کے گزر جاتے ہیں مگر اپنے مفادات پر ضرب نہیں پڑنے دیتے۔ان کی تمام ہمدردیاں اور تگ ودو اپنی اقدار اور اہمیت

کی تسکین کے لیے ہوتا ہے۔قرۃ العین حیدر نے ان تمام چیزوں کو ناول میں جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اوراعلیٰ طبقے کے چہرے سے مفاد پرستی کا نقاب بھی اتارا ہے۔

''سفینۂ غم دل'' کا ایک اہم کردار رضا میاں کا ہے۔رضا میاں اعلیٰ طبقے کا نمائندہ اور لکھنوی تہذیب کا مکمل نمونہ ہے۔رضا میاں خاص الخاص نواب ہیں اور نوابوں کی تمام خرافات ان کے مزاج میں موجود ہیں، عیاش انسان ہیں اوران کا مزاج عیش وعشرت کی آماج گاہ ہے۔رضا میاں کو اداکاری کا شوق تھا لہٰذا وہ تھیٹر میں کام کرتے تھے،رضا میاں تھیٹر میں کام کرنے والی مفلس اور پسماندہ طبقے کی اداکاراؤں سے رسم وراہ بھی رکھتے تھے۔نیز گھریلو ملازمین اور مزارعوں کو اپنی خاص جاگیر سمجھتے تھے۔جس کی ایک مثال بختاور کا کردار ہے۔

''تو بختاور ہے نہ''۔۔علی نے پوچھا

''جی ہاں''۔۔بھیا

''رضا بھیا نے میر چھمن سے میرا نکاح پڑھوادیا تاکہ میں کبھی ان کے گھر سے نہ نکل سکوں۔۔''

اپنے گھرانے کے اس ماحول سے شدید تکلیف اس (علی) نے محسوس کی۔اسے پتہ نہیں تھا کہ اس طرح کے واقعات وہاں آئے دن ہوتے رہتے تھے۔''۵؎قرۃ العین حیدر،سفینۂ غم دل،(۶۱)

بختاور کے آباواجداد نواب رضا میاں کے خاندانی ملازم تھے۔بختاور بھی اپنے خاندان اور ماں باپ کی طرح رضا میاں کی خاندانی ملازمہ ہے۔یہاں بختاور اور رضا میاں کا معاملہ مالک اور ملازمہ کا نہیں بلکہ آقا اور غلام کا ہے۔رضا میاں نے بختاور کی شادی ایک ادھیڑ عمر کے نواب میر چھمن سے کردی۔قرۃ العین حیدر نے بختاور اور میر چھمن کے عمر میں تضاد اور ناآسودہ بختاور کی عملی زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ناول کے پس منظر پر بختاور شادی کے بعد نفسیاتی الجھن میں مبتلا نظر آتی ہے۔کیونکہ بختاور آزاد خیال کی لڑکی ہے وہ خاندانی ملازمہ کے طور پر پوری زندگی قید میں بسر نہیں کرنا چاہتی تھی۔لہٰذا اس نے ایک دن گھر سے بھاگ جانے کا فیصلہ

کیااس کے بھاگنے میں میر چھمن کے چچا زاد بھائی نے مدد کی تھی۔اعلیٰ طبقے کی مرہون منت بختاور کا احتجاج کرنا نفسیاتی عمل ہے جو میر چھمن سے زبردستی شادی کرنے کی بنا پر ہے۔بختاور آزاد فضا میں کھلی زندگی گزارنا چاہتی تھی،اس نے بختاور سے سلطانہ مہ جبیں کا کامیاب سفر طے کیا،وہ اب بی۔بی۔سی،رڈیوں میں گلوکارہ کی حیثیت سے ملازمت کررہی ہے۔۔رضا میاں کی حویلی سے بھاگنے کے بعد ناول کے متعدد صفحات بختاور کی زندگی سے خالی ہے۔لیکن ناول کے اختتام پر ناول نگار نے بختاور کو دوبارہ علی کے سامنے پیش کیا ہے۔اس وقت علی ساجی سطح پر مختلف ذہنی الجھن میں مبتلا ہوتا ہے۔ناول سے منظر ملاحظہ کریں

> ''تسلیم میاں.....آپ یہاں کیا کررہے ہیں سڑک کے کنارے۔چلئے میں آپ کو گھر پہنچا آؤں۔۔۔''ایک لڑکی نے کار میں سے جھانک کر کہا۔
>
> ''گھر۔۔''علی نے کاغذ پر سے سر اٹھا کر ذرا جھینپتے ہوئے جواب دیا۔ گھر نہیں ہے۔۔۔۔۔لیکن تم کون ہو؟''
>
> ارے میاں۔آپ پہچانے نہیں۔۔۔؟ میں بختاور ہوں۔جس کو ایک رات آپ نے پناہ دی تھی۔۔۔میرے باپ دادا کی عمریں آپ کے یہاں دھان پھٹکتے گذریں۔۔۔۔آپ کو پتا نہیں۔۔۔''اس نے حیرت سے پوچھا۔۔۔۔میں سلطانہ مہ جبیں ہوں،جو ریڈیو میں گاتی ہوں۔بی۔بی۔سی سے میرے ریکارڈ نشر ہوتے ہیں۔............
>
> ''تم مجھے علی میاں کہتی ہو،گویا میں اب بھی تمہارا آقا ہوں۔''علی نے جھنجھلا کر کہا۔''ارے بھیا۔۔''اس نے اپنے خوبصورت سانولے بازوؤں کو اٹھا کر ان پر نظر ڈالی۔۔''آپ آقا نہیں ہیں تو اور کون ہیں۔۔۔۔میرے روئیں روئیں نے تو میاں آپ کا نمک کھایا ہے۔''[٦]

پسماندہ طبقے کی لڑکی بختاور رضا میاں کی خاندانی ملازمہ۔وقت کے بدلاؤ کے ساتھ ترقی کر کے

کامیابی کی منزل حاصل کرتی ہے اور مشہور گلوکارہ کی حیثیت سے علی کے سامنے موجود ہے۔ وہیں علی اعلیٰ طبقے کا نمائندہ ہے، جو بدلتے وقت کے سیل رواں میں بہتا ہوا پسماندہ زندگی گزار رہا ہے۔ بختاور کے پوچھنے پر کہتا ہے میرا کوئی گھر نہیں۔ دراصل یہ اعلیٰ طبقے کی پسماندگی کا المیہ ہے۔ ناول کے مذکورہ کرداروں کی زندگی بہت بڑی تبدیلی کا عکس ہے۔ ناول میں ایک طرح سے بے سمتی کا احساس ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ تمام کرداروں کے اپنے مسائل ہیں، وقت اور حالات کے زد میں سبھی کی زندگی تبدیل ہوگئی ہے۔ حتیٰ کہ سماجی اور تہذیبی نظام میں بھی بہت بڑی تبدیلی نظر آتی ہے۔

پونم وشاریہ، ناول کے کرداروں میں پسماندہ طبقے کا کردار ہے۔ پونم وشاریہ کی دہری زندگی ناول کے صفحات پر نظر آتی ہے۔ پونم وشاریہ، پسماندہ طبقے کے غریب ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے، اس کی پانچ بہنوں میں ایک کوٹی۔ بی ہوچکی ہے، ایک بہن ریلوے کے ٹکٹ بیچنے والے کے ساتھ بھاگ گئی ہے، تیسری کو ہسٹریا ہوگیا ہے اور ماں کی زندگی گلی میں رہنے والے بھٹیارنوں کی سی ہے جو ساس اور محلے والوں کو گالیاں دیتی رہتی ہے۔ یہ گھر معاشی طور پر پسماندہ حالات سے دوچار ہے قرۃ العین حیدر نے اس طبقے کی نفساتی زندگی، حالات اور معمولات کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مارکسی انقلاب کے بعد ہندوستان میں نوجوان طبقہ اشترا کی نظریے سے بے حد متاثر ہوا۔ چاروں طرف برابری کی لہر دوڑ رہی تھی اور حکومت کا عمل بھی اعلیٰ طبقے کے ساتھ روانہ تھا۔ جاگیرداروں کی املاکیں حکومت اپنے قبضے میں لے رہی تھی اور بقیہ چیزوں پر پسماندہ طبقے کے لوگ قابض ہو رہے تھے۔ لیکن پونم وشاریہ کا انداز عمل اشترا کی تحریک کے گروہ سے الگ نظر آتا ہے۔ پونم وشاریہ حالات کا فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنی قابلیت کے بنا پر اوپری طبقے میں شمار ہونا چاہتا ہے۔ اس نے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے سیاسی پارٹی میں شامل ہونے کے بجائے مقابلہ جاتی امتحان پاس کر کے اعلیٰ منصب حاصل کرتا ہے۔

''سفینۂ غم دل'' سپاٹ پلاٹ میں بنے ہوئے کردار، اعلیٰ طبقہ جس کی بے حد خوشحالی، ان کی زندگی کو سپاٹ بنائے ہوئے ہے، پورے ناول کو پڑھ جایئے ان کی زندگیاں اسی طرح سیدھی چلتی ہیں جس طرح ندی کا پانی آہستہ خرام سکون اور اطمینان سے بہتا ہے اور اس میں تلاطم اس وقت پیدا ہوتا ہے جب نچلے طبقے سے

اٹھ کراوپری طبقے میں شامل ہوجاتا ہے۔ پونم وشاریہ نچلے پسماندہ طبقے کا وہ کردار ہے جو وقت کے سہارے یا مارکسی تحریک کا سہارا لے کراوپری طبقے میں شامل نہیں ہوا ہے بلکہ یہ اس کی تعلیم اور محنت کا نتیجہ ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

''یہ کارکس کی ہے۔۔؟ برآمدے سے باہر آتے ہوئے اسٹیلا نے ٹھٹھک کر نیلے رنگ کی ایک برق رفتار تازہ ترین اسپورٹس ماڈل پر نظر ڈالی جو امیر متوسط طبقے کے نو دولتے پن کی طمانیت کی ٹھوس علامت بنی برساتی میں کھڑی تھی۔''[۷]

یہاں قرۃ العین حیدر کی وہ حقارت بھی نمایاں ہوجاتی ہے جو نچلے طبقے کے حوالے سے اس طبقے (اعلیٰ) کے یہاں پائی جاتی تھی مگر بدلے ہوئے حالات میں بہت کچھ برداشت کیا جارہا تھا۔

''پونم مہیشور وشاریہ'' جو نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ نام، عہدہ اور دولت حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ طبقے میں شامل ہو چکا ہے۔ یہاں اس ناول میں طبقات کی تقسیم دولت اور نامور عہدوں کی وجہ سے بھی دکھائی گئی ہے۔ بدلے ہوئے حالات میں جب اشرافیہ کا خاندانی وقار اور جاگیریں سب تباہ ہو چکا ہے اور سرمایہ دار طبقہ نئے طبقے کے طور پر ابھر رہا ہے تو طبقات کی تقسیم کی ساری سائیکلو جی بھی تبدیل ہوگئی ہے اور بدلے ہوئے حالات اور بدلے ہوئے معاشرے میں وہی طبقہ اعلیٰ ہے جس کے پاس دولت ہے۔

پونم مہیشور وشاریہ، میرا کے لیے بردکھاوے کو آیا ہے مگر میرا، فواد کے ساتھ جا چکی ہے۔ جس کے باعث مہندر صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہے اور اب اسٹیلا اور لیلیٰ اسے لینے جارہی ہیں جبکہ ان کی گاڑی خراب ہوگئی ہے اور انھیں وشاریہ سے لفٹ لینی پڑتی ہے۔ تب انہیں اس شخص کی حقیقتِ حال معلوم ہوتی ہے جو نچلے طبقے سے اوپری طبقے میں شامل ہوا ہے۔ اقتباس دیکھیں:

''تکلیفیں کتنی مصیبتیں اٹھائی ہیں تمہیں بچپن میں کتنی بار بھوکا رہنا پڑا۔ تمہارا کیسا گھر تھا جہاں رات کو اکثر لالٹین بھی نہ جل پاتی تھی۔۔وہ آہست آہستہ کہتا رہا۔ زندگی کی سب سے بڑی مجبوری افلاس

ہے۔۔۔آج اس عجیب وغریب طریقے سے آپ کا ساتھ ہوا ہے۔
مجھے پتہ ہے کہ آپ سب میرے نام، میرے وجود تک سے نفرت کرتے
ہیں۔ میں گویا آپ کی زندگی کے دل چسپ طریقے کا وہ لازمی ویلن
ہوں جسے ایک روز آ کر ظاہر ہونا تھا۔''۸

یہاں مارکسزم کا طبقاتی انقلاب رونما ہو چکا ہے جو پونم وشاریہ کے شکل میں اعلیٰ طبقے کے سامنے اپنے وجود کو منوا رہا ہے۔ دوسری طرف ناول کے اسی حصے میں مصنفہ نے نچلے طبقے سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے اور ساتھ ہی اس طبقے کا ردِ عمل بھی پیش کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

''آج کی رات۔ وہ اسی آواز میں آہستہ آہستہ کہتا رہا۔۔آج کی رات تم
سب میری مٹھی میں ہو۔ تمہارے طبقے کا استحکام اور بقا کا صرف میرے
رحم وکرم پر انحصار ہے۔'' اس نے میری طرف جھک کر کہا ''سارا سیٹ
اپ میرے قبضے میں ہے۔ کیا تم میرے عہدے کی عظمت سے واقف
نہیں۔۔؟ نہ غالباً تم یہ جانتی ہو کہ ملک کے سارے اعلیٰ ترین ہندو
گھرانوں سے جن میں کئی راجواڑے بھی شامل ہیں، میرے لیے پیام
آ چکے ہیں۔۔ یہ تمہاری اصلیت ہے جس کو میں نے پہچانا ہے۔''۹

نفرت کے اس اظہار کے ساتھ ہی جاگیردارانہ نظام اپنے کھوکھلے پن کے ساتھ زمین بوس ہوتا دکھائی دیتا ہے اور مصنفہ کسی حد تک غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنے میں کامیاب رہی ہیں ناول کے اختتام پر وہی تقسیم، تبدیلی اور پرانے فیوڈل نظام کا اختتام وغیرہ دکھائی دیتا ہے۔

آگ کا دریا:

''آگ کا دریا'' ناول کا آغاز ہندوستان کی ڈھائی ہزار سال قبل کی تاریخ سے ہوتا ہے اور یہ چار

حصوں میں منقسم ہے۔اس وقت ہندوستان میں آریہ عہد کی ابتداء ہوچکی تھی اور ہندوستانی معاشرہ مختلف ذاتوں میں تبدیل ہوگیا تھا۔قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں پانچ طبقات یعنی کشتری، برہمن، ویش، شودر، اور چنڈال کا ذکر کیا ہے۔ذیل میں اس منظر کو ملاحظہ کریں:

''تاریک جنک جنگلوں میں گروکل بنے تھے جہاں ملک کے نوجوان لڑکے شہزادے اور مفلس، برہمن۔۔اور کشتری امیر زادے علم حاصل کرنے میں جٹے تھے۔''

''ویش ناریاں چھن چھن کرتی اپنی گلیوں میں ٹہلتیں۔امیر زادیاں سولہ سنگھار کیے تھالیوں میں گھی کے چراغ جلائے مندروں کی اور جاتی نظر آتیں۔''

''آبادی میں الگ تھلگ چنڈالوں کی بستی تھی ان کا پنجم طبقہ چاروں ذ اتوں سے کم تر تھا۔محض لاشیں اٹھانا اور مردے جلانا ان کی قسمت میں لکھا تھا یہی ان کا پیشہ تھا۔وہ صرف مردوں کی اترن پہن سکتے تھے۔ان کو حکم تھا کہ ٹوٹے پھوٹے برتنوں میں کھانا کھائیں اور محض کانسی کے گہنے استعمال کریں۔''

''آدمی پیدائش کی بناء پر نہیں عمل کی بناء پر ملیچھ یا اچھوت بنتا ہے اور اب نارنجی لباس والے بھکشوں کی ٹولیاں بستی بستی گھوم کر چنڈالوں اور اچھوتوں کو نیک عمل کی تلقین کررہی تھیں۔'' [۱۰]

ہندوستان کے قدیم طبقاتی نظام میں کشتری کا شمار سب سے اعلیٰ طبقے میں ہوتا تھا جن کے فرائضِ منصبی میں جنگی سرگرمیاں شامل تھیں جبکہ برہمن مذہبی امور انجام دیتے تھے ان کا تعلق دوسرے درجے سے تھا۔اور تیسرے درجے کے طور پر ویش تھے جو تجارت کرتے تھے اور شودر ہندوستان کے اصل باشندے تھے جنھیں داس (غلام) بنالیا گیا تھا اور چنڈال سب سے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کی حیثیت جانوروں

سے بھی بدتر تھی۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرۃ العین حیدر برصغیر میں ہمیشہ سے ہونے والی مختلف طبقاتی تقسیم کو محسوس کرتی تھیں۔ کہ انسان مختلف گروہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ہی وہ اپنا الگ پیشہ اپناتے ہیں اور وہی ان کی طرز زندگی کی بنیاد بھی ہوتے ہیں اسی طرح برصغیر کا معاشرہ بھی ذات پات کی تقسیم میں گرفتار ہے اور اس سے کبھی بھی نجات نہ پا سکا۔ اور اگر اس میں کچھ تبدیلی بھی آئی ہے تو وہ صرف سطحی حد تک ہے، ان تمام باتوں کی صراحت ناول کے اختتام تک کی گئی ہے۔

برصغیر چوں کہ ہمیشہ سے ہی غیر ملکی اقوام کے لئے قابل توجہ سرزمین رہی ہے لہٰذا اس کی ساخت و پرداخت میں کم وبیش ان بیرونی ملک کے اقوام کی آمد کے طفیل میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں۔ مگر ان سب کے باوجود آریہ کا قائم کردہ طبقاتی نظام، سماج میں سب سے زیادہ اپنے اثر ورسوخ کو ثبت کرنے اور معاشرے کی ہئیت کو بنانے میں اہم کردار رہا ہے۔ تاریخی پس منظر میں دیکھیں تو کسی حد تک اس آریائی نظام نے ہندوستانی معاشرے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا، کئی دہائیاں گزرنے کے بعد بھی ہندوستان کے لوگ اس نظام سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کرا سکے، اس کا منظر قرۃ العین حیدر کچھ یوں بیان کرتی ہیں۔

> ''اجات سترو کے پوتے کے بعد مہا پدم نند، پاٹلی پتر کے تخت پر قابض ہوا اس کی ماں شودر تھی۔ باپ نائی، یہ مہا پدم پتی نند تھا۔۔۔ بے حدو حساب دولت کا مالک اور اگر سین تھا۔ زبردست فوجوں کا سپہ سالار اس کے بعد اس کے آٹھ بیٹے بارہ سال کے عرصے میں یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے اور اسی لئے یہ خاندان نو نند کہلایا۔[۱۱]

برصغیر کی تاریخ میں شودر جس کی حیثیت ایک پست ترین طبقے تک ہی محدود تھی ان کا اقتدار کی کلید پر قابض ہونا اس معاشرے کی نظر میں ایک طرح کی انہونی تھی اور آویزش کا باعث بھی کیونکہ برہمنوں اور کشتریوں کے لیے ایک انسانی ادنی طبقے (شودر) کا حاکم کہلانا غیر ممکن اور نا قابل برداشت تھا۔

> ''سارے دیش میں برہمنوں کا اور کشتریوں کا راج تھا۔ سندھ کی وادی

میں برہمنوں کی حکومت تھی ،لیکن مگدھ میں مہا پدم پتی نند کے عہد سے
کشتریوں کی حکومت کا خاتمہ شودروں کے دور کا آغاز ہوا تھا۔''۱۲؎

مگدھ میں شودروں کا برسر اقتدار آجانا اعلیٰ ذاتوں (برہمن اور کشتری) کے لیے نا قابل برداشت امر تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شودر برصغیر کی اصل نسل قرار دیئے جاتے تھے۔ جنھیں آریہ نے اپنی ملکیت میں لے کر غلامی کی زنجیروں میں مقید کر لیا تھا تا کہ وہ کبھی بھی ان کی برابری نہ کر سکیں لہٰذا انھیں شودر یعنی ملیچھ (ناپاک) قرار دے دیا گیا تھا۔ اور ایک طرح سے یہ بات اعلیٰ نسل کے لئے ایک چیلنج کا باعث بھی تھی۔

''شراوستی والے مگدھ کے باسیوں کو پہلے ہی کب خاطر میں لاتے تھے۔
برہمنوں کا احساس برتری۔۔۔۔آریوں کے اس دور کی یادگار تھا جب
انھیں ڈینیوب کے ساحلوں پر قبائلی فوقیت حاصل تھی اس زمانے میں
روما کا ہم عصر سماج اور اور فرانس کا کیلٹک معاشرہ کاہنوں، جنگجو سپاہیوں
اور عام کاریگروں کے فرقوں میں بٹا ہوا تھا اور اس احساس برتری
کا برہمنوں کے پاس بہر حال کوئی علاج نہ تھا''۔۔۔اور گو طالب علم کا
فرض تھا کہ وہ نسل اور ذات کے غرور سے بچے لیکن گوتم اور اس کے
جمہوریت پسند ساتھی، شودروں کو بہر حال برداشت نہ کر سکتے تھے۔''۱۳؎

درج بالا عبارت میں ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو برصغیر کا المیہ ہے۔ ہر عہد میں طبقاتی تفریق کسی نہ کسی طور پر موجود ہے۔ نیز روم وفرانس سے آنے والی سامراجی قوتوں کی حالتِ زار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ بھی ابتداء میں اسی طرح کی طبقاتی تقسیم کا شکار تھیں۔ اس تفصیل سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ قرۃ العین حیدر تمام دنیا کی مختلف النوع طبقات میں منقسم ہونے والی بات سے بھی واقفیت رکھتی تھیں، کہیں اعلیٰ طبقات برسر اقتدار ہیں تو کہیں نچلے طبقے نے اپنی بقاء کی جنگ جاری رکھی ہوئی ہے، کہیں یہ جنگ جیتی جا چکی ہے۔ کہیں طبقات کے درمیان آویزش اور کشمکش ہے تو کہیں منافرت یا مفاہمت کی فضا ہے۔ ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہو جاتی ہے کہ قرۃ العین حیدا ایک عمیق نگاہ رکھنے والی مصنفہ ہیں جو تاریخ

میں پھیلے ہوئے تذبذب کو نہ صرف دیکھتی اور محسوس کرتی ہیں بلکہ اس کو احساس دلانے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔

> ''وقت گزرتا جارہا ہے دیس پر اب مور کے نشان والے شہنشاہ کا راج ہے، وہ جو دیس کی چترانت ریاست کا پہلا سمراٹ ہے۔ اتہاس پران میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ بادشاہوں کے نسب نامے لکھنے والوں کے قلم یہاں پہنچ کر رک گئے ہیں۔ یہ پر یہ درشن ہری چندر، انسانوں کا چاند، جو پاٹلی پتر کے سنہاسن پر طلوع ہوا ہے۔۔۔ یہ شودر ماں کا بیٹا جسے گڈریوں نے پالا، جسے چانکیہ نے تکشلا میں پروان چڑھایا اب نئی تواریخ لکھوائے گا۔ روایت کے زمانے ختم اور نندوں کے نناوے کروڑ اشرفیوں کے خزانوں کے قصے خواب وخیال ہوئے۔''[۱۴]

نندوں کے بعد چندر گپت موریا مگدھ کا جانشین بنتا ہے۔ چندر گپت موریا کی ماں بھی پسماندہ طبقے کی شودر ذات سے تھی۔ قرۃ العین حیدر نے ابتدائی حصے میں واقعہ کا بیان سرسری انداز میں نہیں کیا ہے بلکہ حقیقت نگاری کے ساتھ سماج کے تمام پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ جس میں ہر طبقے کے لوگ موجود ہیں۔ ان کی زندگی کا طرزِ عمل، سماج کے طبقاتی نظام میں اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کی تفریق کو آئینہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ابتدائی حصے میں طبقاتی نوعیت کے امتیازات کے بعد، ناول کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ عہد بدلتا ہے۔ ناول کے کردار اپنے اپنے جسم سے کھول اتارتے ہیں اور نئے عہد میں نئے انسان کا روپ اختیار کرتے ہیں اور وقت کے تسلسل میں شامل ہو جاتے ہیں۔

دوسرے دور میں عربوں کا ہندوستان آنے کا ذکر کیا ہے۔ ابوالمنصور کمال الدین 'سرجوندی' کے کنارے نظر آتا ہے۔ کمال الدین اپنے ملک کا ایک فلسفی ہے، جو تاریخ لکھنے پر معمور ہے۔ اسی غرض وسبب وہ ہندوستان کا سفر کرتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ابوالمنصور کمال الدین کے ذریعے ہندوستان کے مختلف امور کو پیش کیا ہے۔ کمال الدین، بادشاہوں، چھتری راجاؤں کے دربار، امراء، وزرا اور سپہ سالاروں کی دنیا سے نکل کر ہندوستان کی ایک دوسری دنیا میں آتا ہے جو دیہات کے مزدور کسانوں کی تھی، جہاں غریب، مفلس اور

پسماندہ طبقے کے چھوٹی ذاتی کے لوگ قیام کرتے ہیں۔اس منظر کا اقتباس ملاحظہ کریں:

''اس دوسری دنیا میں مزدور اور نائی،اور موچی اور کسان اور غریب کاریگر آباد تھے۔ یہ جمہوری ہندوستان تھا اور اس ہندوستان پر ان خرقہ پوشوں کی حکومت تھی۔ کاریگروں کی منڈلیاں ان سے وابستہ تھیں۔ اسلام کی مساوات ان ہندو بھگتوں کو متاثر کررہی تھی۔اسلام تو امن پسند صوفی اس دیس میں پھیلا رہے تھے۔ یہاں تلوار کا ذکر کہاں تھا۔ ہزاروں برس کے ستائے ہوئے اچھوت ان سنتوں کے پاس بیٹھ کر رام کا نام لے رہے تھے۔اونچی ذاتوں کے برہمنوں کا یہاں کون دخل تھا۔ یہ بڑی نرالی دنیا تھی۔اس میں ہندو مسلمان کا سوال نہیں تھا۔یہاں محبت کا راج تھا۔اور کمال، جو انسان کی تلاش میں سرگرداں تھا، اس نے دیکھا کہ دنیا میں بھیڑیوں کے علاوہ انسان بھی بستے ہیں۔ یہ اہیر جس نے چوپال میں بٹھلا کر ستّو حاضر کیا تھا،اس کی جان لینا نہیں چاہتا کیونکہ اسے کسی سلطنت کو حاصل کرنے کی تمنا نہیں۔اسے تو دونوں وقت باجرے کی روٹی مل جاتی ہے اور وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے،اسے ملکوں کی سیاست سے کیا مطلب۔ یہ کسان جو اس کے سامنے خوش خوش منڈیر پر بیٹھا اپنی چھوٹی سی بچی کو بیر کھلا رہا ہے،اسے کیا پرواہ کہ دلی میں آئندہ کون حکومت کرے گا؟ سلطان حسین حاکم ہو تب بھی وہ اسی طرح ہل چلائے گا اور لگان ادا کرے گا اور سلطان سکندر بادشاہ ہو تب بھی۔ ان ''ترکوں'' سے پہلے جب پرتھوی راج بادشاہ تھا تب بھی اس کے باپ دادا یونہی جیٹھ کی دھوپ میں ہلکان ہوتے تھے۔ساون میں گاتے تھے۔قحط پڑتا تھا تو خاموشی سے مرجاتے تھے۔''[۱۵]

قرۃ العین حیدر نے مذکورہ طویل اقتباس میں ہندوستان کی اس حقیقی دنیا کو پیش کیا ہے جو آج بھی وسیع وعریض علاقے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ دیہات کے پس منظر میں بھی طبقاتی تفریق نظر آتی ہے جہاں اچھوت اور نچلی ذاتی کے لوگ مختلف طرح کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جولاہوں، کسانوں اور دوسرے پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی، اعلیٰ طبقہ اور شہری منصب داروں سے قدرے مختلف تھی۔ پسماندہ طبقے کے غریب لوگوں کو مراتب اور منصب سے کوئی سروکار نہیں، وہ صرف اور صرف انسان پرست لوگ تھے اور ان کا مقصد بھی انسانیت سے تھا۔ پسماندہ طبقے کا کسان اپنے کھیت میں اور مزدور پیٹ کے لیے محنت ومشقت کرتا ہے۔ اسے تاریخ اور واقعات سے کوئی لینا دینا نہیں۔ کاشی کا اہیر، کمال الدین کو کھانا کھلاتے ہوئے کہتا ہے کہ ذات پات اور اونچ نیچ کے بھید بھاؤ میں کیا رکھا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ بھوک ہے، کسی بھوکے کو کھانا کھلانا کتنا سکون اور نیکی کا کام ہے۔ قرۃ العین حیدر نے پسماندہ طبقے کے غریب اور مزدور لوگوں کی سادہ دلی اور انسان پرستی کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ گاؤں دیہات کے یہ غریب لوگ مفاد پرستی سے بالاتر نظر آتے ہیں۔

وقت کی رفتار کے ساتھ کمال الدین جب ہندوستان میں داخل ہوا تھا تو اسے چمپا سے محبت ہوگئی تھی۔ لیکن چمپا سے محبت کرنے کے بعد بھی کمال مذہبی تفریق کی وجہ سے شادی نہیں کر پاتا۔ مگر بدلتے وقت کے ساتھ وہ شنیلا کو آمنہ بی بی بنا کر اس سے شادی کر لیتا ہے جو نیچ ذات اور پسماندہ سماج کی لڑکی ہے۔ تخلیق کار نے یہ وضاحت کی ہے کہ مسلمانوں کے یہاں اونچ نیچ کی طبقاتی تفریق نہیں ہے لیکن مذہبی تفریق ضرور موجود ہے۔ یہی وجہ کہ کمال شنیلا کو آمنہ بی بی بننا پڑتا ہے۔ اقتباس دیکھیں:

> ''ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ دربارِ جونپور کے ایک امیر کی حیثیت سے یہاں آیا تھا، وہ دربار اس وقت لٹ چکا تھا لیکن حسین شرقی اور اس کے ساتھیوں کی شان وشوکت بہرحال باقی تھی لیکن دنیا تو اب مدتیں ہوئیں، جونپور کے ابوالمنصور کمال الدین کو بھول چکی تھی ۔۔۔ اسی طرح گھومتے پھرتے وہ سونار گاؤں پہنچا اور وہاں اس نے شادی کر لی۔ اس لڑکی کا نام شنیلا تھا، وہ ذات کی شودر تھی ۔۔۔ شنیلا اب اس کی بیوی

تھی، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ شودر ہونے میں کیا قباحت ہے۔اس نے
شنیلا کا نام آمنہ بی بی رکھا۔''۱۶؎

شنیلا سے آمنہ بی بی کا مرحلہ مذہبی تفریق کی مثال ہے۔ جسے تخلیق کار نے ناول کے اس حصے میں نمایاں کیا ہے۔ ہندوستان کا یہ پسماندہ طبقہ جو معاشی طور پر بہت کمزور ہے قرۃ العین حیدر نے اس طبقے کے حالات کا جائزہ معاشرتی سطح پر پیش کیا ہے۔ شنیلا کا کردار جذبات واحساسات اور نفسیات حالات کے اسی ستم گری کے سبب سمجھوتا کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔ دراصل بدلتے وقت میں عروج وزوال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سماجی اور معاشی سطح پر پسماندہ طبقے کی زندگی کا تعین مال ودولت سے ہونے لگا تھا۔

مسلمانوں کے بعد انگریزی دور حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ ایک آفاقی حقیقت ہے کہ انسان کے پاس اچانک دولت آجائے یا اچانک کوئی منصب مل جائے تو انسان اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پاتا۔ یا یوں کہہ لیں کہ کسی طبقے کو جب چیزیں فراوانی اور بہتات کے ساتھ ملنے لگیں تو اس کا ظرف ان تمام اشیاء کا محتمل نہیں ہو پاتا اور وہ اپنی اقدار، اپنا لبرل ازم سب کچھ چھوڑ کر زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی دوڑ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہاں آکر انگریزوں نے بھی اپنے آپ کو اپنی نئی حیثیت کے مطابق ڈھال لیا۔

''ہندوستانی نوابوں اور انگریز اونچے طبقے نے آپس میں سمجھوتا کرکے
ایک انتہائی پسند مہذب فضا کی بنیاد ڈالی تھی۔۔۔سرل، شنیلا کو اپنی کوٹھی
میں داخل کرکے گویا باقاعدہ نواب بن گیا تھا۔۔۔۔ ہر معاشرے کی
اپنی اقدار بن جاتی ہیں، یہ اس وقت کا عام دستور تھا۔۔۔۔ بہت سے
انگریزوں نے اونچے مسلمان گھرانوں میں شادیاں کی تھیں۔''۱۷؎

سرل ایشلے مفلوک الحال باپ کا بیٹا ہے جو لندن سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آتا ہے۔ راستے میں اس کی ملاقات 'ماریاٹریزا' سے ہوتی ہے۔ ماریاٹریزا کا باپ انگریز اور ماں ہندوستانی تھی۔ ماریاٹریزا نئے معاشرتی تہذیب کی پیداوار تھی جس کا ذکر مذکور اقتباس سے واضح ہے۔ سماج کے دونسلی نیٹو جنریشن کو چھوٹی ذاتی میں شمار کیا جاتا تھا اور سوسائٹی میں ان کی حیثیت پسماندہ طبقے کی تھی۔ قرۃ

العین حیدر نے ناول میں ماریا ٹریزا کی نسلی وجود کا ذکر کرتے ہوئے اونچ نیچ کے فرق کو بھی واضح کیا ہے۔

اس طرح کے واقعات برعظیم کی تاریخ میں رقم ہوتے رہے ہیں۔ایک طرف ہندوستان میں اسلامی و عیسائی کلچر پروان چڑھنے لگا۔ساتھ ہی نسلی امتیازات بھی آہستہ روی سے پروان چڑھتے رہے۔تاریخی حوالے سے دیکھا جائے تو جب بھی ہندوستان میں بیرونی ملک کے لوگ آئے یہاں کی تہذیب وثقافت اور ملک کے زمینی افراد کے ساتھ مختلف نوعیت کے المیے بھی پیش آئے۔جن میں ایک المیہ یہاں کے غریب خواتین کا استحصال ہے اور وجود میں آنے والی نسل استحصال طبقہ کے طور پر ابھرتی ہے۔جس کی بے رحمی کی مثال یوریشین طبقہ تھا۔

> ''یوریشین طبقے کی بنیاد پرتگالیوں کی آمد کے زمانے میں پڑی تھی ، پھر فرنچ اور ولندیزیوں نے آکر اچھوتوں کو عیسائی کیا، جو شخص بوٹ اور ہیٹ پہن کر بگڑی ہوئی پرتگالی بول لے وہ یوریشین سمجھا جاتا تھا فرانسیسیوں میں نسل تعصب نہیں تھا۔ان کی آمد سے اس طبقہ میں اضافہ ہوگیا۔یورپین بڑے قابل رحم لوگ تھے۔بے چارے کرانی ، جو انگریز برہمنوں کے مقابلے میں شودر اور چنڈال کی حیثیت رکھتے تھے۔''۱۸

یہاں پہنچتے ہوئے قرۃ العین حیدر نے جس طرح تہذیب وتمدن میں آنے والی تبدیلیوں کو پیش کیا ہے، طبقات کی تقسیم میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا جس طرح اظہار کیا ہے اور برعظیم کی زمینی حقیقت میں موجود ذات پات کا نظام، سب کے درمیان باہم ربط استوار کیا ہے، وہ قرۃ العین حیدر کے طبقاتی شعور کا بہترین ثبوت ہے۔شودر اور چنڈال ابتدائی برعظیم کا نچلا اور ذلیل طبقہ سمجھا جاتا تھا، اب وقت کے دھارے میں بہہ کر یورپین طبقہ میں تبدیل ہوگیا۔مصنفہ نے اس ناول میں گزرتے وقت کے ساتھ سب کچھ تبدیل ہوتے ہوئے دکھایا ہے لیکن معاشرے میں طبقاتی نظام کے پیمانے اور پسماندہ طبقے کی زندگی میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی ۔عہد بدلتے ہیں ، اشیاء و جاندار قالب بدلتے ہیں، مگر کسی بھی سماجی نظام کی جڑوں میں موجود طبقاتی تفریق کا زہر اور اس کی تاثیر آئندہ نسلوں تک پہنچتی ہی ہے۔اس کی مثال ہر زمانے میں موجود ہے، اعلیٰ

طبقہ یا دولت مند طبقہ پسماندہ طبقے کا استحصال ہر زمانے میں کرتا ہے، جس کی مثال ملاحظہ کریں:

''اب کلکتے کے مارواڑیوں کا ایک نیا طبقہ پیدا ہوا تھا جو کمپنی کے ساتھ تجارت کر کے اور مقامی حکمرانوں اور کمپنی کی ریشہ دوانیوں میں حصہ لے کر روپیہ بنا رہا تھا۔ یہ بنگال کے بنیوں کا نیا طبقہ تھا۔ جاگیر دار اور کسان کے درمیان کا یہ نیا سرمایہ دار طبقہ، انگریز کا دوست اور دست راست تھا اور انگریز بنگال کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے میں مصروف تھے۔''۱۹

تاریخ کے بدلتے ہوئے دھارے میں بھی نسلی امتیازات اپنی جگہ برقرار ہے اور وقت نے اس میں بے شمار المیے تحریر کر دیئے۔ قرۃ العین حیدر نے تاریخ میں پھیلے انھیں المیوں کو ان تمام معروضات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جو صرف قرۃ العین حیدر جیسی عمیق نگاہ رکھنے والی مصنفہ کر سکتی تھیں۔ قرۃ العین حیدر لکھنؤ کے باب میں لکھتی ہیں۔

''دلی کا ایک شہزادہ لکھنو میں پڑا ہے۔۔۔ اور ایرانیوں شیعوں کی اولاد اس سے اودھ پوری میں ڈگ وجے رام چندر کے سنگھاسن پر بیٹھی ہے۔ یہاں ہندو اور مسلمان کا کوئی اختلاف نہیں جانتا کیوں کہ گڑھی کا ٹھاکر اور محل کا نواب دونوں جاگیردارانہ اقدار کے مضبوط رشتے، ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں اور ان کی پرجا، جس میں ہندو اور مسلمان کسان دونوں شامل ہیں، ان کی سپاہیوں کی لاٹھیوں سے یکساں پٹتی ہیں۔ ان کے دکھ سکھ ایک ہیں۔''۲۰

یہاں کوئی مذہبی آویزش نہیں۔ یہاں ساری بات مفاد کی ہے اور تقسیم جاگیر دار طبقے اور کسان طبقے کے درمیان ہے۔ مسلمان جاگیر دار اور ہندو جاگیر دار کا کسان کی طرف سے رویہ یکساں ہے۔ تمام معاملات اعلیٰ وادنیٰ طبقے کے درمیان طے ہو رہے ہیں۔ مذہبی مفاہمت، سماجی منافرت اور سماج کے رشتے ورتے

مذہب سے نہیں معیشت سے طے ہوتے ہیں۔

لکھنو کے پس منظر میں گوتم نیلمبر دت کے ساتھ سمبھو، چمپا اور گنگا دین کا کردار نظر آتا ہے، یہ تینوں ۱۸۵۷ء کے حالات اور وقت کی ستم ظریفی سے متاثر ہیں اور معاشرے میں پسماندہ زندگی گزار رہے ہیں۔سمبھو فٹن چلاتا ہے وہ غریب اور پسماندہ طبقے کا فرد ہے، اسے زندگی اور دنیا کے واقعات کا خوب تجربہ ہے۔ناکام جنگِ آزادی کے واقعے نے انسانی زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا، اس میں سب سے زیادہ متاثر مسلمان طبقہ ہوا۔چمپا بھی ۱۸۵۷ سے پہلے اثر ورسوخ والی تھی لیکن جنگ کے حالات نے اس کو بھیکارن بنا دیا، وہ اب لکھنو کی گلیوں میں بھیک مانگتی ہوئی نظر آتی ہے۔بوڑھا گنگا دین کا تجربہ بھی حالات کے تئیں بہت پختہ ہے۔لیکن گنگا دین کے نزدیک انسان کی زندگی میں آنے والی تبدیلی میں اس کی ذات کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔لکھنؤ کے پس منظر میں چمپا سڑکوں پر بھیک مانگتی ہوئی جب اپنے ماضی کا رونا روتی ہے تو اس پر سمبھو کہتا ہے کہ:

> ''بڑھیا کی باتیں۔دروجے پر ہاتھی جھومتا تھا۔یہ گردی کا یار لوگوں کو اچھا بہانہ مل گیا ہے جس سے سنو یہی کہتا ہے میں غدر سے پہلے یوں طرم جنگ تھا، فلانا تھا، ڈھمکا تھا۔بابا ہی کو دیکھ لیجئے، بابو صاحب، گردی سے پہلے بادشاہ کے خاص چوبدار تھے۔اب سائیسی کرتے ہیں۔'' وہ طنز سے ہنسا اور اسی طرح اظہار خیال کرتا ہوا موتی محل برج کی سمت رواں رہا۔''[۲۱]

قرۃ العین حیدر نے تہذیبی زوال کے پس منظر میں چمپا کو ایک symbol بنا کر پیش کیا ہے۔چمپا جیسے نہ جانے کتنے لوگ حالات کی ستم ظریفی کے شکار ہوئے، اور اس دور میں پسماندہ زندگی گزارنے پر مجبور بھی ہوئے، ناول کے ذریعے اس حقیقت کا انکشاف بخوبی ہوتا ہے۔وقت بدلتا ہے اور زندگی آگے بڑھتی ہے، نوابی اور زمینداری کے خاتمے کے بعد یہ دور بھی تمام ہو جاتا ہے۔جدید دور میں معاشی بدحالی کو دور کرنے اور سماج میں رتبہ قائم رکھنے کے لیے تعلیم کا سہارا لینا پڑا۔لیکن اس دور میں بھی طبقاتی تقسیم کا سلسلہ سماج

میں اسی طرح موجود ہے۔قرۃالعین حیدر نے آگ کا دریا میں سماج کے نچلے طبقے کی زندگی اوران کے مسائل کا ہر دور میں ذکر کیا ہے ،اورسماج کے طبقاتی نظام کا موازنہ کرتے ہوئے اس کی تشخیص پر ہمیشہ سوال اٹھایا ہے۔مصنفہ انسان کوانسانیت کے ذیل میں دیکھنے کی قائل ہیں۔

نیا عہد اپنے امکانات کے ساتھ کائنات کے آسمان پرطلوع ہوااور کرداروں نے اپنے پرانے اوور کوٹ اتار ڈالے اور نئے دور میں نئی زندگی کے قالب میں ڈھل گئے ۔مصنفہ نے ’’آگ کا دریا‘‘ میں جو واقعات تحریر کیے ہیں وہ اب تک کے تمام تفصیلات میں آنے والے واقعات کے لیے پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ تاریخ کے دھارے میں ایک اہم موڑ ہے جوآگے چل کر ۱۹۴۷ء کے گردوپیش کی وضاحت کرتا ہے۔

یہاں گوتم نیلمبر دت ،چمپا،نواب کمّن کی مٹتی ہوئی پر چھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ نیا لکھنو ہے۔ یہ قرۃالعین حیدر کا لکھنو۔ یہاں ہری شنکر اوراس کی بہنیں لاج اور نرملا ہیں۔کمال الدین اوراس کی بہنیں،تہمینہ اور طلعت ہیں۔ بڑے بھیارضا بہادر، گوتم نیلمبر دت اور چمپا ہے۔ یہاں قرۃالعین حیدر کا ماحول،تہذیب اور یورپی نوعیت کی آزادی ہے جوقرۃالعین حیدر کی پسندیدہ ہےاورجس کی پروردہ وہ خود ہیں۔اس نئے عہد میں سب کچھ بدلتا ہے،نچلہ طبقہ اس تبدیلی میں راج محلوں اور زمینداروں کے گھر سے نکل کر امیر گھرانے کی کوٹھیوں میں ملازمت کرتا دکھائی دیتا ہے۔

> ’’طلعت کے یہاں کا خانساماں بھی اسی قسم کا تھا جیسے اورسب کوٹھیوں کے خانساماں تھے۔اس کا نام حسینی تھا۔
> سارے باورچیوں کے نام حسینی ،حسین بخش یا مدار بخش ہوتے ہیں۔ سارے دھوبی نتّھو کہلاتے ہیں۔سب کوچوان گنگادین ہیں۔ساری نوکرانیوں کا نام بلاقن، رسولیا اورحمیدن کی ماں اورمنظور النساء ہوتے ہیں۔سارے بیرے عبدل کہلاتے ہیں۔۲۲

ہر دور میں وقت نے تبدیلی کے ساتھ ایک حدتک سب کچھ بدل دیا لیکن پسماندہ طبقے کی سماجی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔مرورزمانہ سے اب تک ان کی زندگی معاشرے میں حاشیہ پرغلامی کرتے اورمزدوری

کرنے میں ہی گزری ہے۔ پسماندہ طبقے کے لوگوں کی صرف جگہیں بدلی، کام کا طریقہ بدلا اور مالکان بدلیں لیکن سماج میں ان کی حیثیت تبدیل نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی سماج کے نچلے طبقے میں شمار کئے جاتے ہیں جنہیں اعلیٰ طبقہ اپنے سے کم تر درجے کا فرد سمجھتا ہے۔ رم دیّا، حسینی، قدیرا اور قمر النساء پسماندہ طبقے کے ہی کردار ہیں جو مختلف انداز میں زندگی کے مختلف مسائل لیے ناول کے ہر باب میں نظر آتے ہیں۔

عہد قدیم سے لیکر ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ملک کی تہذیب وثقافت میں بڑے پیمانے پر تبدیلی نظر آتی ہے۔ اس دور میں ترقی اور تنزلی کے مختلف واقعہ رونماں ہوئے۔ بیرون ملک سے آنے والے آریا، مسلمان اور انگریزوں نے اقدار وروایت کو متاثر کیا۔ انگریز کی کامیابی دراصل اس کی ذہنی بلاغت کی وجہ سے تھی۔ انگریزوں نے بدلتے ہوئے حالات کو پہلے سے بھانپ لیا اور اس کے مطابق حکومت کرنے کا ایک لائحہ عمل تیار کیا، ساتھ ہی حالات کو مرضی ومنشاء کے مطابق موڑ بھی لیا۔ اب بدلے ہوئے حالات کے مطابق انگریز نے کامیابی سے اپنے کردار کو تبدیل کیا مگر اپنی گرفت ڈھیلی نہ کی۔ اب جب کہ براعظم کی عوام سیاسی شعور حاصل کر رہی تھی تو انگریزوں نے نئی وفاداریاں وضع کرلیں اور ہندو، مسلم کو قومیت اور معاشرے میں موجود طبقات کو ان کی سائیکالوجی کے مطابق آپس میں الجھا دیا۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ”طبقاتی الٹ پھیر کے اس پس منظر کے ساتھ بنگال میں سب سے پہلے نشاۃ کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ نئی ہندو بورژوازی (اوپری متوسط طبقہ) قیادت کے لیے تیار تھی۔ ملازمتیں حاصل کرنے کی دوڑ میں بھی ہندو، مسلمان سے آگے نکل گئے تھے۔ مسلمانوں میں خوف کی سائیکالوجی پیدا ہونی شروع ہوگئی تھی۔ اس خوف کو اچھے موقعے پر انگریز نے ہوا دی۔ وفادار انگریزی خواں مسلمانوں کا مڈل کلاس بننا شروع ہوا۔ مسلمان جولاہا اور کسان، جو ملک کی دھرتی پر محنت کر کے زندہ رہتا تھا، اس کے متعلق کـ نے سوچا سب کو یہی فکر تھی، اپنے لیے زیادہ سے

زیادہ اقتصادی تحفظ اور ملازمتیں حاصل کر لی جائیں۔''۲۳؎

مفادات کی اس جنگ میں نچلا طبقہ کچلا جا رہا تھا اس بات کا جائزہ مصنفہ نے ہمدردی سے لیا ہے۔ مفادات کی اس جنگ میں جاگیردار بھی پیچھے نہ تھے۔ناول سے اسی پس منظر کی وضاحت کے لیے ایک اور اقتباس ملاحظہ کریں:

''اودھ کے تعلقہ داروں نے ۱۸۵۷ء میں اودھ کو بچانے کے لیے جم کر انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا مگر بعد میں یہی تعلقہ دار انگریزوں کے جانثار ثابت ہوئے کیونکہ ان کے اور انگریزوں کے گٹھ جوڑ کے ذریعہ کسانوں پر ان کا تسلط قائم رہ سکتا تھا۔''۲۴؎

اس اقتباس سے جاگیردارانہ نظام کی جبریت پر روشنی پڑتی ہے جسے ہر حال میں اپنے اقتدار کو برقرار رکھنا تھا۔انھیں نہ تو کسی حب الوطنی سے کوئی غرض تھی اور نہ اپنے طبقے کے علاوہ کسی طبقہ سے ہمدردی۔ان تمام حقائق کے ساتھ لش پش ہندوستان کسی نہ کسی طور سے جدید دور میں داخل ہو رہا تھا۔

''۱۹۳۴ء میں پنڈت نہرو نے یہ خوش آئند امید ظاہر کی تھی کہ گو مسلم سیاست پر فیوڈل عنصر چھایا ہوا ہے۔ان کا نچلا طبقہ انڈسٹریل طور پر پسماندہ ہے لیکن چونکہ اس کے یہاں سماجی رشتوں کا شعور زیادہ پختہ ہے اس لیے یہ لوگ ہندو لوئر مڈل کلاس کے مقابلے میں سوشلسٹ راستے پر زیادہ تیزی سے گامزن ہونگے۔۔۔ مڈل کلاس کی انٹیلی جنسیا میں فاشزم کے عناصر پیدا ہو رہے ہیں۔۔۔ جاگیرداروں، مڈل کلاس لیڈروں، ذہن پرستوں اور یونیورسٹیوں کے جوشیلے طالب علموں کی دنیا سے الگ ایک اور دنیا تھی جو اصل ہندوستان تھا۔ یہ دنیا آسام اور جنوبی ہند کے چاء کے باغات اور کانپور، بمبئی، کلکتے احمد آباد اور ٹاٹا نگر کے کارکنوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور سارے ملک کے لاکھوں

گاؤں میں رہنے والے کسانوں پر مشتمل تھی۔''۲۵

یہ وہ طبقہ ہے جس کے حق کے لیے اب باتیں کی جانے لگی تھیں۔نئی نسل،کمال،ہری شنکر،گوتم نیلمبر کی نسل اس طبقے کے لئے کچھ کرنا چاہتی تھی۔روس میں آنے والے انقلاب نے ہندوستان پر اپنے اثرات کچھ اس طرح ثبت کیے کہ یہاں اچھا خاصا کمیونزم پھیل گیا مصنفہ نے اس کمیونزم کی جھلکیاں ناول میں پیش کی ہیں۔بدلے ہوئے حالات میں جب جا گیردارانہ نظام ختم ہورہا تھا اور نئی نسل نے اپنے ماضی پر فخر کرنا چھوڑ کر حقیقت پسندی کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔نوجوان نسل کی اپنی ترجیحات تھیں وہ انقلاب کے راستے پر چل نکلے تھے۔کمال، ہری شنکر،اور گوتم نیلمبر اس انقلاب کے راستے پر پیش پیش تھے۔ہندوستان میں انقلاب،مساوات اور آزادی کی تحریک کے بعد تقسیم،یہ یکے بعد دیگرے حالات رونماں ہوئے۔

قرۃ العین حیدر نے 'آگ کا دریا' میں طبقاتی نوعیت کو عالمی سطح پر پیش کیا ہے،تقسیم کے بعد قیام پاکستان کے حالات اور وہاں کے طبقاتی نظام کو بھی دکھایا ہے۔ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان جانے والوں نے کراچی میں قیام کیا،ان مہاجرین کو کراچی میں مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔قرۃ العین حیدر نے مہاجر طبقے کی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے صرف مقامات اور حالات کے بیان پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ وہاں کے معاشی زندگی اور رہائشی نظام کے ایک ایک پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ناول سے اقتباس ملاحظہ کریں

> '' کراچی جگ اٹھا ہے۔کراچی اپنے کام پر جا رہا ہے۔سینکڑوں ہزاروں انسان سائیکلوں،چھکڑا ایسی بسوں،سائیکل رکشاؤں پر سوار کارخانوں اور دفتروں کی طرف رواں ہیں۔یہ وہی لوگ ہیں بیٹا جن کو عرف عام میں جنتا کہا جاتا ہے۔۔۔۔۔جس وقت صبح سویرے ہزاروں انسانوں کا ریلا پی۔آئی۔ڈی۔سی کے نئے ڈاک یارڈز کی طرف بڑھتا ہے اس وقت،قسم خدا کی، وہ نظارہ دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔مجھے پاکستان کے مستقبل سے امیدیں سی بندھ جاتی ہیں۔یہ بڑے معصوم بے ضرر انسان ہیں۔یہ لوگ جو اس جیّد، بے ہودہ، بدشکل

بوم ٹاؤن کی پندرہ لاکھ آبادی ہیں۔ یہ مکرانی اونٹ گاڑی والے، رنگ برنگے لہنگے پہنے راجستھانی اور کاٹھیاواڑی مزدورنیں، سعود آباد کولونی میں رہنے والے بنارس کے جولاہے (جن کے پرکھ کبیر کے ساتھ پنچ گھاٹپر دوتارہ بجاتے پھرتے ہوں گے) لالوکھیت اور لیاری کی لرزہ خیز مہاجر بستیوں کے باسی ،مغربی یو۔پی۔ کے کاری گر، دلی کے بساطی، بمبئ کے ٹیکسی ڈرائیور اور چاء خانے والے، فٹ پاتھ پر دکانیں رکھنے والے چھوٹے چھوٹے کاروباری، انجام کولونی اور آگرہ تاج کولونی کے باشندے جو ہاکس بے کے راستے پر ہندوؤں کے سابقہ شمشان گھاٹ کی دلدل میں جھونپڑے ڈالے پڑے ہیں اور اپنی اپنی جھگیوں پر چاؤ سے چاندتارے کا جھنڈا لہراتے ہیں۔ ہر سال بارش آتی ہے تو ان کی جھونپڑیاں بہہ جاتی ہیں۔"[۲٦]

مذکورہ اقتباس کا منظر مہاجرین طبقے کا ہے جو ہجرت کے بعد مزدوروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تر پسماندہ طبقے کے مزدور پیشہ لوگ ہیں جن کی روز مرہ زندگی کا بیان حقیقی پیرائے میں کیا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی منظر نگاری میں پاکستان کے قیام کے بعد خوش آئند مستقبل کی جگہ مہاجرین کی المیاتی زندگی نظر آتی ہے۔

تقسیم ہند کے بعد ناول کے آخری حصے میں بنگال کی جو تصویر نظر آتی ہے اس میں زندگی کے دو پہلو موجود ہے۔ اعلیٰ اور پسماندہ طبقہ، جس کی تصویر سرل ایشلے اور کمال کے ذریعے تخلیق کار نے پیش کیا ہے۔ سرل ایشلے امیر اور بے شمار دولتوں کا مالک ہے اور بنگال کے معزز و اعلیٰ طبقے میں شمار ہوتا ہے۔ دوسری طرف کمال، جو سرل ایشلے کا دوست ہے، کمال اعلیٰ طبقے کی رئیسانہ زندگی کے بجائے بنگال میں مزدور کرنے والے، رکشہ چلانے والے، بھیک مانگنے والے اور امیروں کی فیکٹری میں غلاموں کی طرح حاکم کے حکم کی تعمیل کرنے والے پسماندہ طبقے کی زندگی سے زیادہ متعجب ہوتا ہے۔ اقتباسات ملاحظہ کریں:

''سرل اور کمال جہاز سے اتر کر کنارے پر پہنچے۔ مسافروں اور قلیوں کا جمِ غفیر ٹرین کی طرف بڑھا جو گھاٹ سے کافی فاصلے پر کھڑی تھی۔ گھاٹ پر ہندو عورتیں اشنان میں مشغول تھیں، چاروں طرف اہل ہنود کی ریل پیل تھی۔ متوسط طبقے کے خوشحال ہندو مرد اور عورتیں۔ غریب طبقے کے بدحال ہندو مرد اور عورتیں۔'' ۲۷

''ایک اور خستہ حال کمرے میں، جس کی دیواروں سے پلاستر گر رہا تھا اور جس کا اینٹوں کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا، ایک چھوٹی سی دری بچھی تھی اور چند موسیقار ناچ کے گیت بجا رہے تھے۔ چار پانچ لڑکیاں بنگالی طرز کے رقص میں مصروف تھیں۔ ایک بوڑھا پھونس لمبی سفید داڑھی والا بنگالی مسلمان وائلن بجا رہا تھا۔ دبلے پتلے شری سوشل کمار میترا اچک اچک کر لڑکیوں کو ناچ سکھانے میں مصروف تھے۔ کمال دروازے کی چوکھٹ میں مسحور کھڑا یہ منظر دیکھا کیا۔ اس شکستہ کمرے میں، اس ویران جگہ پر، یہ چند لوگ، جوان بوڑھے، باہر کی دنیا کے سارے دکھ اور کمینے پن اور ظلم و ستم اور مجبوریوں اور پریشانیوں کو فراموش کر کے تھوڑے لمحات کے لیے تال اور سُر میں کھوئے ہوئے تھے۔'' ۲۸

اس طرح ''آگ کا دریا'' ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے سے شروع ہو کر اخراج پر اختتام پذیر ہو گیا۔ یا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر نے ابوالمنصور کمال الدین کو مسلمانوں کے لیے بطور علامت استعمال کیا ہے۔ اور تاریخ کے مختلف ادوار میں اسے ہر طبقے کا فرد دکھایا ہے۔ اعلیٰ طبقہ۔۔۔۔۔۔۔۔متوسط طبقہ۔۔۔۔۔۔نچلا طبقہ۔۔۔۔ انسانی تاریخ اسی طرح دائرے میں سفر کرتی ہے اور طبقات میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ یہاں اس ناول میں معاشرے کے سبھی طبقات کو قرۃ العین حیدر نے پیش کیا ہے بقول اسلوب احمد انصاری:

''ہر چند کہ ناول کا بیشتر حصہ اوپری درمیانی طبقے کی زندگی کی عکاسی پر مشتمل ہے، لیکن اس میں عوام کی زندگی کے نقش و نگار بھی واضح طور پر سامنے آتے ہیں''۲۹

ناول ''آگ کا دریا'' کا کینوس بہت وسیع ہے۔ ناول ڈھائی ہزار سالہ تہذیب و ثقافت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ہندوستان کی سماجی تشکیل کے لیے ہر سو بکھری زندگی کا احاطہ کرنا لازمی تھا۔ کیونکہ ہندوستان کی تاریخی روایت میں طبقاتی نظام قدیم زمانے سے رائج ہے۔ رائج الوقت سے چلی آرہی اس روایت میں مکمل سماج کی تکمیل جبھی ہوسکتی تھی جب سماج کے سبھی طبقات کا احاطہ غیر جانبداری سے کیا جائے۔ قرۃ العین حیدر نے اس کا احاطہ بڑی خوبی سے کیا ہے جو ان کے عمیق مطالعے اور مشاہدے کی دین ہے۔

آخر شب کے ہمسفر :

''آخر شب کے ہمسفر'' قرۃ العین حیدر کا ایک ایسا ناول ہے جس کے کینوس میں قحط بنگال اور عیسائیت کی تبلیغ، تحریک آزادئ ہند کے زیر اثر انقلابی تحریک، بنگال کی تقسیم، تقسیم ہند اور قیام پاکستان، بنگالی مسلمانوں کی بنگلہ زبان اور بنگالی کلچر کی طرفداری، پاکستان کی خانہ جنگی اور قیام بنگلہ دیش جیسے واقعات موجود ہیں۔ اس ناول کے کرداروں میں جو ذہنی اور فکری بہاؤ نظر آتا ہے اس کی وجہ روس کا اشتراکی نظریہ ہے۔ جس نے مساوات کا نعرہ بلند کر کے سماجی سطح پر ایک انقلاب برپا کیا تھا۔ ۴۶/ابواب پر مشتمل یہ ناول ۱۹۷۹ء میں منظر عام پر آیا۔

''آخر شب کے ہمسفر'' کے قصے کا خمیر بنگال کے کلچر سے اٹھا ہے۔ ناول نگار نے ڈھاکہ کی مختلف حویلیوں اور خاندانوں کے اعمال و افعال سے قصے کی تار و پود تیار کی ہے۔ یہ حویلیاں ارجمند منزل، چندر کنج،ووڈلینڈز اور للّی کاٹج ہیں جو بالترتیب نواب قمر الزماں چودھری، ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار، بیرسٹر سر پری توش

رائے اور پادری بنرجی کے مساکن ہیں۔اگر چہ قرۃ العین حیدر نے پیش لفظ میں لکھا ہے''اس ناول کے تمام کردار قطعی فرضی ہیں۔''باوجود اس کے کرداروں کے زندہ، متحرک، حقیقی اور مؤثر ہونے میں مطلق شبہ نہیں ہوتا۔مذکورہ کرداروں کا تعلق اعلیٰ ومتوسط طبقے سے ہے جن کی حیثیت ناول میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔قرۃ العین حیدر نے ناول کے جن کرداروں کے ذریعے پلاٹ کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے ان میں اعلیٰ طبقے کے ساتھ پسماندہ طبقے کے ضمنی کردار بھی موجود ہیں۔جن میں آیا کلثوم، لیلا، عبدالغفور اور عیوصی کا کردار اہم ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ناول پسماندہ طبقے کے ان کرداروں کی سائکلو جی اور عملی زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی اپنی زندگی اپنے آقا کی مرہونِ منت ہے۔کلثوم بھی اپنے طرزِ عمل سے یہی ثابت کرتی ہے کہ وہ ایک بہترین اور اپنے پیشے سے ایمانداری رکھنے والی ملازمہ ہے۔لیلا، میم صاحب سے کلثوم کا تعارف کراتے ہوئے اس کی صاف نیتی کا ہی ذکر کرتی ہے۔ایک منظر ملاحظہ کریں

''پہلے کہیں کام کیا ہے؟''میم صاحب نے انٹرویو شروع کیا۔

''کلکتے میں میم صاحب''۔

''کدھر کا رہنے والا ہے''۔

''میمن سنگھ۔۔۔ادھر لال باغ میں ہمارا ماموں ہے۔اس کے پاس رہتا ہے''۔۔۔۔۔۔۔۔

وہ (کلثوم) پردے کی وجہ سے شاگرد پیشے کی طرف بالکل نہیں گئی۔نہ دوسرے ملازموں کے سامنے آئی۔بوڑھے عبدالغفور میاں ہم مذہبی کے ناطے اس کے متعلق خاصی دلچسپی لے رہے تھے۔ان کا بڑا لڑکا نواب پورے میں سائکلو جی کی دوکان پر نوکر تھا۔مگر آوارہ ہوتا جا رہا تھا۔ عبدالغفور چاہتے تھے۔کوئی نیک بے زبان لڑکی ملے تو دو بول پڑھوا دیں۔چنانچہ کلثوم کے گھر کے حالات اور اس کی بیوگی کی المناک

داستان سن کر انھیں اس سے اور زیادہ ہمدردی ہوگئی اور وہ اس کی خاطر
مدارت میں لگے رہے۔''۳۰؎

یہ ناول تقسیم ہند سے پہلے کے حالات تحریک آزادی اور بائیں بازو کی آزادی کی جارحانہ کوششوں سے شروع ہوتا ہے اور تقسیم کے بعد کے حالات اور تقسیم کے وقت کی نسل کی مضمحل روحوں کے المیے پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ ویسے تو یہ ناول صوبہ بنگال میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں اور رونما ہونے والے انقلاب کا احاطہ کرتا ہے اور یہی اس کا موضوع بھی ہے مگر اس ناول میں نچلا طبقہ جو اس دور میں واضح شکل اختیار کر چکا تھا اور اب ابھر کر پوری آب و تاب سے معاشرے میں اپنے وجود کو منوا رہا تھا اس کو بھی ناول میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ ناول امتداد زمانہ کی بنتی بگڑتی شکل کو سامنے لاتا ہے اور ان کے کردار کو واضح کرتا ہے۔

مارکسی تحریک سے متاثر کرداروں میں دیپالی سرکار، ریحان الدین، جہاں آراء اور روزی بنرجی ہے۔ جب ملک بھر میں مارکس اور مارکسی نظریات کا عروج تھا تو یہ لوگ انقلاب لانا چاہتے تھے، آزادی کا اور دولت کی مساوی اور ساتھ ہی طبقاتی تفریق کو مٹانا بھی چاہتے تھے۔ ایک اہم کردار اوما دیبی کا بھی ہے جو اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ مارکسی تحریک سے وابستہ ہیں اور ریحان الدین احمد کی مشیر خاص اور دوست بھی ہیں۔ جو حالات و واقعات کو اپنی مرضی سے موڑنے کے لئے کوشاں، کسی حد تک کامیاب، مگر لاحاصلی کا شکار ہیں۔ اوما اور ریحان لندن میں اکھٹے پڑھے تھے اور نئے نظریات کا خاصہ اثر ان پر تھا۔ پارٹی کے کام کے سلسلے میں ہی دیپالی سرکار کی ملاقات اوما دیوی سے اس کے گھر پر ہوتی ہے۔ دیپالی پہلی بار اس گھر کی شان و شوکت پر حیران ہوتی ہے اور اوما کے کردار پر پہلا سوالیہ نشان بنتا ہے۔ جب دیپالی سرکار اوما کے بارے میں سوچتی ہے۔ اقتباس دیکھیں

> ''اتنی دولت مند اوما دیبی تحریک کی مالی مدد کیوں نہیں کرتیں۔ جب ضرورت پڑتی ہے تو ہم جیسے غریب کارکنوں کو اپنے گھر میں سیندھ لگانا پڑتی ہے۔ اکثے داٹیوشن کرتے ہیں۔ ستیندر مزدور ہے۔ محمود الحق پریس میں پروف ریڈر رہے اور ان کی رات دن محنت اپنی کمزور آنکھیں

پھوڑتا ہے۔ اس طرح جو کچھ بن پڑتا ہے یہ سب لا کر تحریک کی جھولی
میں ڈال دیتے ہیں۔''۳۱

دیپالی اوما دیبی سے سوال کرتی ہے!

'' آپ اتنی بے تحاشہ دولتمند ہیں۔ چپکے چپکے تحریک کی مدد کیوں نہیں
کرتیں۔''؟۳۲

اوما دیبی اس سوال سے سٹپٹا جاتی ہیں اور سوچتی ہیں۔

'' یہ لوگ ابھی تک میرے سماجی پس منظر کو معاف نہیں کر سکے۔''۳۳

اوما دیبی کے یہ الفاظ کھوکھلے دل کی آواز معلوم ہوتے ہیں وہ اپنے کردار کے ذریعے یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ ان کا طبقہ پسماندہ طبقے کا ہمدرد ہے اوران کی ترقی کا خواہش مند بھی۔ ہندوستانی پس منظر پر جو استحصالی سلسلہ چل رہا تھا ناول کے بین السطور میں بھی یہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ اوما دیبی کا تعلق اعلیٰ طبقے کے سرمایہ دار قوت سے ہے جو اپنے مفاد کے لیے نچلے طبقے کا استحصال کرتی ہے اور یہ اوما دیبی کے مزاج کا حصہ بھی ہے۔ تحریکیں انقلاب لاتی ہیں مگر جاگیردارانہ ذہنیت تبدیل نہیں ہوتی۔ ہیرو ہمیشہ طبقۂ اشراف سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر طبقۂ اشراف میں شامل ہوجاتے ہیں، (جیسا کہ ریحان الدین نے ناول کے اختتام پر کیا یا پھر روزی نے دولت وثروت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے) ہندوستان کا معاشرہ جو ابتداء سے اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کے طبقات میں منقسم ہے وہ اب جدید عہد میں نئے پیمانے کے ساتھ طبقاتی شکل اختیار کر چکا ہے۔ دیپالی اس طبقاتی تفریق پر بہت پریشان ہے، یہی وجہ ے کہ وہ غریب اور پسماندہ طبقے کا محاسبہ ہندوستان کے وسیع پس منظر میں کرتی ہے۔ دیپالی جب ہندوستان کے حالات اور مفلس زدہ لوگوں کی زندگی کے بارے میں سوچتی ہے تو ہمیں حالات کے ساتھ غریب طبقے کا منظر بھی نظر آتا ہے۔ اقباس ملاحظہ کریں:

''انسانوں کی زندگیوں میں اتنا شدید تفاوت بھی ممکن ہے۔ اسے
عبدالقادر کوچوان کا شکستہ، قبر ایسا مکان یاد آیا، جو چندر گنج کے کھنڈر ایسے
شاگرد پیشے میں ٹاٹ اور ٹین کے ٹکڑوں اور باشا کی بوسیدہ چٹائیوں کی

مدد سے رہنے کے قابل بنایا گیا تھا۔اس نے اپنے اجاڑ چندر گنج کا تصور
کیا۔جس کے خالی مطب میں بابا ان مریضوں کے انتظار میں صبر سے
بیٹھے ہوں گے۔ جو کبھی کبھار اس طرف آ نکلتے تھے۔ ڈھاکہ شہر کے
ہزاروں ، لاکھوں نیم تاریک، مفلس مکان اور جھونپڑے، جن میں
لالٹین اور مٹی کے دیئے ٹمٹمار ہے تھے۔ دور غفار گاؤں میں اس کا آبائی
مکان جو تقریباً ڈھے چکا تھا۔ ایسا افلاس ایسی ویرانی اس ملک پر اس
ہندوستان پر طاری ہے۔'' ۳۴

دیپالی انقلاب کی امید میں مذکورہ خیالات کو جھٹک دیتی ہے کہ انقلاب سب کچھ تبدیل کر دے گا مگر انقلاب بھی طبقہ امراء کے لیے آتا ہے۔طبقات ختم نہیں ہوتے ،شکل بدل لیتے ہیں۔اعلیٰ طبقے کی اشترا کی سرگرمیاں اور انقلاب کے لیے تحریکیں چلانا محض ایک ایڈونچر ہے۔ ہر دور میں پسماندہ طبقے کی کہانی ایک ہی ہے اور جنم لینے والے المیے بھی مشترک ہے،بس خطے مختلف ہیں اور وقت کا دھارا مختلف ہے۔ وقت کا یہ دھارا گردونواح پر اثرات مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔ نظام تبدیل ہو جاتے ہیں مگر استحصال جاری رہتا ہے۔استحصالی قوتوں کی نوعیت مختلف ہوتی ہے مگر سماج پر اثرات یکساں مرتب رہتے ہیں۔لہٰذا سماج کے مختلف طبقات کے درمیان مفاہمت،منافرت،اور کشمکش جاری رہتی ہے۔ بقول خورشید انور:

''نظاموں میں تبدیلی مختلف نوعیت کے تضادات سے پیدا ہوتی ہے۔
سماجی ارتقاء کے ہر دور میں متضاد قوتیں موجود رہتی ہیں جو کہ سماج کو
مختلف دھاروں میں بہانے کی کوشش کرتی ہیں۔ مثلاً جہاں ایک طرف
حکمراں طبقہ نظام کو بدستور قائم رکھنے کے لیے کوشاں رہتا ہے وہیں
دوسری جانب اس کے مخالف طبقے نظام میں تبدیلی لانے کے لیے
جدوجہد کرتے ہیں۔۔۔طبقوں کی تقسیم فطری طور پر سماج کو ایک سماجی
کشمکش کی طرف مائل کرتی ہے۔'' ۳۵

سماج میں موجود طبقات کے درمیان یہی کشمکش قرۃ العین حیدر کے یہاں کبھی نمایاں ہو کر سطح پر آ جاتی ہے اور کبھی بین السطور میں اپنا کردار ادا کرتی رہتی ہے۔ اسی کشمکش کی شکار دیپالی سرکار، جہاں اوما دیبی کی دولت دیکھ کر اپنے طبقے کی حیثیت اور مشکلات کا تجزیہ کرتی ہے وہیں وہ سندر بن میں ریحان الدین احمد کے ساتھ رہتے ہوئے غریب میزبان خاندان کی زندگی کا بھی جائزہ لیتی ہے۔ دیپالی اسی پس منظر میں گاؤں اور شہر کی معاشی پسماندہ زندگی کا موازنہ کرتے ہوئے سوچتی ہے۔ اقتباس دیکھیں

> ''دیپالی نے غربت کا دور سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ سفید پوش طبقے کی ناداری سے واقف تھی، جو اس کی اپنی ناداری تھی۔ اس نے شہر کے غرباء کا افلاس دیکھا تھا مگر ایسی غربت اسے آج تک نظر نہیں آئی تھی۔'' ۳۶

سندر بن میں ریحان الدین احمد کے ساتھ رہتے ہوئے دیپالی سرکار کو زندگی کے مختلف تجربات اور مشاہدات کا پتا چلتا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی پس منظر میں اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ استعماریت نے ملک کا کیا حال کیا ہے؟ برطانیہ نے کس طرح سے طبقاتی ضمن میں ہندوستان کے ناگفتہ بہ حالات کا فائدہ اٹھایا۔ ریحان کے الفاظ میں:

> ''برطانوی سرمایہ داری ہندوستان کے قحط، غلامی، قرضے، ذات بندی اور فرقہ وارانہ کشمکش کی بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے تمہیں معلوم ہے یہی کھلنا اور نوا کھالی، جواب ڈاکوؤں اور مفلس ماہی گیرون کا دیس ہے۔ مغلوں اور نوابوں کے عہد میں کتنے اہم تجارتی علاقے تھے؟ یورپ میں ۲۰۰ / برس تک سب سے خونریز لڑائیاں لڑی گئیں۔ وہ ہندوستان کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لئے لڑی گئیں تھیں۔'' ۳۷

ہندوستان اپنے ذخائر کی وجہ سے ہمیشہ یورپی اقوام کے لیے سونے کی چڑیا تھا جس کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کی گئی اور ہندوستان کے حالات کا پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا۔ جس چیز سے برطانیہ نے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا وہ یہاں کا ذات پات کا طبقاتی نظام اور امیر و غریب کی تقسیم تھی، جس نے طبقات کو

پروان چڑھانے میں بڑی مدددی۔قرۃالعین نے ناول میں متعدد باراس حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے۔

یہاں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا طبقاتی ذہنیت ختم ہوگئی؟ کیا لوگوں نے ایک دوسرے سے علیحدگی کے بعد سکھ کا سانس لیا؟نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا۔۱۹۴۷ء نے جس کشت وخون کی تاریخ رقم کی تھی وہی ۱۹۷۱ء میں بھی دوہرائی گئی۔ جب دومختلف مذاہب تھےاوراس باردومختلف زبانیں تھیں۔ہم ایک پلیٹ فارم پہ اسی وقت جمع ہوسکتے ہیں۔ جب اختلاف کی تمام صورتیں ختم ہوجائیں۔جب تک اختلافات موجود ہوں گے۔چاہے وہ رنگ نسل، مذہب یا پھر دولت کی تقسیم کا ہو۔ہم خانوں میں بٹے رہیں گے۔ یہی وہ صورت حال ہے جومعاشرے کوطبقات میں تقسیم کرتی ہےاس تقسیم کے جاری رہنے کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اعلیٰ طبقہ اپنی بالادستی کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ وہ اپنے سے نیچے انقلاب، مدداورانسانیت کے نام پر پروپیگنڈے کرتے رہتے ہیں۔مگر اپنی اوراپنے طبقے کی بالادستی ختم نہیں ہونے دیتےاوراس سارے معاملے میں کسی قسم کی جذباتیت کی کوئی گنجائش نہیں،اپنے طبقے کی بالادستی کے لیےضروری ہے کہ ان تمام اعمال کوجاری رکھا جائے اوران تمام تصورات کی سرپرستی کی جائے۔جوان کی بقاء کے لیےضروری ہے۔یوں یہ سلسلہ نسل درنسل چلتارہتا ہے۔مصنفہ نے روزی کے متعلق جس نظریات اورتبدیلی کو پیش کیا ہے،اقتباس کے ذریعے اس حقیقت کوملاحظہ کریں:

> ''.......روزی جو آج سے صرف سال بھر پہلے کفن باندھ کر میدان کارزار میں کود پڑی تھی۔ پولیس کی لاٹھیاں کھائی تھیں۔جیل میں معافی مانگنے سے انکارکر دیا تھا۔دولت،مرتبہ اورآسائشیں انسان کی اتنی جلدی کایاپلٹ دیتی ہیں؟ اب یہ کس مربیانہ انداز میں مجھ سے باتیں کررہی ہیں کیونکہ میں محض ایک غریب مولوی کی لڑکی ہوں۔ یہ بھی بھول گئیں کہ سال بھرقبل پندرہ روپے ماہوار پر مجھے ٹیوشن دیتی رہی ہیں۔'' ۳۸

ریحان اوراس کے ساتھی،انقلاب روس اور مارکس کی تھیوری سے بہت متاثر تھے۔وہ بھی ہندوستان میں غیرمساوات اوراعلیٰ وپسماندہ طبقے کےتفریقی نظام پر مارکسی نظریات کومنطبق کر کے بہتر حالات بنانے کی

جدوجہد کرتے ہیں لیکن وقت کے ساتھ سمجھوتا کر کے عیش عشرت کی زندگی گزارتے نظر آتے ہیں۔

ناول میں تمام سوالات دراصل قرۃ العین حیدر کے سوالات ہیں۔ان سوالات کو بار بار دوہرانا دراصل ایک جمی جمائی تہذیب کے اکھڑنے کا دکھ ہے جو قرۃ العین کے یہاں بار بار ابھرتا ہے اور پھر وقت نے کایا پلٹ دی نئے دور میں بدلے ہوئے حالات میں ان تمام لوگوں نے دولت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے، جو جرأت، جوش اور عزم کے ساتھ انقلاب لانے کے لیے سروں سے کفن باندھ کر نکلے تھے۔قرۃ العین حیدر کے کردار جتنے جارحانہ انداز کے مالک ہوتے ہیں، حالات کے ساتھ اتنی ہی جلدی سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔۔جیسے ہی انہیں موقع ملتا ہے وہ اپنے تمام نظریات کو پس پشت رکھ کر اپنا طبقہ بدل لیتے ہیں۔

''آخرِ شب کے ہم سفر'' میں قرۃ العین حیدر کی فن کارانہ عظمت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔اس ناول میں انہوں نے پہلے سے زیادہ حقیقت پسندی کا رویہ اپنایا ہے۔تخلیق کار کا یہ ناول ہندوستان کی تہذیب و تاریخ میں الجھے ہوئے سماج کے طبقاتی تفریق اور مارکسی نظریات کے زیر اثر پیدا ہونے والے انقلاب خاص اہمیت کا حامل ہے۔

گردش رنگ چمن:

''گردشِ رنگِ چمن'' ایک دستاویزی ناول ہے جس کے پس منظر میں ایک ساتھ کئی زمانے متحرک دکھائی دیتے ہیں۔مصنفہ نے تاریخ کے تناظر میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز زمانے سے ناول کا آغاز کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے جنگِ آزادی کے بعد معاشرے میں طبقاتی حد بندیاں اس طرح وجود میں آئیں کہ بادشاہ فقیر بن گئے اور فقیر بادشاہ ہو گئے۔سب کچھ تہہ و بالا اور تہس نہس ہو گیا جس کی زد میں آکر بہت سے شریف گھرانوں کی لڑکیاں حالات سے مجبور ہو کر طائفہ بن گئیں اور سماج میں پسماندہ طبقے کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئیں۔ مذکورہ ناول کے کردار دگر گوں حالات کی بدولت ایک ایسی جگہ پر ہیں جہاں ان کی زندگیاں شدید احساسِ جرم، انتشارِ ذات اور اپنے حالات سے فرار سے عبارت ہیں۔مصنفہ نے مذکورہ ناول میں تقدیر کے لکھے اور

وقت کے جبر کو نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔سماج کے اعلیٰ و پسماندہ طبقے کے اصولی نظام کی پابندیوں میں جکڑے انسانی زندگی کی مجبوری اور لاچار حالت کو پیش کیا ہے۔

مصنفہ نے اس ناول میں کرداروں کی زندگی میں پیش آنے والے مختلف واقعات کو ۱۸۵۷ء کے تاریخی تناظر میں رکھ کر دیکھا ہے اسی لیے ناول کے پس منظر پر یہ زندگیاں ہنگامی صورت حال کے سبب نفسیاتی اور ذہنی الجھن کی شکار نظر آتی ہیں۔اگر ناول کے واقعہ پر غور کیا جائے تو اس کا آغاز عہد جدید میں عندلیب، ڈاکٹر عنبرین اور ڈاکٹر منصور کاشغری کے ذکر سے ہوتا ہے، لیکن صرف تین ابواب کے بعد ہی کہانی فلیش بیک کے ذریعے ماضی میں چلی جاتی ہے اور تقریباً آدھے ناول کے بعد کہانی عہدِ حاضر میں پھر لوٹ کر آتی ہے۔ ناول کے اختتام تک ماضی اور حال ساتھ ساتھ چلتے دکھائی دیتے ہیں۔پورا ناول دلی، کلکتہ دوسری اور تیسری دہائی کا شاہی لکھنؤ، جے پور اور پھر جدید لکھنؤ کی تہذیب میں سفر کرتا ہے۔

بحیثیت پسماندہ طبقے کے کردار نگاری کے حوالے سے ناول کے مطالعہ میں مرکزی اور ضمنی دونوں طرح کے کردار موجود ہیں جو سماج کے پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔سب سے پہلے ناول میں پسماندہ طبقے کے کردار چوتھے باب بعنوان ''سرائے طغرل بیگ'' میں نظر آتے ہیں۔سرائے طغرل کے نیست و نابود ہونے کے بعد وہاں فتح محمد چودھری، اس کی بہن منوری کشمیرن اور اس کے تمام خدمت گار ملازم عملہ دکھائی دیتے ہیں۔دلنواز بیگم اور مہرو کی بھوک مٹانے والے ہمدرد فتح محمد چودھری اور منّی پسماندہ طبقے کے ڈیرہ دار مراثین ہیں۔مرزا بھورے، خان صاحب اور سیاہ فام تلنگا اسی عملے سے تعلق رکھتے ہیں۔دراصل ناول نگار نے دلنواز بیگم اور مہرو کے حالات اور زندگی کو تقدیر کی ستم ظریفی کا نام دیا ہے۔فتح محمد چودھری اسی تقدیر کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے:

> ''سن لڑکی! یہ میدانِ حشر ہے۔سارا ہندوستان میدانِ حشر ہے، جہاں سر چھپانے کو جگہ مل جائے غنیمت جان۔ ربِ کریم رنگا رنگ وسیلوں سے اپنے بندوں کو رزق پہنچاتا ہے۔ ہمارے لیے بھی وسیلے اس نے مقرر کر رکھے ہیں ہم راضی بہ رضا ہیں۔اس زندگی کو چھوڑ نہیں سکتے،

کہاں جائیں؟ اللہ تعالیٰ نے مجھے دھاڑی اتارا۔ ہم سب کو اپنے اپنے
لکھے پورے کرنے ہیں دانے دانے پر مہر ہے''۳۹؎

''گردشِ رنگِ چمن'' کی کہانی پچھلی ڈیڑھ صدی کا احاطہ کرتی ہے۔ ناول کے اہم کرداروں میں مہرو بیگم اور دل نواز بیگم کا کردار ہے، جو مغل شہزادیاں ہیں اور امتدادِ زمانہ نے انہیں پسماندہ طبقے کا طوائف بنا دیا ہے۔ بیگم گل رخ بانو عرف نواب فاطمہ، شریف مسلمان کی بیٹی ہے جو باپ کی وفات کے بعد در بدر کی ٹھوکریں کھاتی ہے اور بالآخر وہ بھی پسماندہ طبقے میں شمار طوائف بننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ناول کے پسماندہ کرداروں میں سب سے پہلے دلنواز کا کردار سامنے آتا ہے جو اپنی بہن مہرو سے علیحدہ ہو کر چورن بیچنے والی جمن بوا کے روپ میں ملتا ہے۔ دوسرا اہم کردار نواب فاطمہ کا ہے جو مرزا دلدار علی برلاس کی بیٹی ہے جس کے والدین دہلی میں پھیلنے والے ہیضے کی بیماری سے مر جاتے ہیں اور اس بچی کو پیش کار سبطِ حسن کے حوالے کر جاتے ہیں۔ سبطِ حسن، دلدار علی برلاس کے مرنے کے بعد اس کے مال واسباب پر قبضہ کر لیتا ہے اور تبادلے کا ڈھونگ رچا کر نواب فاطمہ کو دہلی کے ایک تاجر شیخ عبدالباسط کے حوالے کر کے غائب ہو جاتا ہے۔ نواب فاطمہ دن رات گھر کی عورتوں کے آگے ذلیل ہوتی ہے پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ظالم اور پتھر دل عورتیں اس کی شادی گھر میں رہنے والے ایل ملازم پاگل مدو سے کرنا چاہتی ہیں۔ یہاں نواب بیگم کی زندگی میں ایک نیا موڑ آتا ہے جب وہ چورن بیچنے والی مغل شہزادی دل نواز کے ساتھ اجمیر شریف کے مزار پر آجاتی ہے تاکہ شیخ عبدالباسط کے اہلِ گھرانہ کے شر سے بچ سکے، یہاں ایک بھاری بھرکم فقیر نواب فاطمہ کو گھورا کرتا تھا۔ دلنواز بھی اسی فقیر سے نواب فاطمہ کی شادی کرنا چاہتی تھی، جیسے ہی نواب بیگم کو ان کے اس ارادے کا پتا چلا وہ عرس کے دنوں میں اجمیر کی راحت بائی کے پیچھے چل پڑی۔ اب راحت بائی اس کی قسمت کی مالک تھی۔ اب نواب بیگم کے ساتھ وہی ہوا جو ایسی بدقسمت لڑکیوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے، اچھے گھرانوں کی خدا معلوم کتنی لڑکیاں اسی طرح پسماندہ طبقے کے طوائف طبقے کا حصہ بن جاتی ہیں۔

راحت بائی کا تعلق پسماندہ طبقے کے طوائف طبقے سے ہے، اودے پور میں راحت بائی نے پیشے کے اعتبار سے نواب بیگم کی تعلیم وتربیت مکمل کروائی۔ لاہور میں اس نے محفلِ موسیقی میں شرکت کی اس کے بعد دور

دور سے اس کے لیے پیغام آنے لگے، وہ درباروں میں بلائے جانے لگی۔نواب بیگم کی خوبصورتی اور ادا کے دیوانے مہاراجہ جے پور کے ٹھاکر مہیشور سنگھ نے اپنے پاس بلا لیا، مہیشور سنگھ نے ناز نخرے اور مال و دولت کے علاوہ علیحدہ مکان بھی لے کر دیا۔نواب بیگم کے کردار میں ناول کے پس منظر پر کہیں مستقل سکون میسر نہیں آتا، وہ اپنی پسماندہ زندگی میں تبدیلی حالات سے ہمہ وقت دوچار نظر آتی ہے، اس کی زندگی میں مختلف موڑ آتے ہیں۔ایک مرتبہ کرنل ڈالٹن جو مغلیہ سلطنت کی تصویروں کا دلدادہ تھا وہ ایک دن نایاب مغل تصاویر دیکھنے کے لیے ٹھاکر مہیشور سے ملا، جس کے ساتھ بیلجئیم کا ایک فوٹو گرافر آندرے رینال تھا، تصویر بناتے ہوئے جب نواب فاطمہ سے آمنا سامنا ہوا تو اس نے نواب فاطمہ سے تعلقات قائم کر لیے، دوسری طرف مقروض مہیشور سنگھ کو اچانک موت نے گھیر لیا۔نواب فاطمہ موقع پا کر کلکتہ بھاگ گئیں، آندرے رینال کو پہلے ہی بیگم فاطمہ نے خاصی دولت دے کاروبار کرنے کے لیے کلکتہ بھیجا تھا لیکن رینال سارے پیسے ریس میں ہار کر کلکتہ سے فرار ہو گیا تھا۔نواب فاطمہ کی بیٹی عندلیب دراصل اسی بیلجئین فوٹو گرافر آندرے رینال کی اولاد تھی، اس کے بعد نواب فاطمہ کی زندگی میں دکھ ہی دکھ تھے لیکن عندلیب کی زندگی سنوارنا اس کا اولین مقصد تھا۔

عندلیب کی زندگی بھی مصائب سے عبارت تھی لیکن نواب فاطمہ کی نسبت عندلیب نے بہتر زندگی گزاری۔بہتری کے باوجود وہ طوائف طبقے سے باہر نہ جا سکی اور آخر میں پسماندی طبقے کے طوائف پیشے کا حصہ بن کر رہ جاتی ہے۔خان بہادر کا خطاب حاصل کرنے والے امبا پرشاد نے اس دور میں عندلیب کو ایک ہزار روپے عطا کیے۔ماسٹر مشکور حسین عندلیب کو پینٹنگ سکھانے آنے لگے۔ماسٹر مشکور حسین نے دولت کے لالچ میں عندلیب سے شادی کر لی چوں کہ وہ پہلے سے ہی شادی شدہ تھے اس لیے نہ بن سکی، طلاق ہو گئی۔اس کے بعد عندلیب اپنی ماں نواب فاطمہ کے پاس چلی گئی۔اس کی ماں ۱۹۴۵ء میں کینسر سے مر جاتی ہے، جس کے بعد عندلیب رقاصہ بن جاتی ہے۔ماں چوں کہ آخری عمر میں زیادہ مذہبی ہو گئی تھی اس لیے ردِعمل کے طور پر عندلیب بے دین سی ہو گئی تھی۔عندلیب کی بیٹی عنبرین نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور کئی ممالک گھوم پھر لیے۔اب ڈاکٹر منصور کاشغری سے اس کی دوستی تھی۔اعلیٰ تعلیم اور ترقی یافتہ ہونے کے باوجود بھی عنبرین کا تعلق طوائف طبقے سے جڑا ہوا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی ماں عندلیب اور نانی نواب فاطمہ کی زندگیوں پر گہرا طنز کرتی تھی کیوں

کہ اسے اپنے تشخص کا گہرا دکھ ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ آیا وہ امبا پرساد کی بیٹی ہے یا ماسٹر مشکور حسین کی، اس سلسلے میں ڈاکٹر عثمان فاروق عثمان کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

''عہدِ جدید میں عندلیب بیگم ہے جو نواب فاطمہ اور ایک بیلجئین آرٹسٹ آندرے رینال کی اولاد ہے اور جو اپنے خوف ناک ماضی کی جانب سے ایک طوائف کی بیٹی اور دوسری طرف سے ایک دوغلی نسل ہونے کے دہرے عذاب میں مبتلا ہے، اسی طرح اس کی بیٹی ڈاکٹر عنبرین بیگ کو جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشکور حسین کی بیٹی نہیں بلکہ امبا پرساد کی بیٹی ہے تو اس کا ماضی بھی اس کے لیے بھوت بن جاتا ہے، یوں یہ سب کردار اپنے ماضی کی صورتِ حال کے حوالے سے حال میں اپنے آپ کو مس فٹ سمجھتے ہیں اور ہر لحظہ اپنے تشخص کی تلاش انہیں مضطرب رکھتی ہے۔''[۳۹]

ڈاکٹر عنبرین کو اپنے تشخص کی تلاش تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ اس کا سلسلۂ نسب پسماندہ طبقے کے طوائفوں سے ہے۔ اس کے نزدیک اعلیٰ نسب کا نہ ہونا زندگی میں سب سے بڑی محرومی کا درجہ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر منصور کاشغری جو بچپن میں مختلف گھروں سے روٹیاں اکٹھی کیا کرتے تھے، کیوں کہ اس کے والد ایک مسجد کے مولوی تھے۔ ڈاکٹر عنبرین ایک دن گہرے تأسف سے اپنے دوست ڈاکٹر کاشغری کو بتاتی ہے کہ ایک سے ایک نامعقول لوگوں کی ناجائز اولاد ہونا میری قسمت میں لکھا تھا۔

''گردشِ رنگِ چمن'' میں ویسے تو بے شمار کردار ہیں لیکن ناول کی کہانی کو سمجھنے کے لیے چند اہم اور نمایاں کرداروں کا ذکر از حد ضروری ہے۔ قاری پر عجیب تاثر چھوڑنے والے دو نہایت اہم کردار مغل شہزادیاں دل نواز اور مہرو کے ہیں۔ ان کرداروں کی بدنصیبی اور ان پر بیتنے والے عذاب کے متعلق آگہی حاصل کرنے کے لیے ہمیں سرائے طغرل بیگ چلنا ہوگا جہاں انگریزوں نے سب کچھ تہہ تیغ کر دیا تھا۔ مذکورہ ناول ان دو مغل زادیوں کے حالات اور ان کی دکھ بھری زندگی کی کہانی کو بھی بیان کرتا ہے کہ وہ کس طرح بے آسرا ہوئیں

اور ایک ایسی گردش کا شکار ہوئیں جس کا انھوں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ ان دونوں کی قسمت نے ان کو سب سے پہلے چودھری فتح محمد اور اس کی بہن منی سے ملایا جو ارباب نشاط کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ خانگی کنبے میں شامل ہوکر یہ کردار زندگی کا ایک نیا رخ دیکھتے ہیں اس کے بعد حالات نے انہیں منوریہ کشمیرن کے ڈیرے پر پہنچا دیا۔ پورے رام پور میں دل نواز کے حسن کی دھوم مچ گئی۔ دلی اور لکھنؤ اجڑ گئے مگر تاجِ برطانیہ کی مہربانی سے رام پور کی رونق مسلسل بڑھ رہی تھی۔ مفلوک الحال شعراء، ادباء اور فضلا کے علاوہ سات سو نامی گرامی گویے رام پور میں ملازم تھے۔ نواب مرحوم کے عہد حکومت میں محکمہ اربابِ نشاط کی اعلیٰ افسر داروغہ محبوب جان خود ایک بلند پایہ مغنیہ تھیں۔ تائب ہوکر نواب مرحوم کے ساتھ حج بھی کرائیں تھیں، اس کے بعد رام پور میں ایک مسجد انھوں نے تعمیر کروائی تھی۔

منوری کشمیرن کے مرنے کے بعد دل نواز اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ بائیس سال گزرنے کے بعد قسمت نے پلٹا کھایا اور سہراب نگر کے نواب نے دل نواز کے لیے نکاح کا پیغام بھیجوایا جس پر دل نواز نے ہاں میں جواب دے دیا حالانکہ اس سے پہلے ہی اس نواب کے پاس دو بیگمیں تھیں، دل نواز کے پاس پیسوں کی فراوانی تھی کیوں کہ منوری کشمیرن کی تمام جائیداد کی وہ اکیلی مالک تھی لیکن مغلوں کے خون نے جوش مارا اور تیسری بیوی بننے پر راضی ہوگئیں۔ نواب صاحب بھی دل نواز کے لیے ایک الگ محل تعمیر کروا رہے تھے اور ہیروں کا تاج بنوایا گیا، جمع کا دن نکاح کے لیے مقرر ہوا۔ دل نواز سارا دن نوافل ادا کرتیں کہ اللہ نے دوبارہ عزت کی زندگی بسر کرنے کی امید دلا دی ہے۔ ایک لاکھ سکہ رائج الوقت مہر مقرر ہوا۔ دل نواز کو نواب صاحب کی طرف سے 'دل رس' کا خطاب بھی مل گیا۔ دل نواز نے نواب صاحب کو ایک خط لکھا جس میں اس نے لکھا کہ وہ کون ہے اور کس طرح منوری کشمیرن تک پہنچی ہے؟ ابھی یہ خط نواب صاحب تک نہیں پہنچا تھا کہ نواب سہراب کے مرنے کی خبر پہنچتی ہے۔ دل نواز کو دوبارہ اپنے پرانے پیشے کی طرف بادلِ نخواستہ لوٹنا پڑتا ہے لیکن ایک دن رضائی میں آگ لگنے کی وجہ سے اس کا تین چوتھائی چہرے کا حصہ جھلس جاتا ہے۔ صحت مند ہونے کے بعد طوائف پیشے سے توبہ کر لیتی ہے اور جھلسا ہوا چہرہ ہمیشہ نقاب میں چھپائے رکھتی تھیں۔ ایک نیک آدمی سے نکاح کر کے حج کرنے چلی جاتی ہیں پھر اس کی موت کے بعد واپس لوٹ آتی ہیں اور چورن بیچنے والی جن بی

کھلانے لگتی ہیں۔

مذکورہ ناول کے کردار زندگی کے مختلف رویوں کے نمائندہ ہیں اور اس ناول کی پوری کہانی میں متحرک دکھائی دیتے ہیں اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ مصنفہ اپنی تحریروں میں واقعات سے زیادہ کرداروں پر توجہ مرکوز رکھتی ہیں کیوں کہ ان کی تحریروں میں آنے والے کردار حقیقی زندگی سے جنم لیتے ہیں اور ناول کے پس منظر پر حقیقی زندگی گزارتے دکھائی بھی دیتے ہیں۔ مصنفہ کے کردار بکثرت ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت اور اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ مذکورہ ناول کا مرکزی کردار عندلیب بانو ہے جو نواب فاطمہ کی بیٹی اور ڈاکٹر عنبرین کی ماں ہے۔ اس ناول کے شاخسانے ۱۸۵۷ء کے پر آشوب ہنگامے میں پوری طرح پیوست ہیں، جس میں ہمیں اس پر آشوب دور سے بیسویں صدی تک پھیلے ہوئے اندوہ ناک اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ عندلیب بانو کی زندگی دکھوں اور رسوائیوں سے عبارت ہے۔ وہ اچھی اور شریفانہ زندگی گزارنے کی خواہاں ہے مگر نواب بائی جے پور والی، کا لیبل ہمیشہ اس پر لگا رہتا ہے اور اس کا کردار اپنے عہد کے زوال کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے کیوں کہ وہ اپنے پورے سماج کی نمائندہ ہے۔ ایک مغل شہزادی کا طوائف بننا، تاریخی حقائق کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور تہذیبی زوال کے تجربے کا بھی سبب بنتا ہے۔ عندلیب بانو اس ورثے سے جان چھڑانا چاہتی ہے جس پر اس کی ماں فخر کرتی تھی، جس کی وجہ سے ماں بیٹی کے درمیان بہت سے تضادات جنم لے لیتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''میرے اور مما کے درمیان زبردست ٹینشن کا آغاز چند روز قبل کلکتہ ہی میں ہو چکا تھا، میں چودھویں سال میں پڑ رہی تھی اور مصائب کی وجہ سے کچی نجروٹ ہو چکی تھی۔ ٹین ایجرز کی فطری بغاوت کے علاوہ یہ عقل بھی آ گئی تھی کہ مما مجھے کس قسم کی ٹریننگ دے رہی ہیں۔ مما نے فوراً اسکول سے میرا نام کٹوا دیا میں اپنے جونیر کیمبرج کے امتحان کی تیاری میں بے طرح مشغول تھی ایک روز حسبِ معمول یونیفارم پہن، بستہ سنبھال اسکول جانے کے لیے زینے سے نیچے اتری، رکشا والا ندارد،

اس وقت مما دروازے پر آئیں اور آواز دی۔ بس بی بی آج سے تمہارا
اسکول القط۔ اب اپنی اوقات پر آؤ۔۔۔۔میرا خون خشک ہو گیا۔ ان کا
منہ تکنے لگی۔ سرد آواز میں بولیں اپنے توڑے پختہ کرو، ماشاء اللہ پہلے
مجرے کی سائی آ گئی ہے۔ میرے اوپر بجلی سی گری والدہ کو دیکھتی کی
دیکھتی رہ گئی۔''[۱۴۲]

مذکورہ ناول کا مرکزی کردار چونکہ عندلیب بانو ہے، اسی مناسبت سے اس کی کربناک کہانی کو''ماہ و سال عندلیب'' کا نام دے کر ایک وسیع پس منظر میں ''گردشِ رنگِ چمن'' کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ عندلیب بانو واقعات گزشتہ کا مرقعٔ عبرت ہے، جب کہ اس کی بیٹی ڈاکٹر عنبرین جو عہد جدید کی ترجمان ہے وہ اپنی مصنوعی ماحول کے خلاف بغاوت کر کے اس مشکوک ورثے سے انحراف کرنا چاہتی ہے جسے اس کی والدہ نے اس کی طرف منتقل کیا ہے مگر وہ انقلابی سوچ کے باوجود ذہنی حقیقی سے فرار اختیار نہیں کر پاتی کیوں کہ حالات و واقعات اس کے ذہن کو بری طرح مجروح کر دیتے ہیں حالانکہ اس کی والدہ کی خواہش ہے کہ اس کی بیٹی معاشرے میں باعزت مقام حاصل کر لے لیکن معاشرہ عندلیب بانو کی سابقہ زندگی بھلانے پر تیار نہیں اور اس طرح عندلیب بانو کا ماضی ڈاکٹر عنبرین کے مستقبل کی دیوار بن جاتا ہے، کیوں کہ عندلیب بانو گردشِ حالات کی بدولت طوائف کی زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ ایسی دگرگوں صورتِ حال میں ڈاکٹر عنبرین، ڈاکٹر منصور کاشغری سے مدد چاہتی ہے، جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا طوائف طبقے سے تعلق ہے، ساتھ دینے پر رضامند نظر آتا ہے۔ وہ اپنی محبوبہ ڈاکٹر عنبرین سے پیچھے نہیں ہٹتا بلکہ جیسے جیسے اس کی حالت خراب ہوتی جاتی ہے وہ اس کے ساتھ زیادہ ہمدردی اور پیار و محبت سے پیش آتا ہے جب تک کہ وہ مکمل صحت یاب نہیں ہو جاتی۔ اگر چہ ڈاکٹر عنبرین ایک ماہر اعصابیات کے علاج سے ٹھیک ہوتی ہے مگر اس کے پیچھے ڈاکٹر منصور کاشغری کی وفاداری، توجہ اور پیار و محبت بہر حال موجود رہتے ہیں، اس طرح منصور کاشغری کا کردار ایک نئے، بہتر اور اعلیٰ مرد کی صورت میں ابھرتا ہے۔

مذکورہ ناول بنیادی طور پر پسماندہ طبقے کے طوائف پیشہ کے ماحولیاتی زندگی کے اردگرد گھومتا ہے۔

اس ناول کے دو کردار دل نواز بیگم اور عندلیب بانو ایسے ہیں جن کے اندر طوائف پیشہ سے گناہ کا احساس شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ جب ایک حادثے میں دل نواز بیگم کا چہرہ جل جاتا ہے تو اس کے اندر سے احساسِ ندامت ابھر کر سامنے آتا ہے وہ اپنے گناہوں سے معافی مانگ کر ایک شریف آدمی سے شادی کر لیتی ہے اور اس کے ساتھ حج کر کے جمن بی کہلاتی ہیں۔ جمن بی اپنی بہن مہرو بیگم کو بھی طوائف طبقے کی پسماندہ زندگی سے توبہ کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ جمن بی کی زندگی میں بہت سے مشکلات آتے ہیں، معاشی پسماندگی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے باوجود اس کے وہ اپنی بہن کی حرام کمائی سے روٹی نہیں کھاتی بلکہ گھر کی معمولی چیزیں فروخت کر کے اپنی زندگی بسر کرتی ہے اور اپنی بقیہ تمام زندگی اللہ کی عبادت کر کے اپنے سابقہ گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کرتی ہے، جبکہ دوسرے کردار عندلیب بانو کے ذریعے مصنفہ نے پوری نسل کے المیے کو پیش کیا ہے۔ عندلیب بانو کی ذات میں احساسِ گناہ اس قدر ہے کہ ڈاکٹر منصور کاشغری کے سامنے وہ اپنا سارا ماضی کھول کر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے تاکہ وہ اپنی بیٹی عنبرین کے مستقبل کو بہتر بنا سکے۔ اس طرح عندلیب بانو جدید انسان کے روپ میں سامنے آتی ہے جس کو اپنے ماضی پر شدید شرمندگی ہے۔ بہر حال مذکورہ دونوں کردار ذہنی کش مکش اور عجیب طرح کے تذبذب کے شکار ہیں۔

پورے ناول میں عندلیب بانو کا اپنی والدہ نواب بیگم سے ہمیشہ نظریاتی تصادم نظر آتا ہے، وہ اپنی والدہ کی زندگی سے ہرگز مطمئن نہیں تھی، وہ ایک مختلف زندگی گزارنے کی خواہاں تھی کیوں کہ وہ اپنی موجودہ پہچان سے باغی تھی، وہ اپنا نیا حوالہ اور نئی پہچان کرانا چاہتی تھی مگر اس کی والدہ نواب بیگم اسے اپنی طرز کی زندگی پر چلانا چاہتی تھی، اس طرح دونوں ماں بیٹی کے مابین سرد جنگ اور ذہنی کش مکش ہمیشہ جاری رہی۔ ایک دن عندلیب بانو دین اور دنیا سے بغاوت کرتے ہوئے اپنی والدہ نواب فاطمہ سے کہتی ہے۔

> ''چاروں طرف اتنی بے انصافیاں اور مظالم دیکھنے کے بعد ایک شفیق و کریم، منصف و عادل، خبیر و بصیر قادر مطلق کا وجود سمجھ میں نہیں آیا، آج تک نہیں آیا۔۔۔۔ میرے اندر بہت دنوں سے جو لاوا سا ابل رہا تھا اب وہ سطح پر آ چکا تھا، میں نے دسترخوان پر سے اٹھتے ہوئے اعلان کیا،

آپ سب کان کھول کر سن لیجیے، نہ میں آپ کا دین قبول کرتی ہوں، نہ
آپ کا خدا، نہ آپ کا پیشہ۔''۴۳؎

ڈاکٹر عنبرین بیگ کو اپنی والدہ اور نانی کے داغ دار ماضی کی بدولت اور اپنی شناخت نہ ہونے کی وجہ سے حال اور مستقبل تاریک نظر آتے ہیں۔ وہ ایک نہ ختم ہونے والے عذاب سے دوچار ہے، اسی پریشانی کی بدولت اس پر ڈپریشن کے دورے پڑتے ہیں، وہ اپنے لیے خوبصورت مستقبل کی خواہش مند ہے مگر اس کی والدہ اور نانی کا ماضی اس کی خوشیوں میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ حالاں کہ عندلیب بانو چاہتے ہوئے بھی اپنی بیٹی ڈاکٹر عنبرین کو ویسا مستقبل نہیں دے پاتی جس کا وہ خواب دیکھا کرتی تھی۔ عندلیب بانو نے اپنی بیٹی کے مستقبل کی خاطر ہی تو اپنا سارا کچا چٹھا ڈاکٹر مصور کاشغری کے سامنے کھول دیا تھا۔ یہ سب بتانے کی وجہ سے ڈاکٹر منصور کاشغری ذہنی طور پر ان کی طرف مزید مائل دکھائی دیتا ہے۔ یہاں ڈاکٹر منصور کا کردار ہمارے معاشرے کے اجتماعی رویے کا عکاس ہے جو ان کے گناہ آلود ماضی کے باوجود نہ صرف ان کے دکھ درد کو محسوس کرتا ہے بلکہ اپنی ہمدردی بھی ظاہر کرتا ہے۔ ڈاکٹر عنبرین اپنی موجودہ شناخت سے متنفر ہے۔ اسی پہچان نے اس کی شخصیت کو مجروح، غیر متوازن، منتشر اور ذہنی بیمار کر دیا ہے۔ پہچان کے بحران کے اس عمل کو مصنفہ نے انفرادی سطح پر لا کر برعظیم میں ہونے والی تہذیبی شکست وریخت سے منسلک کر دیا ہے۔

چاندنی بیگم:

قرۃ العین حیدر کے فکشن کی تخلیق میں ان کا اہم اور آخری ناول ''چاندنی بیگم'' ہے جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے پہلی بار ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ جس میں تخلیق کار نے قیام پاکستان سے لے کر موجودہ دور تک کی معاشی و معاشرتی حالات کی تبدیلی میں انسانی زندگی کو پیش کیا ہے۔ سماج کے طبقاتی نظام میں اعلیٰ و پسماندہ طبقے کے ذہنی فکر اور اس کے زندگی کے مسائل کو نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قرۃ العین حیدر کا ناول ’’چاندنی بیگم‘‘ واحد ایسا ناول ہے جس کا عنوان کسی شعر سے ماخوذ نہیں ہے۔ اسی طرح یہ ناول مصنفہ کے مذکورہ تمام ناولوں سے مختلف بھی ہے۔ ناول کے عنوان کے تحت کردار کی حیثیت ناول میں معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ۴۲۴ صفحات پر پھیلے ہوئے مذکورہ ناول میں چاندنی بیگم اپنے جسمانی وجود کے ساتھ ناول کے کچھ ہی حصے یعنی صفحہ ۹۷ سے صفحہ ۱۶۴ تک دکھائی دیتی ہے، اس کے بعد اپنے ہی ہاتھوں سے لگنے والی آگ میں لقمۂ اجل بن کر جسمانی طور پر منظرِ عام سے غائب ہو جاتی ہے لیکن مصنفہ کی فنی وفکری گرفت کے سبب، چاندنی بیگم جل کر مر جانے کے باوجود ناول کے مختلف کرداروں کے دلوں اور ذہنوں میں اختتام تک کسی نہ کسی طرح موجود رہتی ہے۔ ناول کے تخلیقی کاوش اور پسماندہ طبقے کے کرداروں کے متعلق رضی عابدی لکھتے ہیں کہ:

> ’’قرۃ العین کا تازہ ناول ’’چاندنی بیگم‘‘، قطعی طور پر مایوس کن ہے اور یہاں وہ اپنے مقصد میں ۔ اگر کوئی مقصد تھا۔ تو بری طرح ناکام ہو گئی ہیں۔ شروع شروع میں یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید زندگی میں پہلی مرتبہ انھوں نے نچلے طبقوں کے متعلق ناول لکھنے کا فیصلہ کیا ہے لیکن جلد ہی نچلے طبقہ کے لوگ اعلیٰ سوسائٹی کے لیے ایک طرح کا پس منظر کا کردار ادا کرنے لگتے ہیں۔ بیلا ایک انحطاط پذیر جاگیردارنہ گھرانے کے ایک رومانوی انقلابی نوجوان سے شادی کر لیتی ہے۔۔۔ یہاں انھوں نے کردار اتنے مختلف بلکہ متضاد سماجی حیثیتوں سے لیے ہیں کہ ان میں کوئی رشتہ قائم نہیں ہوتا اور کوئی ایک مربوط کہانی نہیں بنتی۔‘‘ ۴۴

کہانی کی ابتداء میں ہماری ملاقات فیوڈل طرزِ رہائش کے حامل خاندان سے ہوتی ہے جو زوال پذیر ہے۔ اعلیٰ طبقے کے اس خاندان میں تین افراد بیرسٹر اظہر علی شیخ، ان کی بیوی بدر النساء، عرف بٹو باجی اور بیٹا قنبر علی ہیں۔ پسماندہ طبقے کے شاگرد پیشہ میں علاؤالدین موٹر ڈرائیور، رمضانی خانساماں، اپنے اہل وعیال کے ساتھ عید وخدمت گار، کوارٹر کے سرے پر نتھا دھوبی اور اس کے گھر والے رہتے ہیں۔ بھگوان دین مالی اور پھٹکو

چوکیدار باغ کے کاٹیج میں رہائش پذیر ہیں۔

ناول کے کرداروں میں بیرسٹر شیخ اظہر کا بیٹا قنبر علی جس کی سوچ اور فکر اپنے والد سے الگ ہے، وہ ترقی پسند نظریات کا حامل ہے۔قنبر علی اعلیٰ طبقے کے فیوڈل نظام کا پروردہ ہونے کے باوجود اپنے نظام کو پسند نہیں کرتا کیوں کہ وہ اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کے طبقاتی فرق کو مٹانا چاہتا تھا، وہ ایک غیر طبقاتی سماج کا خواب دیکھتا ہے۔اس کی ماں بھی سوشل ورکر اور روشن خیال خاتون ہے جو ہر وقت حقوقِ نسواں کے لیے جدو جہد کرتی دکھائی دیتی ہے اور اپنی کوٹھی پر آنے والی پسماندہ طبقے کی غریب، مفلس اور مفلوک الحال خواتین کی مدد بھی کرتی نظر آتی ہے۔

علاقہ کا دوسرا خاندان راجہ انور حسین کا ہے جو سفید رنگ کے تین کٹوری ہاؤس میں قیام پذیر ہے۔اعلیٰ طبقے کے اس خاندان میں راجہ انور حسین کے علاوہ ان کی بیوی رانی صولت زمانی، وکی میاں اور بوبی، بیٹیوں میں زرینہ سلطانہ، پروین سلطانہ اور صفیہ سلطانہ ہیں جب کہ پسماندہ طبقے کے ملازم پیشہ میں الا ئچی خانم خوش قدم، بتاشن بوا، وزیرن، نوازن اور سونا کلی رہائش پذیر ہیں۔

قنبر علی کی شادی بچپن میں ان کی کزن صفیہ سلطانہ سے طے کر دی گئی تھی۔مگر قنبر علی کے لیے اس میں کوئی رومان نہ تھا لہٰذ قنبر علی کی ماں نے اپنی ایک سہیلی علیمہ بانو جوان کے میکے ظفر پور میں رہتی ہے ان کی بیٹی ''چاندنی بیگم'' سے بیٹے کا رشتہ طے کر دیا۔چاندنی بیگم اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب اور نیک خولڑکی ہے جو ایک پرائیوٹ کالج میں بحیثیت لکچرر تدریسی فرائض انجام دے رہی ہے اور ظفر پور میں اپنے آبائی پسماندہ اور خستہ حال مکان میں رہتی ہے۔قنبر علی کی ماں اپنے بیٹے کے لیے چاندنی بیگم جیسی ہی سیدھی اور نیک بخت لڑکی چاہتی تھی، لیکن اس خواہش کے پیچھے اس کی ماں کا یعنی اعلیٰ سوسائٹی کا استحصالی ذہن بھی موجود تھا۔قرۃ العین حیدر کو غریب طبقے کی مشکلات کا بھرپور احساس تھا۔ذیل کے اقتباس میں سماج کے غریب طبقے کے لئے قرۃ العین حیدر کے یہاں ایک ہمدردی کا جذبہ بھی ابھرتا نظر آتا ہے اور اعلیٰ طبقے کی تنگدلی کا احساس بھی اجاگر ہوتا ہے۔

''بچی ہر لحاظ سے اچھی تھی۔قنبر کی تینوں شرائط پر پوری اترتی تھی۔علاوہ

ازیں غریب گھر کی لڑکی دب کر رہے گی۔تصویر جس میں وہ ایم۔اے کا
گاؤن پہنے ڈگری کا رول ہاتھ میں لیے کھڑی تھی، لکھنؤ واپس آ کر قنبر
میاں کو دکھلائی۔۔۔قنبر میاں دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ''بس ایسی لڑکی
تو ہم چاہتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے
والی۔''۴۵؎

یہاں ''غریب گھر کی لڑکی، دب کے رہے گی'' قابل توجہ ہے جاگیردارانہ نظام کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنے ماتحت رکھنے کے کس قدر شوقین اور خواہش مند تھے۔ یہاں بٹو بیگم جیسی خاتون جو قوم کا غم کھاتی ہیں۔ان کی جاگیردارانہ ذہنیت کی عکاسی ہوتی؟ قرۃ العین حیدر نے اس ایک جملے کے ذریعے اپنے طبقے کے اس سنگدل رویے کی عکاسی کی ہے۔ برس ہا برس کے معمولات انسانی ذہن کی نفسیات بن جاتے ہیں انسان اپنی تعلیم اور عمل کے ذریعے جذبوں کی تطہیر تو کر لیتا ہے یا کوشش کرتا رہتا ہے لیکن کچھ چیزیں خون میں رچ بس جاتی ہیں۔ بٹو بیگم کے باب میں بھی ایسا ہی ہوا۔انھوں نے انسانیت کے لیے کام تو کرنا شروع کیا مگر اپنی جبلت سے نہ فرار پا سکیں۔

قنبر علی اور چاندنی بیگم کا رشتہ طے ہونے کے کچھ عرصے بعد قنبر علی کے والدین کا انتقال ہو گیا،اس کے بعد اس ترقی پسند آئیڈیلسٹ نوجوان قنبر علی نے اپنے خیالات اور نظریاتی مقاصد کی تکمیل کے لیے سیاست اور صحافت میں قدم جما لیے۔ لال کوٹھی اب سیاسی مذاکرہ اور سیاسی محفل کا مرکز ہے۔ غیر مساوات اور طبقاتی تفریق کے خاتمے اور نچلے طبقے کو سماج میں برابری کے حقوق کی باتیں کرنے والا قنبر علی کے تعلق سے جب پسماندہ طبقے کے مراثین طبقے کو پتا چلا تو وہ قنبر علی کے بہت قریب آ جاتے ہیں یہاں تک کہ مراثیوں کے اس طائفہ سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی بیلا رانی شوخ، قنبر علی کو اپنے چنگل میں پھانس لیتی ہے۔ایک موقع پر دورانِ گفتگو بیلا رانی، قنبر علی کو اپنی داستان حیات سناتی ہے، بیلا رانی کی خودداری اور شرافت نے قنبر علی کو بہت متاثر کیا۔

''بیلا کی شرافت اور خودداری نے از حد متاثر کیا۔ وہ ایک نہایت حساس

اور مصیبت زدہ لڑکی اور صحیح معنوں میں آرٹسٹ ۔۔۔اور اس نے جو
کہانی اپنے لوگوں کی سنائی اس سے سماجی تجزیات کے لیے ایک اور
تناظر حاصل کیا۔۔۔وہ تو دراصل اب تک عوامی زندگی کے بارے میں
کچھ جانتے ہی نہیں تھے کوٹھی میں پیدا ہوئے تھے۔مسوری میں پڑھے پر
آسائش زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہمیشہ سے ان کو کیا معلوم تھا کہ سلمز میں
لوگ کس طرح رہتے ہیں۔ یہ غلیظ گلیوں کے اندر گاؤں کے تاریک کچے
مکانوں میں یکلخت احساس ہوا کہ وہ واقعتاً ایک آرام چیئر لفٹسٹ
تھے۔''۴۶

بیلا رانی نے اپنی اور اپنے خاندان کی جو کہانی قنبر علی کو سنائی، اس سے پسماندہ طبقے کی سماجی زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے قنبر علی کی آ گاہی ہوتی ہے، جن میں یہ کہ پسماندہ طبقے کے نچلی ذاتی اور مفلس زدہ لوگ غلیظ گلیوں میں کس طرح زندگی گزارتے ہیں؟ گاؤں کے لوگ کچے اور اندھیرے مکانوں میں کس طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہیں؟ بیلا رانی کی پسماندہ زندگی کی داستان سننے کے بعد قنبر علی کو اس سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ ذیل کے اقتباس میں بیلا رانی شوخ کی زندگی اور اس کے طبقے کی معاشرت کا ایک اور پہلو ملاحظہ کریں جس کا احساس قنبر علی کو بیلا کا ہمدرد بنا دیتا ہے:

''بیویاں کبھی مجھے بڑے شوق سے گواتیں کبھی بری طرح جھڑکتیں۔۔۔
اری چپ ہو جا ری بات کرنے دے اور میں سہم کر اماں کی گود میں جا
بیٹھتی ۔۔۔ہم نوکروں کے ساتھ کھانا کھاتے اماں اور نانی دوپٹے میں
شیرمال اور کباب باندھ کر گھر بھی لے آتیں۔ بابا ہر مردانے میں نقلیں
کرتے کبھی جانوروں کی بولیاں بولتے۔''۴۷

تخلیق کار نے بیلا کے ذریعے پسماندہ طبقے کی مراثین سوسائٹی کی مکمل عکاسی کی ہے۔ بیلا کا کردار سماجی زندگی میں مراثین طبقے کی ساری صورت حال کی وضاحت کرتا ہے۔اس کا تعلق نہایت کسمپرسی کی حالت

میں زندگی گزارنے والے مراثیوں کی ایک طائفہ خاندان سے ہے۔قرۃ العین حیدر نے کہانی کے ارتقائی عمل کو آگے بڑھانے کے لیے بمبئی کی کھولیوں میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کے مختلف مسائل ومعاملات کا عمیق تجزیہ اور کامیاب فوٹوگرافی کی ہے جنہیں زندہ رہنے کے لیے کافی تگ ودو اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مصنفہ نے کھولیوں میں رہنے والے استحصال زدہ طبقے کو نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے، کیوں کہ کھولیوں کی زندگی کے بہت سے راز اس طرح اس ناول میں افشا ہوئے ہیں کہ ان کا کوئی بھی پہلو ادھورا محسوس نہیں ہوتا۔مصنفہ نے بیلا اور چنبیلی بیگم کو کھولیوں میں رہنے والے معاشی لحاظ سے خستہ حال لوگوں کو علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔

> ''اماں ایک سی کلاس فلم میں سیکنڈ ہیروئن بن گئیں۔ہم لوگوں نے کھولی کو اپنی نئی حیثیت کے مطابق سجایا۔۔۔ابا ایک سیکنڈ ہینڈ مسہری خرید لائے۔۔۔اماں چونکہ اب باقاعدہ گویا ہیروئن تھیں وہ مسہری پر سوتیں، بمبئی میں بڑے بڑے کنبے اور پیسے والے بھی۔اسی طرح ساری زندگیاں گزار دیتے ہیں۔چال سسٹم کی اپنی کلچر ہے۔۔۔رنگین مچھلیوں کا ٹینک اور شوکیس کھولیوں میں اسٹیٹس سمبل ہے۔دونوں ہمارے ہاں آ گئیں۔اماں نے اپنے چمکیلے جوتے اور کپڑے شوکیس میں رکھتیں، پڑوسنیں آ کر کھڑی ہو جاتیں اور اماں بڑے سے ان کو اپنی پوشاکیں دکھلایا کرتیں۔''[۴۸]

پسماندہ طبقے کی زندگی کا مکمل ماحول اور اس ماحول کی نفسیات کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔یہاں یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ طبقات انسان کے ذہن میں ہیں اور ہمیشہ دولت کی تقسیم سے ہی طبقات بنتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے بڑی گہرائی میں جا کر اس طبقے کا جائزہ لیا ہے اور اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ ہر طبقہ مزید ذیلی طبقات میں تقسیم ہے اور اندرونی و بیرونی سطح پر دولت کے توسط سے اپنا اظہار کرتا ہے۔بیلا قنبر علی کے گرد جال بنتی ہے،اس جال میں قنبر علی گرفتار ہو جاتے ہیں اور بالا سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔راجہ رگھبیر سنگھ جو

قنبر علی کے دوست ہیں ان کے توسط سے دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔جس کے بعد بیلا نئی حیثیت سے ایک نئی زندگی کا آغاز کرتی ہیں۔

یہاں مصنفہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ راتوں رات امیر ہو جانے سے اقدار و تہذیب اچانک انسان میں منتقل نہیں ہو جاتی۔انسان کی عادتیں اس کی تہذیب سے وابستہ ہوتی ہیں اور انسان کے اندر رچی بسی ہوتی ہیں۔ان سے چھٹکارا جلد نہیں ہوتا۔پسماندہ طبقے سے اٹھ کر اعلیٰ طبقے میں شامل ہونے والی بیلا اپنی نئی حیثیت پر بے حد خوش ہے۔زندگی کو ترس ترس کر گزارنے کے بعد اب بیلا بہت مطمئن ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''باتھ روم سے تازہ دم ہو کر نکلیں تو گیلری میں سے الحمدو نے آواز دی۔'' ''بہو صاحب چاء گول کمرے میں لگا دی ہے، وہیں تشریف لے چلیئے۔'' ''یہ ہوئی نہ بات۔بہو صاحب۔گول کمرہ میں تشریف لے چلئے۔ارسٹوکریٹک معاملات۔''۴۹؎

ملازمین اپنے معاملات میں مگن اور خاموش تھے اور قنبر علی اپنی مصروفیات میں محو، یہ سرد مہری بیلا کے لیے شدید تکلیف کا باعث بنی۔چنانچہ وہ چڑ چڑی ہو گئی۔وہ سوچتی کہ میری ماں، نانی، بیگمات کی جوتیوں پر بیٹھی تھیں، ملازموں کی رکھائی کی وجہ ہے۔مختلف خیالات انھیں پریشان کرتے چنانچہ ایک دن وہ قنبر علی سے شکوہ کرتی ہیں جس کے جواب میں وہ کہتے ہیں:

> ''نہیں یہ بڑی عجیب سچویشن ہے علاوہ سوختہ (منشی بھوانی شنکر سوختہ) کے یہ سب کمین سمجھے جاتے ہیں مگر انہی کے طبقے کے ایک فرد کو اونچی حیثیت مل جاتی ہے تو ان کو برا لگتا ہے۔یہ واقعی اپنی زنجیروں سے محبت کرتے ہیں۔یہ چاہتے ہیں آقا ہمیشہ آقا رہے۔تم خواہ مخواہ ایک غیر طبقاتی نظام قائم کرنے کی فکر میں ہلکان ہو رہے ہو۔''۵۰؎

یہ تمام صورت حال اس بات کو واضح کرتی ہے کہ بیلا عدم تحفظ کا شکار ہے۔موگرے ڈوم کی یہ بیٹی

اپنے ماضی اور اپنے پسماندہ طبقے کے بیک گراؤنڈ کو تو بالائے طاق رکھ دیتی ہے مگر اس طبقے کے رویے جو اس کے خون کا حصہ ہیں وہ تبدیل نہیں ہو پاتے۔ اپنی نئی حیثیت سے توازن قائم کرنے میں شدید نا کام ہے۔ اس لئے بڑھتا ہوا احساس تحفظ باغ کا مطالبہ کرتا ہے اور وہ تقاضہ کرتی ہے کہ باغ میں ان کے نام لکھ دیے جائیں۔ اس بات پر دونوں کے درمیان جھگڑا ہوتا ہے۔

''تمہارے بے بی کو کھیلنے کے لئے اتنا بڑا باغ درکار ہے جبکہ عوام کے کڑوں بچے بھوکے ننگے خاک پھانتے پھر رہے ہیں۔''

''میں تو جب مانوں جب تم خود جا کر ان کے ساتھ جھونپڑی میں رہنے لگو۔''

''موقع پڑنے پر ایسا بھی کر سکتے ہیں ہم''

''ہرگز نہیں تم کو آرام دہ گھر بھی چاہیئے اور بڑھیا ولایتی دارو بھی۔''[۵۱]

قرۃ العین نے اپنی کلاس (فیوڈل طبقے) کے دو گلے پن کو بڑی اچھی طرح بیان کیا ہے۔ ادھر بیلا بھی ہر ممکن طور اپر کلاس کا حصہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے مگر کہیں نہ کہیں اس سے چوک ہو جاتی ہے۔ دراصل تخلیق کار نے اس منظر کو پیش کرتے ہوئے نچلے طبقے کے اس رویے پر سخت تنقید کیا ہے۔ ذیل کے اقتباس میں مصنفہ کی اس تنقید کی وضاحت ہو جائے گی، ملاحظہ کریں:

''سنو الحمدو۔ مجھ سے بحث مت کرو جو میں حک دوں خاموشی سے کرتی جاؤ۔ یہ نمکدان اٹھا۔ مانجھ کر ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دو۔''

الحمدو دوپٹے کا پلو منہ پر رکھ کر ہنسیں۔ ''یہ نمکدان نہیں بیگم صاحب دان کا قلمدان ہے چاندی کا۔''

''خیر ہوگا''۔ اور یہ ایسے خوبصورت گلدان بھی یہاں پڑے ہیں۔

''اگالدان ہے بہو صاحب۔''

وہ جھلا گئیں۔۔۔۔ جو میں کہہ رہی ہوں کرو۔ سنا کیا؟

الحمدو نے تر کی بہ تر کی جواب دیا۔ ''ارے پہلے کوتیوں میں رہنا تو سیکھیے پھر حکم چلایئے۔''۵۲

پوری تفصیل بیلا کے بے ڈھنگے پن کی ہے۔قرۃ العین نے یہاں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ راتوں رات دولت مند ہونے سے اقدار حاصل نہیں ہوجاتا اور نا ہی طبقاتی سطح پر اچانک تبدیلی آجاتی ہے۔ بیلا کو دولت کا چسکا ہے، وہ دولت کو بے دریغ خرچ کرنے ، ملازموں پر حکم چلانے اور نمائش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔مگر وہ امیرانہ شان وشوکت اور تہذیب و اقدار سے محروم نظر آتی ہے۔ جہاں بھی اس طرح کی صورت حال پیدا ہوتی ہے قرۃ العین اپنی تمام ہمدردی کے باوجود نچلے طبقے کے طرزِ عمل پر شاکی دکھائی دیتی ہیں،جیسا کہ مذکورہ اقتباس سے تخلیق کار کی طنز یہ وضاحت دکھائی دیتی ہے۔

دوسری طرف چاندنی بیگم کا کردار ہے۔جن کا تعلق ایک ایسے طبقے سے ہے جو سابقہ اشراف تھا،مگر امتداد زمانہ نے انھیں ان تمام چیزوں سے محروم کردیا ہے اور نچلے طبقے کی طرف ڈھکیل دیا ہے۔حالات کی ستم ظریفی مزید اور بھی بڑھ جاتی ہے جب چاندنی بیگم کی والدہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔چاندنی بیگم بے یارو مددگار ہوکر نہایت کسم پرسی کی حالت میں ظفر پور سے ریڈ روز ہاؤس قنبر علی سے ملنے آتی ہے، یہاں اس کی ملاقات قنبر علی کے بجائے بیلا رانی سے ہوتی ہے۔چاندنی بیگم نے لاعلمی میں بیلا رانی کو ملازمہ سمجھ کر قنبر علی سے اپنی منگنی اور دیگر تمام سرگزشت سنا ڈالتی ہے۔چاندنی بیگم کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیلا رانی پسماندہ طبقے کی مراثین ہے اور اس کی شادی قنبر علی سے ہو چکی ہے تو اسے شدید دھچکا لگتا ہے اور اس کے جذبات مجروح ہو جاتے ہیں۔ان تمام حالات سے آگاہی کے بعد چاندنی بیگم نے بیلا رانی شوخ سے کہا کہ مجھے اس گھر سے کہیں پہنچا دو میں وہاں جا کر کوئی نوکری تلاش کرلوں گی ۔ بیلا رانی کی توسط سے چاندنی بیگم کی ملازمت تین کٹوری ہاؤس میں بحیثیت ملازم رکھی جاتی ہے ۔چاندنی بیگم کی رہائش کا انتظام کوٹھی کے بجائے شاگرد پیشہ میں کیا گیا جہاں وہ پسماندہ طبقے کی دوسری نوکرانیوں کے ساتھ رہنے لگی۔تین کٹوری ہاؤس کی رانی صاحبہ چاندنی بیگم سے یوں مخاطب ہوئیں ۔اقتباس قابل غور ہے:

''سنو بھئی چاندنی ! بات یہ ہے کہ کوٹھی کے اندر تو بالکل جگہ نہیں ہے۔

ماشاء اللہ سے پینی بیٹا اور ان کے بچے آئے ہوئے ہیں۔۔۔۔تم فی الحال الا یچی خانم کے ساتھ بسر کرلو۔ ان کا باتھ روم وغیرہ بھی اس طرف نزدیک ہی ہے۔انہیں بھی آج کل باہر رہنا پڑ رہا ہے۔۔دالان میں چارپائیاں ایک قطار میں بچھی ہوئی تھیں ۔کھدر کے گدّے، چھینٹ کے لحاف، میلے کچیلے تکیے۔خوش قدم ، بتاشن بوا،وزیرن، نورن،سونا کلی سب وہیں سوتی تھیں۔الا یچی خانم کا پلنگ سرے پر تھا۔ اس کے برابر ایک کھاٹ چاندنی بیگم کے لیے بچھا دی گئی۔۔۔چاندنی لحاف میں دبک گئیں۔نیم کوہستانی ظفر پور بہت سرد مقام تھا مگر وہاں کمرے میں سوتی تھیں باہر سونے کا پہلا اتفاق تھا۔'' ۵۳؎

مذکورہ اقتباس سے واضح ہے کہ چاندنی بیگم کو تین کٹوری ہاؤس میں ایک معمولی نوکرانی کی حیثیت سے پناہ ملی۔ پہلے پہر ملازموں کے ساتھ کھانا پڑا اور پھر شاگرد پیشے میں ہی رہائش کا بندوبست ہوا۔چاندنی بیگم تین کٹوری کی منجھلی بیٹی پروین عرف پینی کے بلاؤز سینے پر مامور ہوئیں۔چاندنی بیگم کے لیے ایک طرف طبقہ امراء کا ناروا سلوک اور دوسری طرف نچلے طبقے کے پسماندہ ملازموں کا حاسدانہ رویہ مزید تکلیف کا سبب بنتا ہے۔کچھ عرصے بعد تین کٹوری ہاؤس میں چاندنی بیگم کی خوبصورتی ،خوب سیرتی اور سگھڑ پن کے اثرات مرتب ہونا شروع ہو گئے ۔لیکن ملازموں کا پسماندہ طبقہ اس طرزِعمل کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔اس کا ردِعمل اقتباس کے ذریعے ملاحظہ کریں:

''اوران ہی کو دیکھو۔'' وزیرن بڑی تلخی سے کہتی رہیں۔آج ان پر وخت پڑا ہے تو باندیوں کے ساتھ رہتی ہیں۔کل پھر سے بیوی بن گئیں تو آ کر کسی باندی کی چارپائی پہ بیٹھیں گی؟ بیلا ذات کی ڈومنی ہیں۔جب یہاں گانے آئی تھیں شادی میں ۔ان کے لیے کھانا کشتی میں لگا کر باہر بھیجا گیا تھا۔ساتھ کسی نے کھلایا بھی نہیں۔اب بیگم بن کر آئیں براتی

ہوئیں۔''۵۴؎

جب چاندنی بیگم کی وکی میاں (جوتین کٹوری پاؤس کے بڑے بیٹے ہیں) سے شادی کی بات چھیڑتی ہے۔تو وہ دوہری سازش کا شکار ہوجاتی ہیں۔ایک طرف تو شاگرد پیشے کی الا یچی خانم جواپنی نواسی کولانا چاہتی ہیں اوررانی بیگم سے یہ بات طے بھی ہوگئی تھی،لیکن چاندنی کے آجانے سے الا یچی خانم کی نواسی کا معاملہ ٹل جاتا ہے۔دوسری طرف بوبی میاں جو وکی کے چھوٹے بھائی ہیں،وہ نہیں چاہتے کہ وکی میاں کی شادی ہو اورتین کٹوری جائیداد کا کوئی دوسرا حقدار پیدا ہو۔انہیں دولت اورعورت کی ہوس ہے،وہ چاندنی کو ورغلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ناکامی پران کے خلاف محاظ آرائی کرتے ہیں۔مس صفیہ سلطانہ بھی ساتھ دیتی ہیں۔ پروین آپا کے طور پر چاندنی کو ساتھ لے جانا چاہتی ہیں۔مگر اپنی ماں کے کہنے پر بدک جاتی ہیں۔آخر میں چاندنی بیگم کا زیور بھی چوری ہوجاتا ہے۔جس پر شاگرد پیشے کے ملازمین مزید ہنگامہ کرتے ہیں کہ ان پر چوری کا الزام لگایا گیا ہے۔چاندنی بیگم کو یہاں سے چلتا کریں۔چنانچہ ناچار چاندنی بیگم قنبر علی کوفون کرتی ہیں۔جو انھیں آکر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔واپسی پر راستے میں تین کٹوری اوراس کے باسیوں کے حوالے سے دونوں کے درمیان تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔اس دوران صفیہ سلطانہ اور بیلا کے حوالے سے بھی قنبر علی اظہار رائے کرتے ہیں۔چاندنی بیگم کوگھر لے آنے پر بیلا،قنبر علی سے خوب جھگڑا کرتی ہیں۔چاندنی بیگم سب کچھ سنتی ہیں،مگرلاچار رہتی ہیں۔بالآخرقنبر علی نے چاندنی بیگم کوانگلینڈ بھیجوانے کاارادہ بنالیا۔

چاندنی بیگم ایک ختم نہ ہونے والی اذیت کا شکار ہوجاتی ہے،اسے ایسا لگتا ہے جیسے وہ پوری دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی ہے اوراس کے لیے کہیں بھی جائے پناہ نہیں ہے۔اس طرح سماج کے ایک بے حسی طبقے نے اس کے جذبات واحساسات کو مجروح کرکے رکھ دیا اور اسے زمانے بھر میں پسماندہ اور دربدر کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا۔اس کی بدقسمتی کا المیہ یہ ہے کہ ریڈروز ہاؤس میں اسی کے ہاتھوں آگ لگ جاتی ہےاور چاندنی بیگم لقمۂ اجل بن جاتی ہے۔اس اندوہ ناک المیے کا سب سے زیادہ دکھ وکی میاں کو ہوا وہ تمام عمر اس صدمے کی شدت کومحسوس کرتے رہے اوراپنا ذہنی توازن بھی کھو بیٹھے۔

قرۃ العین حیدر نے مذکورہ ناول میں ہندوستان کے زوال پذیر اعلیٰ طبقے کی زندگی،ان کا مخصوص کلچر

اورمخصوص ماحول کے ساتھ پسماندہ طبقے کے مراثیوں، بھانڈوں ،مغلانیوں اور اناؤں کی زندگی کے مختلف طبقاتی مسائل سے پردہ اٹھایا ہے۔مصنفہ نے نچلے طبقے کے مراثیوں اور بھانڈوں کے کلچر پرخوب روشنی ڈالی ہے،ان کے کلچر کی روایات صدیوں سے چلی آرہی ہیں۔ یہ روایات نسل درنسل چلتی آرہی ہے۔سامعین اور ماحول کے موافق وہ اپنی گفتگو کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن موجودہ دور میں یہ پسماندہ طبقہ بھی زوال پذیر ہے اوراپنی معاشی زندگی میں بے حال نظر آتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مفلسی مٹاؤ کے نعرے کی تہذیبی،معاشی اور معاشرتی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش بھی ملتی ہے۔اس کے علاوہ لوک گیتوں، برات اور جوگیوں کا ماتم،سوانگ کے طریقوں، بنجاروں کے نوحوں اورحبشیوں کے ماتم کی کیفیات کوعمدگی سے بیان کیا ہے۔ ماتم اورنوحوں کی فضامیں جس طرح کے جذبات اوراحساسات موجودہوتے ہیں وہ ساری کیفیات پوری شدت کےساتھ جھلکتی نظرآتی ہے۔

کارجہاں درازہے:

''کارجہاں درازہے'' قرۃالعین کا سوانحی ناول ہے، جوتین جلدوں پر مشتمل ہے۔پہلی جلد۱۹۷۷ء، دوسری جلد۱۹۷۹ءاورتیسری جلد۲۰۰۱ءمیں شائع ہوئی۔پہلی جلد میں بارہویں صدی سے ۱۹۴۷ءتک کاوقت ہے۔جس میں مصنفہ نے سیدسجادحیدر یلدرم کے علاوہ اپنے دیگر رشتہ داروں اور خاندانی دوستوں کا ذکر کیا ہے۔جن میں اہم سیاسی وادبی شخصیات بھی شامل ہیں۔دوسری جلد میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۶ءتک کا عہد ہے اوراس جلد میں اپنے خاندانی حالات کے ساتھ اپنے عہد کے اہم لوگوں کا تذکرہ کیا ہے، جبکہ تیسری جلد میں موجودہ دورکے اہم سیاسی وادبی لوگوں کے ساتھ،ایک بارپھراپنے خاندان کودوہرایا ہے۔ بقول رضی عابدی:

> ''طبقاتی اورنسلی برتری کی تسکین کے لئے''کارجہاں درازہے'' لکھا گیا۔ یہ ایک ضخیم نیم دستاویزی افسانوی خودنوشت ہے۔ایک سوانحی ناول ایک فیملی ساگا جس میں قصہ گوئی کی ہرنئی پرانی تکنیک کواستعمال کیا

گیا۔خطوط، ڈائری، نظمیں، تاریخی واقعات، اشعار، افسانوں اور
کہانیوں پر مشتمل سب انداز بیان۔۔۔استعمال کئے گئے ہیں۔'' ۵۵؎

اس کے باوجود'' کار جہاں دراز ہے'' صرف ایک فیملی ساگا نہیں۔اس میں برعظیم کی بنتی بگڑتی صورتِ حال وقت کے آئینے میں شفاف طور پر دکھائی گئی ہے۔برعظیم جو ہمیشہ طبقات میں تقسیم رہا، آنے والے حملہ آوروں یا اقوام نے اپنے اثرات مرتب کیے اور طبقات کی ایک نئی ترکیب وترتیب وضع ہوئی۔تاہم مصنفہ یہ بات نہیں بھلا سکتیں کہ ان کا تعلق ایسے خاندان سے ہے جو اپنے عہد کا اشراف اعلیٰ طبقہ تھا۔

مصنفہ کا خاندان ہمیشہ سے ترقی پسند رہا ہے اور زمانے کا نباض بھی، لہٰذا یہ خاندان معاشرے میں نمایاں حیثیت کا حامل رہا ہے۔یہ بھی ایک کلاسی رویہ ہے کہ خود کو اور اپنے خاندان کو ہمیشہ نمایاں حیثیت میں دیکھا جائے۔جس کی باقی معاشرہ پیروی کرے مصنفہ اپنے خاندانی فینومینا کی شکار ہیں۔

''تاریخ کا دوسرا قانون یہ ہے کہ محکوم قوم اپنے ترقی یافتہ بیرونی آقاؤں سے متاثر ہو کر اپنے پسماندہ معاشرے میں اصلاحات کی سعی کرتی ہے۔ہندوستان میں یہ عمل راجہ رام موہن رائے کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا۔خود اپنے گھر میں ہم لڑکپن سے ممانی جان اور ان کی ہوشمند سہیلیوں کی سرگرمیاں دیکھتے آرہے تھے۔۔۔طبقاتی شعور وغیرہ بہت دور کی باتیں ہیں۔مگر اسی اجلاس (لکھنؤ کانفرنس) میں ممانی جان نے یہ تجویز پاس کرائی کہ متمول بیبیاں زرق برق کپڑے اور زیور پہن کر جلسوں میں شرکت نہ کریں۔اس سے معمولی حیثیت کی بہنوں کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔اس کے بعد سے عورتوں نے قومی جلسوں میں سادہ کپڑے پہننے شروع کیے۔'' ۵۶؎

اس اقتباس سے جہاں بالائی طبقہ نظر آتا ہے وہیں نچلے طبقے کے لیے ایک ہمدردی کا جذبہ بھی نظر آتا ہے۔بلاشبہ یہ خاندان اعلیٰ اخلاق کا مالک دکھائی دیتا ہے، کہ اس دور میں بھی اس بات کا خیال رکھا گیا کہ کسی

کی دل آزاری نہ ہو۔ یا کوئی کلاس کمپلیکس کا شکار نہ ہو۔ ان تمام باتوں کے باوجود خود کو ڈی کلاس کرنے کا جذبہ دکھائی نہیں دیتا۔ نچلے طبقے سے ہمدردی کی جاسکتی ہے مگر ان کی سطح پر زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ قرۃ العین حیدر ہی نہیں ہر اس انسان کا مسئلہ ہے جو اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ نچلے طبقے کی ایسی کوئی فینٹیسی نہیں ہوتی جو پرکشش ہو۔

یہ برعظیم کی زمینی حقیقت ہے کہ ذات پات، طبقات ان کی روح میں سرائیت کئے ہوئے ہیں اور یہ قرۃ العین کا شعور ہی ہے جو معاشرے کے ایک بڑے المیے کو اس طرح پیش کرتی ہیں۔ دراصل طبقات ہمارے ذہن میں ہیں۔ ہم خود کو ڈی کلاس کرنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔ اس لیے یا تو احساس تفاخر کا شکار رہتے ہیں یا کم حیثیتی کے غم میں مبتلا رہتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر اپنے گرد ہونے والی تبدیلیوں کا عمیق نظر سے مطالعہ کرتی ہیں۔ نئے عہد میں معاشی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے تمام طریقے موجود تھے، کوئی تجارت کر رہا ہے تو کوئی باہر جا کر مزدوری کر کے اپنی معاشی پسماندگی کو دور کرنے میں کڑی محنت کرتا ہے۔ اس تعلق سے اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''عبدالرحمٰن کے لڑکوں نے دوبئ، کویت جا کر خوب پیسہ کمایا۔ کراچی میں کوٹھی بنوالی Carved فرنیچر سے اسے سجایا ہے۔ پچھلے دنوں لاہور میں بھابھی وحیدہ علیل تھیں کراچی میں عبدالرحمٰن مرض الموت میں مبتلا روزانہ اپنے بیڈ سائیڈ ٹیلی فون سے لاہور اچھو بی بی کے یہاں ٹرنک کال کر کے بھابھی وحیدہ کی خیریت دریافت کرتا تھا۔
>
> ''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ کیا غریبوں کو ہمیشہ غریب رہنا چاہئے؟''
> میں دریافت کرتی ہوں عبدالرحمٰن کے بیٹے محنت کش طبقے سے نکل کر اب نئی بورژوازی میں شامل ہو چکے ہیں۔ عبدالرحمٰن میں اپنی پرانے آقاؤں کے لیے فیوڈل وفاداری موجود تھی۔ طبقات اور انسانوں اور انسانی رشتے داروں کے بدلتے ہوئے گراف۔''۵۷

یہاں مصنفہ شعوری طور پر یہ کوشش کرتی دکھائی دیتی ہیں کہ غریب کو بھی ترقی کرنا چاہیے لیکن عبد الرحمٰن کے باب میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر پرانے ملازم اپنے فیوڈرل لارڈز کو یاد رکھیں اور ان سے عقیدت کا اظہار کریں تو وفاداری کا ثبوت بھی فراہم ہو جاتا ہے اور حق نمک بھی ادا ہو جاتا ہے۔مگر بدلتے ہوئے عہد میں تبدیلیاں بڑے پیمانے پر رونما ہو رہی ہیں۔اس بدلے ہوئے عہد میں فیوڈل آقاؤں کی تسکین کا سامان کم ہوتا جا رہا ہے۔آگے چل کر لکھتی ہیں۔:

> ڈرائنگ روم میں عہد رفتہ کی ایک یادگار واحد چوبی تختے سے بنی، بے حد طویل نادر ڈرائنگ ٹیبل پر رات کا کھانا چنتے ہوئے ایک قدیم فیوڈل ملازم مجھ سے کہتا ہے۔''بی بی برا نہ مانیے تو ایک بات کہوں۔گورنمنٹ نے بھنگی چماروں کا دماغ خراب کر دیا ہے۔سب ہماری برابری کرنا چاہتے ہیں۔''۵۸ ؎

طبقاتی آویزش جو اس عہد میں پھیل رہی تھی اس اقتباس سے عیاں ہے۔یعنی پورے برعظیم میں طبقات اتھل پتھل ہو رہے تھے۔نوابین کے لیے بھی لمحہ فکر یہ تھا اور ان کے ملازمین کے لیے بھی کیونکہ یہ ملازمین بڑے فخر سے بتاتے تھے کہ ہم فلاں نواب کے یہاں کام کرتے ہیں۔طبقات نئے سرے سے ترتیب پا رہے تھے۔مگر غیر طبقاتی نظام کے رائج ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔

قرۃ العین حیدر کے مطابق انڈیا، پاکستان دونوں جگہ حالات یکساں تھے انگریز جو حفظ مراتب قائم کر گئے تھے وہ جاری تھا۔مگر اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ طبقاتی تقسیم کا یہ سلسلہ اور نظام انگریزوں سے بہت پہلے کا تھا۔ان کے لیے زمین ہموار تھی، انہیں بس بیج ڈالنا تھا، طبقات کی نئی فصل کے لیے حالات سازگار تھے، وقت کے ساتھ قرۃ العین حیدر کے رویے میں تبدیلی آئی ہے۔جلد سوم میں اس کا واضح اظہار ملتا ہے۔

> ''کلکتے کے بھدرا لوگ، میں یوپی کے اس نئے انگریزی تہذیب سے متاثر طبقے کو مسلم بھدرا لوگ کہتی ہوں۔ہماری سماجی تاریخ میں انہوں نے ایک اہم رول ادا کیا یعنی نسوانی اور سیاسی شعور۔اب یہ سیاسی شعور

۱۹۳۷ء کے بعد یک لخت زیادہ تر مسلم لیگ کے کھاتے میں چلا گیا۔ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے اپنی کلاس کا تحفظ اس معاشرے کی ایک خصوصیت تھی اور اس معاشرے میں جو انقلاب پیدا ہوئے وہ بھی آخر آخر میں زیادہ تر اپنے اسٹریوٹائپ پر لوٹ گئے۔ بنگال میں عموماً ایسا نہیں ہوا۔ گو یہاں لندن میں ایک پرانا انقلابی کنبہ رہتا ہے۔ اس بار وہ بے حد لیفٹ ونگ بی بی مجھے بتا رہی تھیں کہ وہ اپنے خاندان کی چار سو سالہ پرانی تاریخ پر مبنی ایک ناول لکھ رہی ہیں۔ ان کے گھرانے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اکبر کے زمانے سے لے کر آج تک ان کے خاندانی کالی ٹیمپل میں چار سو برس سے متواتر پوجا ہوری ہے پجارن مرتے جاتے ہیں ان کی جگہ ان کی اولاد لے لیتی ہے۔ پوجا کے معمول میں فرق نہیں آیا۔۔۔ ایک وقت تھا جب انہیں خاتون نے اپنے خاندان کے فیوڈل بیک گراؤنڈ کو قطعاً مسترد کر دیا تھا اور اس کا تذکرہ کرتے بھی جھینپتی تھیں۔ ان بی بی سے مل کر مجھے ہندوستان کی وہ چند خواتین یاد آئیں جو ایک زمانہ میں بڑی زبردست انقلابی مشہور تھیں۔" [۵۹]

یہ اقتباس اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ انسان خود کو کبھی ڈی کلاس نہیں کر سکتا۔ ہمارے جینے کے لیے ایک احساس تفاخر کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔ ہم انقلاب کے زمانے میں بہہ جاتے ہیں۔ مگر اپنے آباؤ اجداد سے ناطہ ختم نہیں کر سکتے۔ خاص طور پر اس قت جب زمانے کا چلن بدل رہا ہو ہم لاشعوری طور پر اس وقت اپنی خاندانی شان وشوکت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ قرۃ العین حیدر کے ساتھ بھی رہا گو کہ انھوں نے خود کو کبھی ڈی کلاس کرنے کی کوشش نہیں کی۔ قرۃ العین حیدر جب اپنے اردگرد کا جائزہ لیتی ہیں تو انہیں ہر جگہ طبقاتی تفریق کے مسائل ہی نظر آتے ہیں۔ یعنی ہر معاشرہ طبقات میں تقسیم دکھائی دیتا ہے۔ مختلف ممالک کے

حوالے سے بھی انھوں نے اس بات کا جائزہ لیا ہے لکھتی ہیں:

''کلاس سسٹم'' اشتراکی ملکوں میں بھی رہی۔ مجھے وہ منظر کبھی نہیں بھولے گا جب شمالی روس کے شہر اسکوف میں ایک اعلیٰ درجے کے کلب میں ہم تین ہندوستانی مندوبین کی دعوت کی گئی۔ ہمارے میزبان فوجی وردیوں میں ملبوس جنرل بھی تھے اور اعلیٰ عہدیدار سویلین بھی۔ ایوان طعام کے دریچوں کے باہر عوام کی بھیڑ جمع تھی جو کھڑکیوں کے شیشے سے جھانک جھانک کر ہمیں دیکھتے رہے۔ میں نے اپنی روسی ترجمان سے کہا، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس خصوصی دعوت کے بجائے ایک عام کھانا ہوتا جس میں پبلک بھی شامل ہوجاتی؟ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔''۶۰

گویا یہ انسان کی سرشت میں داخل ہے کہ وہ کس کو افضل اور کس کو حقیر سمجھے۔ اس لحاظ سے بالائی طبقہ (اعلیٰ طبقہ) ہمیشہ توجہ کا مرکز رہتا ہے اور پسماندہ طبقہ (نچلا طبقہ) کسی نہ کسی طور پر اعلیٰ طبقے میں شمولیت اختیار کرنے کے لیے کوشاں؟ آگے چل کر لکھتی ہیں۔:

''دیسی عیسائیوں میں عموماً لڑکیاں بہت اسمارٹ اور تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور لڑکے احساس کمتری کا شکار اور پھسڈی رہ جاتے تھے اور زیادہ تر چھوٹی موٹی ملازمتوں پر اکتفا کرتے تھے چنانچہ اس طبقے کی لڑکیاں اپر کلاس ہندو یا مسلمان لڑکوں سے شادی کرلیتی تھیں۔''۶۱

یہ ایک عمومی رویہ رہا تقسیم کے بہت بعد تک فی زمانہ بھی طبقات موجود ہیں اور اپنے اپنے دائرہ کار میں سرگرم عمل ''خدیجہ مستور کے مراسلے'' کے عنوان کے تحت اس تحریر پر مصنفہ ''کار جہاں دراز ہے'' کی تیسری جلد کا اختتام ہو جاتا ہے۔ مجموعی طور پر تینوں جلدوں میں مصنفہ کے خاندان کے علاوہ اور بھی بہت کچھ طبقاتی جھلکیاں، جن کا احاطہ کرنے کی یہاں کوشش کی گئی۔

....

حواشی:

۱۔ علی احمد فاطمی، مضمون، 'ترقی پسند احساس وشعوراور قرۃ العین حیدر، مشمولہ،قرۃ العین حیدر: شخصیت اور فکروفن، مقالات ورووداد سمینار، خدابخش لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۸،ص ۴۷

۲۔ قرۃ العین حیدر، ناول'' میرے بھی صنم خانے''، مطبع، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹،ص ۳۶۔۳۷

۳۔ قرۃ العین حیدر، ناول''سفینۂ غمِ دل''، مطبع، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۸،ص ۲۲

۴۔ ایضاً(سفینۂ غمِ دل)ص ۲۴۔۲۵

۵۔ ایضاً(سفینۂ غمِ دل)ص ۶۱

۶۔ ایضاً(سفینۂ غمِ دل)ص ۲۲۵

۷۔ ایضاً(سفینۂ غمِ دل)ص ۲۶۵

۸۔ ایضاً(سفینۂ غمِ دل)ص ۲۷۱

۹۔ ایضاً(سفینۂ غمِ دل)ص ۲۷۳

۱۰۔ قرۃ العین حیدر، ناول'' آگ کا دریا''، مطبع، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۸،ص ۲۲۔۲۳

۱۱۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص ۳۳

۱۲۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص ۳۴

۱۳۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص ۳۴

۱۴۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص ۸۲

۱۵۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص ۱۴۸

۱۶۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص ۱۶۲۔۱۶۳

۱۷۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص ۱۵۷

۱۸۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص۱۵۷

۱۹۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص۱۶۱۔۱۶۲

۲۰۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص۱۷۴

۲۱۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص۲۲۹

۲۲۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص۲۶۲

۲۳۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص۲۸۰

۲۴۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص۲۸۴

۲۵۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص۲۸۶۔۲۸۷

۲۶۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص۵۷۶

۲۷۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص۶۰۴۔۶۰۵

۲۸۔ ایضاً(آگ کا دریا)ص۶۰۶

۲۹۔ اسلوب احمد انصاری، مضمون،' آگ کا دریا'، مشمولہ، کتاب نما کا خصوصی نمبر،'' قرۃ العین حیدر فن اور شخصیت''، مدیر ہمایوظفر زیدی، ماہنامہ، کتاب نما، نئی دہلی، ۲۰۰۷، ص۴۰

۳۰۔ قرۃ العین حیدر، ناول،'' آخرِ شب کے ہمسفر''، مطبع، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۱۰، ص۶۳

۳۱۔ ایضاً(آخرِ شب کے ہمسفر)ص۲۴

۳۲۔ ایضاً(آخرِ شب کے ہمسفر)ص۲۹

۳۳۔ ایضاً(آخرِ شب کے ہمسفر)ص۲۹

۳۴۔ ایضاً(آخرِ شب کے ہمسفر)ص۳۵

۳۵۔ خورشید انور، قرۃ العین حیدر کے ناول میں تاریخی شعور، مطبع، انجمن ترقی اردو نئی دہلی، اردو ہند، ۱۹۹۳، ص۲۷

۳۶۔ ایضاً(آخرِ شب کے ہمسفر)ص۹۳

۳۷۔ ایضاً(آخرِ شب کے ہمسفر)ص۱۰۶

۳۸۔ ایضاً(آخرِ شب کے ہمسفر)ص۲۹۹

۳۹۔ قرۃالعین حیدر، ناول،''گردشِ رنگِ چمن''،مطبع،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۱۹۸۸،ص۱۱۱

۴۰۔ ایضاً(گردشِ رنگِ چمن)ص۱۱۱

۴۱۔ ڈاکٹر فاروق عثمان،''اردو ناول میں مسلم ثقافت، مطبع،بیکن بکس ملتان،۲۰۰۲،ص۴۹۵

۴۲۔ قرۃ العین حیدر ،ناول،''گردشِ رنگِ چمن''، مطبع،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی، ۱۹۸۸، ص۲۵۱۔۲۵۲

۴۳۔ ایضاً(گردشِ رنگِ چمن)ص۲۶۲

۴۴۔ رضی عابدی، تین ناول نگار، لاہور پولی سنگ میل، پبلی کیشنز،۱۹۹۴ص ۶۰

۴۵۔ قرۃالعین حیدر، ناول،''چاندنی بیگم''،مطبع،ایجوکیشنل پبلسنگ ہاؤس، دہلی،۱۹۹۰،ص ۱۸

۴۶۔ ایضاً(چاندنی بیگم)ص۳۶۔۳۷

۴۷۔ ایضاً(چاندنی بیگم)ص۳۷۔۳۸

۴۸۔ ایضاً(چاندنی بیگم)ص۴۱

۴۹۔ ایضاً(چاندنی بیگم)ص۴۸

۵۰۔ ایضاً(چاندنی بیگم)ص۶۹

۵۱۔ ایضاً(چاندنی بیگم)ص۸۱

۵۲۔ ایضاً(چاندنی بیگم)ص۹۴

۵۳۔ ایضاً(چاندنی بیگم)ص۱۶۳۔۱۶۴

۵۴۔ ایضاً(چاندنی بیگم)ص۱۲۱

۵۵۔ رضی عابدی، تین ناول نگار، لاہور پولی سنگ میل، پبلی کیشنز،۱۹۹۴ص ۳۶

۵۶۔ قرۃالعین حیدر، ناول''کارِ جہاں دراز ہے''،مطبع، یونیورسل لیتھو پریس،۱۹۷۷،ص ۲۲۶۔۲۲۷

۵۷۔ ایضاً(کارِ جہاں دراز ہے)ص۴۲۷

۵۸۔ ایضاً(کارِ جہاں دراز ہے)ص۴۷۷

۵۹۔ ایضاً(کارِجہاں دراز ہے)ص۸۵۲

۶۰۔ ایضاً(کارِجہاں دراز ہے)ص۹۹۷

۶۱۔ ایضاً(کارِجہاں دراز ہے)ص۱۰۲۰

☆☆☆

حاصلِ مطالعہ

معاشرے میں کوئی بھی نظام ایک دن میں پروان نہیں چڑھتا۔اس کے پیچھے برس ہابرس کا وہ تاریخی عمل ہوتا ہے جو اسے متحرک رکھنے کے ساتھ ساتھ تغیر وتبدل بھی فراہم کرتا ہے۔ دنیا کے کسی خطے کی بھی تاریخ اٹھا کر دیکھ لی جائے، وہاں معاشرہ ارتقائی مراحل طے کرتا دکھائی دیتا ہے۔کبھی کلیساؤں کے زیر اثر عہدِ غلامی جس میں مذہبی پیشوا اعلیٰ طبقے پر مشتمل ہیں اور دیگران کے پیرو اور غلام نچلے طبقے پر مشتمل ہیں۔آقائی عہد میں معاشرہ آقا اور غلام میں منقسم ہے۔انسانی ترقی نے معاشرے کو بھی ترقی دی اور سرمایہ دارانہ نظام نے معاشرتی طبقاتی ساخت کو تبدیل کر دیا۔اب تک معاشرہ اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات میں تقسیم تھا اور صنعتی نظام کے تحت خودکار (اپنے ہاتھ سے کمانے والا، جو کسی کا غلام نہیں) انسان کی پیدائش نے معاشرے کو تین واضح طبقات میں تبدیل کیا۔ جو اعلیٰ طبقہ، متوسط طبقہ اور نچلا طبقہ کہلائے۔

جہاں تک برعظیم کا تعلق ہے تو یہاں کا معاشرہ ذات پات میں تقسیم معاشرہ ہے۔ابتداء میں یہاں کے اصل باشندے دراوڑ بغیر کسی تخصیص و تقسیم کے غیر طبقاتی معاشرے میں رہ رہے تھے۔مگر جب بیرونی حملہ آور، آنا شروع ہوئے تو برعظیم کا معاشرہ مختلف ذاتوں میں تقسیم ہو گیا۔ برعظیم کا معاشرہ سب سے پہلے اس وقت طبقات میں تقسیم ہوا جب آریا یہاں آئے۔انہوں نے آتے ہی یہاں کے اصل باشندوں کو اپنا غلام بنالیا اوران پر ظلم و جبر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ آقا اور غلام، دوطبقات میں تقسیم معاشرہ تھا، یعنی آریاؤں کے ابتدائی دور میں دوطبقات تھے، فاتح (کھشتری) اور مفتوح داس۔

آریاؤں نے ان افراد کوبھی ذات سے باہر کر دیا تھا جو اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کی مخلوط نسل تھی۔یعنی کسی غلام عورت کے بطن سے کسی اعلیٰ نسل کی اولاد ہے تو اس کا مقام بھی غلام کا ہی تھا۔مذہبی رسومات سے بھی انہیں باہر رکھا گیا بلکہ مذہبی رسومات میں ان کی شمولیت کو ممنوع قرار دیا گیا۔دراصل اس نظام قانون سے براہمن کے عمومی کردار پر روشنی پڑتی ہے، نیز براہمن ان کے جان و مال کے بھی مالک تھے۔وہ جب چاہے انہیں ان کی جائیداد اور ان کی زندگی سے محروم کر سکتے تھے،جبکہ غلام کی حیثیت سے انہیں سر تسلیم خم کیا تھا۔

آنے والے وقت میں برعظیم میں آریائی تہذیب نے جب اپنے قدم جما لیے تو معاشرہ اعلیٰ و پسماندہ سے چار طبقات میں تقسیم ہو گیا۔برہمن، کھشتری، ویش اور شودر کچھ عرصے بعد برعظیم کے جنگلوں،صحراؤں اور ساحل سمندر پر رہنے والے آزاد لوگوں کو بھی اس نظام میں شامل کر لیا اور اس طبقاتی تقسیم میں ایک اور طبقے کا اضافہ ہوا جسے چنڈال کہا گیا۔یہ برعظیم میں آریاؤں کے عروج کا دور تھا جس میں معاشرہ پانچ طبقات میں تقسیم تھا۔

آریاؤں کا تقسیمی نظام جو ذات پات پر مشتمل تھا اس نے ظلم و جبر کو فروغ دیا۔نچلے طبقے کے پسماندہ ،شودر اور ویش کسمپرسی کے عالم میں زندگی گزارنے لگے۔یہاں تک کہ گوتم بدھ نے ان کے لیے اس ظلم و جبر سے نجات کا راستہ تلاش کیا۔گوتم بدھ کی تعلیمات نے فروغ پایا تو ہر طرح کی طبقاتی تقسیم کو باطل قرار دیا۔ابتداء میں تو بدھ ازم کو بہت فروغ ملا مگر اعلیٰ طبقوں کے لیے یہ برداشت کرنا ناممکن تھا۔بدھ کے نظریات اور تعلیمی فکر کے ساتھ اعلیٰ طبقے کے مسائل نے بہت کچھ بدل دیا جس کے بعد ہندومت کا دوبارہ احیاء شروع ہوا اس کا بانی شنکراچاریہ تھا۔

بدلتے وقت کے دھارے میں بدھ بھکشوؤں نے خود بھی ہندوؤں کے جلسوں میں شامل ہونا شروع کر دیا تھا۔غرضیکہ، یہ اب صرف نام کے بدھ بھکشو تھے اصلاً ،ان میں براہمن پروہتوں کی خصلت پیدا ہو چکی تھی، اس ماحول میں، دیوتاؤں کے وجود سے منکر، گوتم بدھ کو، وشنو دیوتا کا نواں اوتار مانا جانے لگا جس سے بدھ مت کی انفرادیت جاتی رہی۔یوں تو ہندومت نے بدھ بھکشوؤں کے تعاون سے گوتم بدھ کے پیغام کو سپرد خاک کر کے بدھ کا بت بنا کر پوجنا شروع کر دیا،اس طرح ہندومت کا نظام معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

ساتویں صدی عیسوی سے برعظیم میں مسلمانوں کے دور کی ابتداء ہوتی ہے۔مگر با قاعدہ اور مکمل اثر و رسوخ ظہیرالدین بابر کے عہد میں ملا جس نے مغلیہ عہدِ حکومت کی بنیاد رکھی اور اس کو مکمل عروج عہد اکبر میں ملا۔ایک طرف صوفیاء اکرام مساوات کا درس دے رہے تھے۔دوسری طرف مغلیہ حکومت کے سیاسی مقاصد تھے جن کے حصول کے لیے وہ عوام دوست کی حیثیت اختیار کیے رہے۔اس عہد میں اہلِ ہند کی بھکتی تحریک بھی چلتی رہی اور سکھوں کا وجود منظرِ شہود پر ظاہر ہوا۔اس کے علاوہ ہمایوں کے دور میں جو ایرانی برعظیم آئے، برعظیم میں تشعیت کو بھی ساتھ لائے۔ان حالات میں ملک میں ایک طرف فرقہ واری اور نسلی امتیازات پروان چڑھتے رہے اور دوسری طرف جاگیردارانہ نظام نے فروغ پایا اور معاشرے میں دو طبقات اعلیٰ اور پسماندہ طبقات وجود میں آئے۔وقت کے ساتھ ساتھ مغلیہ حکومت کمزور ہوتی گئی جس کا فائدہ انگریزوں نے اٹھایا۔

برعظیم میں آریاؤں یا مسلمانوں کی آمد نے حالات کو تبدیل کیا اور وہ مستقل طور پر یہاں آباد ہوگئے۔مگر انگریزوں نے برعظیم کو محض تجارتی منڈی تصور کیا اور اپنے دورِ حکومت میں یہاں کی بہت سی دولت اپنے ملک منتقل کی۔اٹھارہویں صدی تک مغرب کی جدید تہذیب اپنے تمام تر پہلو ظاہر کر چکی تھی۔جدید تعلیمی نظام کے ذریعے سیکولرزم، نیشنلزم، جمہوریت اور انسان دوستی جیسے تصورات برعظیم تک پہنچ چکے تھے۔ان تصورات کے ذریعے برطانوی سامراج کے استحصال پر پردہ ڈالے رکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔جدید تعلیمی نظام کے ذریعے جدید تعلیم یافتہ طبقہ وجود میں آیا۔

انگریزوں نے ایک طرف تعلیم کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کیے اور دوسری طرف صنعتی نظام کے قیام سے مفادات حاصل کیے۔صنعتی نظام کے فروغ نے مادیت کو پروان چڑھایا۔مادی قوت کا اضافہ ذاتی، طبقاتی اور قومی مفادات کو غالب صورت میں لے آتی ہے یہی برعظیم کے سماج میں ہوا اور معاشرہ مزید طبقات میں منقسم ہوگیا۔معاشرے میں ایک اور طبقہ، متوسط طبقہ پیدا ہوا۔ان تمام تبدیلیوں کا براہ راست اثر اس عہد کے ادب میں بھی نمایاں ہوا۔

قرۃ العین حیدر کی شروع سے لے کر آخر تک تقریباً تمام تحریروں میں طبقاتی تفریق کے اثرات جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔مصنفہ نے تمام تر طبقاتی پہلوؤں بالخصوص سماج کی اونچ نیچ کے طبقاتی مسائل سے خاصی

متاثر نظر آتی ہیں اس کی مثال ان کی وہ تخلیقات ہیں جو سماج کی طبقاتی تفریق کو نمایاں کرتی ہیں۔ان کے یہاں انسانی جذبوں اور رشتوں کی شکست وریخت اور سماجی آدرشوں اور تہذیبوں کے انہدام کے منظر نامے بحسن وخوبی موجد ہے،اس کے ساتھ ساتھ سماج کے بنائے طبقاتی تفریق کے اصولی نظام پر وسیع اور گہری نظر کا مشاہدہ بھی ملتا ہے۔قرۃ العین حیدر نے سماجی تاریخ کے الٹ پھیر اوراس کے عروج وزوال کی داستان اس طرح بیان کی ہے کہ ان کے یہاں ہمیں سماج کے طبقاتی نظام اوراس کے اصول و پیمانے کی پوری تصویر دکھائی دیتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن اردو ادب میں اب تک ان کی تحریروں کا مطالعہ محدود دائرہ میں کیا گیا ہے،اورانہیں صرف اعلیٰ طبقے کا نمائندہ تخلیق کار کہا گیا ہے۔راقم نے قرۃ العین حیدر کے فکشن میں اعلیٰ طبقے کے بجائے پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی اوران کے مسائل کو پیش کیا ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان کی تحریروں میں پسماندہ طبقے کے کردار ضمنی یا عارضی طور پہ نظر نہیں آتے بلکہ پسماندہ طبقے کی ترجمانی میں ان کے مشاہدے اور عمیق تجربے کا علم واضح طور پر ہوتا ہے۔وہ پسماندہ طبقے کی زندگی سے اچھی طرح واقف تھیں،ان کے ساتھ سماج میں کس طرح کا رویہ اپنایا جاتا تھا اور سماج میں اونچ نیچ کے رویہ سے کس طرح اذیت محسوس کرتے تھے،ان کی تخلیقات میں اس کی تصویر پوری طرح سامنے آجاتی ہے۔اسی ضرورت کے پیش نظر راقم نے اپنے مقالے کا موضوع ''قرۃ العین حیدر کے فکشن میں پسماندہ طبقے کے کرداراوران کے مسائل''منتخب کیا ہے۔جو درج ذیل پانچ حصوں پر مشتمل ہے:

باب اول:قرۃ العین حیدر کے حالاتِ زندگی اورادبی کارنامے:ایک جائزہ

باب دوم:قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کے کرداراوران کے مسائل کی عکاسی

باب سوم:قرۃ العین حیدر کے ناولٹ میں پسماندہ طبقے کے کرداراوران کے مسائل کا تجزیاتی مطالعہ

باب چہارم:قرۃ العین حیدر کے ناول میں پسماندہ طبقے کے کرداراوران کے مسائل:ایک تنقیدی جائزہ

اورآخر میں،حاصل مطالعہ

باب اول''قرۃ العین حیدر کے حالاتِ زندگی اورادبی کارنامے:ایک جائزہ''کے عنوان سے ہے۔

اس باب میں قرۃ العین حیدر کی زندگی ،ابتدائی تعلیم ،تخلیقی محرکات اوران کا ادبی ماحول وغیرہ کے اہم پہلو کا احاطہ کیا گیا ہے ۔مصنفہ کے بے پناہ مطالعے اور مشاہدے اور غیر معمولی ادبی شخصیت کے پیچھے غیر معمولی مواقع اور غیر معمولی والدین کا عمل دخل کارفرما ہے اسی لیے تو مصنفہ نے کہا تھا کہ مجھے اپنے حالات رقم کرنے سے پہلے اپنے آباؤاجداد کے احوال رقم کرنے پڑیں گے کیونکہ میں ان سے ہٹ کر کوئی انوکھی ہستی قطعاً نہیں ہوں ۔قرۃ العین حیدر نے اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ سادات خاندان پر ہمیشہ فخر کیا ہے ۔وہ اپنے ایک مشہور بزرگ سید کمال الدین ترمذی کا سلسلۂ نسب حضرت زین العابدین کے خاندان سے جوڑتی ہیں ۔سید کمال الدین ترمذی بارہویں صدی عیسوی میں ترکستان سے ہندوستان آئے اور قصبہ کیتھل میں قیام کیا،اس خاندان کو مغلیہ سلطنت کی جانب سے جاگیریں عطا تھیں ۔قرۃ العین حیدر کے والد سجاد حیدر یلدرم اتر پردیش کے ضلع بجنور کے ایک قصبہ نہٹور میں رہتے تھے،ان کے دادا میر احمد علی نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کیا اور بغاوت کے جرم میں پھانسی کی سزا سنائی گئی ۔ان کی جان بخشی ان کے بھائی سید بندے علی نے کروائی جو کہ انگریز حکومت کے وفادار تھے ۔قرۃ العین حیدر کے دادا سید جلال الدین حیدر نے ۱۸۵۷ء کے بعد بہت برے حالات سے اپنی زندگی کی شروعات کی اور حسن کارکردگی کی بدولت خان بہادر کا خطاب حاصل کیا ۔سجاد حیدر یلدرم ،سید جلال الدین حیدر کے بیٹے تھے ۔سجاد حیدر یلدرم اپنے دور کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال انسان تھے، جنہیں شروع ہی سے ترکی زبان سے خاصی دلچسپی تھی ۔انہوں نے بہت سے اعلیٰ عہدوں پر کام کیا اور اس طرح انہیں سیاحت کا خوب موقع ملا ۔۱۹۱۲ء میں نذرالباقر کی بیٹی نذر زہرا سے سجاد حیدر یلدرم کی شادی ہوگئی ۔ قرۃ العین حیدر کے ماں باپ دونوں بہت لبرل ،روشن خیال اور ترقی پسند ذہن والے شخص تھے ۔ان کا گھرانوں میں مشرقی ماحول ہونے کے باوجود مغربی ماحول کے اثرات نمایاں تھے اسی لیے قرۃ العین حیدر کو ماں اور باپ دونوں کی طرف سے جو ماحول ملا اس کے واضح اثرات ان کی تحریروں میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔

قرۃ العین حیدر نے اردو افسانوی ادب کو جدید فکر وفن ،تاریخ وتہذیب اور سماج ومعاشرے کی عکاسی میں منفرد کرداروں کے ذریعے اردو ادب کو مالا مال کر دیا ۔مصنفہ کی پیدائش چونکہ ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو قدیم وجدید کی آمیزش اور مشرق ومغرب کا حسین سنگم تھا ۔یہ قدامت پرستی ،جدت پسندی اور بیک وقت

مشرق ومغرب کے اثرات دراصل سماج ومعاشرے کے بدلتے حالات کی وہ سچائیاں ہیں جوان کے خاندان اور ماحول کا خاصہ رہی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے تخلیقی ادب نے روحِ عصر کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیبی ترجمانی کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے۔اس لیے ان کے یہاں ہمیں گہرے مشاہدے اور زندگی کے متنوع تجربے نظر آتے ہیں۔ مصنفہ نے آنکھ کھولتے ہی اودھ کے مخصوص ماحول کو دیکھا کہ اور یہ دیکھا کہ پرانی دہلی جو تہذیب کی نمائندہ تھی آخری سانسیں لے رہی تھی اور نئی دہلی پیدا ہو رہی تھی،اسی دور میں تعلقہ داروں کا لکھنؤ خاص اہمیت کا حامل تھا اور یہ تعلقہ دار لکھنوی تہذیب وثقافت اور زبان و بیان کے ترجمان تھے اور یہی سارا ماحول ہمیں قرۃ العین حیدر کے یہاں جا بجا نظر آتا ہے۔

برعظیم کی تہذیبی وراثت،سماج ومعاشرت اور اس کی یگانگت قرۃ العین حیدر کو بہت عزیز تھی۔مشترکہ تہذیبی ورثے کی تباہی اور سماج میں افراد کا تفریقی نظام کے تحت پسماندہ مسائل کا شدید دکھ ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔برعظیم کے تہذیب ومعاشرت کے ساتھ ان کا جذباتی،ذہنی اور نظریاتی لگاؤ تھا اسی لیے تقسیم ہند کے المناک حادثے کو انہوں نے کسی صورت قبول نہیں کیا۔ان کے لیے تقسیم ہند اور اپنے محبوب باپ کی وفات دو ایسے محرکات اور سانحات تھے جن کا کرب اور دکھ وہ تمام عمر بھلا نہ پائیں بلکہ ان کی بیشتر تحریریں انہی سانحات کے زیر اثر لکھی گئی ہیں۔تقسیم ہند سے جہاں ایک طرف انہیں ذہنی اور جسمانی جلا وطنی کا شکار ہونا پڑا وہاں انہیں ایک لازوال تہذیبی ورثے کی تباہی کا بھی شدید دکھ ہوا اسی لیے وہ ہمیشہ اپنے تشخص اور جڑوں کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتی ہیں کیونکہ ملک کی تقسیم اور ہجرت کے المیوں سے ہماری جذباتی،ثقافتی اور روحانی بنیادیں متزلزل ہوئیں،ویسے تو مصنفہ تقسیم ہند کے بعد اپنی والدہ کے ساتھ پاکستان چلی گئی تھیں جہاں انہوں نے متعدد ملازمتیں بھی کیں اور مختلف اعزازات سے بھی نوازا گیا لیکن تقریباً چودہ پندرہ سال بعد وہ دوبارہ ہندوستان چلی آئیں۔

قرۃ العین حیدر اپنے عہد کی ایک روشن خیال اور خوبصورت خاتون تھیں حتیٰ کہ عمر کے آخری حصے میں بھی جاذبِ نظر،پروقار،بارعب اور پرکشش تھیں۔تمکنت اور طنطنہ ان کا انداز ہ تھا۔بے شمار سہولیات کے

باوجود ساری زندگی شادی نہیں کی۔ان کی شادی نہ کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ سامنے نہیں آسکی۔خدا معلوم وہ ان جکڑ بندیوں اور پابندیوں سے بہت گھبراتی تھیں یا انہیں اپنے باپ جیسا کوئی آئڈیل شخص نہیں مل سکا یا شاید وہ ان پابندیوں کو ادب کے درمیان رکاوٹ سمجھتی تھیں، وجہ کوئی بھی ہو یہ بات تو ممکن ہے کہ اگر شادی کر لیتیں تو شاید اتنی عظیم ادیبہ بن کر اتنا بڑا ادب تخلیق نہ کر پاتیں۔

قرۃ العین حیدر بیسویں صدی کی وہ عظیم ادیبہ تھیں کہ پچاس کی دہائی ہی سے جن کا ادبی حلقوں پر ایسا رعب و دبدبہ قائم ہو گیا تھا کہ ان کے مخالفین اور ان کے تخیل کی بلندیوں تک نہ پہنچ سکنے والے، کوشش کے باوجود ان کے ادبی مقام کو ذرہ برابر بھی کم نہ کر سکے کیونکہ ان کے فن میں اعلیٰ تخیل کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور وہ اس تخیل کی بدولت بہت اونچا اڑتی تھیں، اس پرواز میں بعض اوقات ایسی منزلیں بھی آجاتی ہیں کہ ان کے ساتھ اڑنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ ان کا تہذیبی اور تاریخی شعور جو سماج میں حالات کے زیر اثر افراد کی داخلی اور ظاہری مسائل کی پیش کش میں ان کا فکری کینوس بہت وسیع، جامع اور واضح تھا اسی لیے انہوں نے اپنے حلقۂ ادب میں وسیع و بلیغ دنیائے فن کو تخلیق کیا، ان کی ذات میں انسانی ہمدردی بدرجۂ اتم موجود تھی اسی لیے ان کے یہاں ہمیں سماج کے بکھرے ہوئے انسانی زندگی کا درد دکھائی دیتا ہے اور برعظیم کی تاریخ کا وہ باب نظر آتا ہے جسے ہم نیچ یا پسماندہ طبقے کے غیر اہم کردار سمجھتے ہیں۔

جب بھی ہم کسی ادیب کے فنی وفکری ارتقا کا جائزہ لیتے ہیں تو اس طرح ہم اس کے نقطۂ نظر تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ کیا اس کے فنی وفکری سفر میں ارتقا کا عمل جاری ہے اس ارتقا میں کہاں کہاں اہم موڑ دکھائی دیتے ہیں؟ معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور سماج میں افراد کی زندگی کے مسائل کے متعلق ان کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ اس طرح ہم مصنف کے بنیادی نظریے کے قریب پہنچ جاتے ہیں جس سے فن کار کی شخصیت اور اس کی تخلیقات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بالکل اسی طرح جب ہم قرۃ العین حیدر کے فن اور شخصیت کو ان کی تخلیقات کی روشنی میں پرکھتے ہیں تو ان کے نظریات، ان کا حیات وادب کے متعلق فکر وفلسفہ اور تصوراتِ زندگی واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی فکشن میں زبان و بیان کا جدید رجحان نظر آتا ہے۔ان کے یہاں روایتی زبان کے

ساتھ جدید زبان کی آمیزش کی کوشش بھی واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ روایتی کلاسیکیت کے ساتھ ساتھ جدید سماج اور معاشرتی اقدار کی واضح بازگشت ان کے یہاں نمایاں ہے، اسی حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے فکشن میں سماج کے بدلتے حالات میں افراد کی زندگی اور اس کی مختلف النوع مسائل کی عکاسی نظر آتی ہے۔قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کا محاکمہ یہاں مختصر اور جامع انداز میں پیش کیا جارہا ہے۔تخلیقات کے اعتبار سے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ستاروں سے آگے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔اس مجموعے کے افسانوں کی دنیا بہت محدود ہے۔بچپن، نوجوانی، خواب وخیالات اور خواہشات سے بھری دنیا رومانی پہلو سے بھری ہوئی ہے۔ اس مجموعے کے بیشتر کردار مسرت کی تلاش اور خوف وتحیر کا جذبہ ہمیشہ لیے نظر آتے ہیں۔

باب دوم ''قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کردار اور ان کے مسائل کی عکاسی'' کے عنوان سے ہے جس میں قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا مطالعہ پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کے حوالے سے کیا گیا ہے۔قرۃ العین حیدر کے افسانوں کی منظر نگاری اور کردار نگاری دیکھی جائے تو کردار نگاری اور منظر نگاری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔فنی وفکری نقطۂ نظر سے مصنفہ کے مذکورہ افسانوی مجموعے میں خواب وخواہشات کے پنپنے کا مسلسل عمل کارفرما ہے۔ پہلا افسانوی مجموعہ ابتدائی تحریروں میں شمار ہوتا ہے۔دانشوران ادب نے قرۃ العین حیدر کی تحریروں کو موضوعاتی اعتبار سے محدود دائرہ حد کی تخلیق سے تعبیر کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کا دائرہ اعلیٰ طبقے تک ہی محدود ہے۔لیکن زیر تحقیق راقم نے اس مجموعے کے ان افسانوں کا تجزیہ پیش کیا ہے جس میں اعلیٰ طبقے کے ساتھ پسماندہ طبقے کے کردار بھی موجود ہیں اور ان کی زندگی اور مسائل کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔''پرواز کے بعد'' اس افسانے میں اعظم مسعود، جمال انور، آفتاب اور جمال انور کی والدہ جیسے اعلیٰ طبقے کے کرداروں کے ساتھ میگڈ یلین ڈی کوڈرا عرف مگ اور کارل جیسے پسماندہ طبقے کے کردار بھی ہیں۔جن کی زندگی اور مسائل کو قرۃ العین حیدر نے بڑی فن کاری کے ساتھ افسانے کا موضوع بنایا ہے۔اسی طرح ''ٹوٹتے تارے'' کے کردار رخشندہ عرف شی شی اور کمل پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والے کردار ہیں جو حالات اور سماج کے طبقاتی وتفریقی نظام کے زیر اثر ہیجانی کیفیت میں زندگی گزار رہے ہیں۔''رقص شرر'' کا کردار سلیما مارینا جو دوسری جنگ عظیم کے ماحولیاتی اور جنگی بحران کا شکار

ہے۔سلیما برلن سے ہندوستان آنے کے بعد اپنی معاشی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے نائٹ کلب میں بال روم ڈانسر کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔زیر تحقیق 'ستاروں سے آگے' میں شامل آخری افسانہ ''یہ باتیں'' کے عنوان سے ہے۔اس افسانے کا موضوع بہت ہی اہم ہے ۔تخلیق کار نے ان بے روزگار نوجوانوں کی زندگیوں کو موضوع بنایا ہے جو معاش کی تلاش میں ہمہ وقت سرگرداں رہتے ہیں ۔دراصل تخلیق کار نے افسانے میں دو پہلو پیش کیے ہیں ایک وہ جو معاشی صورت حال سے خوشحال اور ایک وہ جو معاشی صورت حال سے پریشان ۔پسماندہ طبقے کے کردار کی نفسیات کو قرۃ العین حیدر نے بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے کردار کے مسائل آفاقی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

دوسرا افسانوی مجموعہ ''شیشے کے گھر'' کے عنوان سے ہے۔اس مجموعے کے تمام افسانوں پر تقسیم ہند سے قبل اور بعد کے حالات نظر آتے ہیں۔افسانہ ''برف باری سے پہلے'' تخلیق کار کا اہم افسانہ ہے جس میں ہندوستان کی سماجی ،تہذیبی اور معاشرتی زندگی کو دیکھا جا سکتا ہے۔لیکن پورے افسانے پر تقسیم کا المیہ سایہ کی طرح منڈلاتا ہوا قاری کو اپنے سحر میں لے لیتا ہے۔افسانے میں ہندوستان کی سماج کی تصویر کشی جاندار ہے۔ تقسیم کے المیے نے اعلیٰ اور پسماندہ دونوں طبقے کی زندگی کو متاثر کیا ،معاشی طور پر غریب پسماندہ طبقے کے کرداروں میں اصغر ربانی ،ارنا کرسینا اور سگرڈ ربانی ہیں۔دوسری طرف معاشی طور پر خوشحال ماڈرن کرداروں میں نشاط اسٹینلے ،روبی کھوچڑ اور انوری خان ہیں ،دراصل تخلیق کار نے سماجی سطح پر ان کی عیش وعشرت زدہ زندگی کی وجہ سے انہیں گری پڑی نظروں سے دیکھا جاتا ہے گویا یہ سماج کے لیے مخرب الاخلاق کردار ہیں اس لیے سماجی اعتبار سے ان کرداروں کو اعلیٰ طبقے کے لوگ گری ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔'جلاوطن' اردو کے سر فہرست افسانوں میں سے ایک ہے۔یہ افسانہ انسانی اقدار کی شکست وریخت اور تہذیبی زوال پر لکھا گیا کامیاب افسانہ ہے۔'جلاوطن' ہر طبقے کا المیاتی اظہار ہے جو تقسیم کے درداندوہ حالات سے دوچار ہوا۔پسماندہ طبقے کے کرداروں میں رام رکھی ،ممولہ ڈومنی اور وہ سارے کہار جو ایک ایک ودو پیسے کے لیے اپنے کاندھوں پر لوگوں کو اٹھائے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔افسانے کا ایک حصہ اس طبقے کی زندگی اور مسائل کی عکاسی کرتا ہے جسے مصنفہ نے بڑی فن کاری سے افسانے میں جگہ دی ہے۔

قرۃ العین حیدر کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''پت جھڑ کی آواز'' کے نام سے ہے۔اس کا پہلا افسانہ ''ڈالن والا'' ہے۔جس کا پس منظر دہرہ دون میں آباد'ڈالن والا' انڈین اور انگلوانڈین لوگوں کی بستی ہے جس میں مختلف اور متعدد طبقے کے لوگ موجود ہیں۔پسماندہ طبقے کے کرداروں میں میوزک ماسٹر سائمن،گڑھوال فقیرا اور تین بھائیوں کی ایک بیوی جل دھرا۔ڈالن والا، میں قرۃ العین حیدر نے جن پسماندہ کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کو پیش کیا ہے اس سے تخلیق کار کی ہمدردی واضح دکھائی دیتی ہے۔''یاد کی ایک دھنک جلے'' پسمادہ طبقے کی زندگی پر لکھا گیا کامیاب افسانہ ہے۔پسماندہ طبقے کی آیا' گریسی' اس افسانے کا اہم کردار ہے جو معمولی ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر ایک جذباتی پہلو بھی رکھتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے کردار کی زندگی،اور اس کے مسائل کو بڑی باریک بنی سے پیش کیا ہے۔افسانہ وقت کے ساتھ جب آگے بڑھتا ہے تو گریسی کی زندگی میں کئی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔سماجی سطح پر گریسی مختلف محاذ پر دیکھی جاتی ہے اور ہر محاذ پر گریسی کی پسماندہ زندگی اور مسائل کی پیش کش میں تخلیق کار کی اعلیٰ فن کاری دیکھی جاسکتی ہے۔افسانہ' کارمن' بھی پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی پر لکھا گیا اہم افسانہ ہے۔اس افسانے کا پس منظر بیرون ملک کا وہ علاقہ ہے جسے وہاں کے لوگ تحقیر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔افسانے کا مرکز اسی علاقے کے پسماندہ کردار ہیں۔کارمن،روزا،ایمیلیا اور مگدیلینیا پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتی ہیں افسانہ نگار نے ان کی زندگی اور روزمرہ حالات کو تخلیقی اہمیت دی ہے۔

''روشنی کی رفتار'' قرۃ العین حیدر کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔'حسب نسب' آزادی سے قبل زمیندارانہ نظام کے زوال پر لکھا گیا افسانہ ہے۔زمینداری کے خاتمے کے بعد ان گھرانے کے لوگوں کی زندگی میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں اور کن صورت حال سے یہ لوگ گزرے؟ قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں اسی صورت حال کی تصویر کو حقیقت کے آئینے میں پیش کیا ہے۔'چھمّی بیگم' کی زندگی اس زوال کی عمدہ مثال ہے۔اس کے علاوہ زمیندار خاندان میں ملازم طبقے کی زندگی جو پرورش پا رہی تھی اس کا اندازہ بھی افسانے کے مطالعے سے ہوتا ہے۔پسماندہ طبقے کرداروں میں سلامت بوا،ملّن خان، دھمّو خان اور کلّو بائی طوائف ہے جن کی زندگی اور مسائل افسانے کے سماجی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔اگلا افسانہ'نظارہ درمیاں ہے' اس

افسانے کا پس منظر بمبئی میں وقت کی ستم ظریفی میں ایک متوسط طبقہ کا کردار اپنی ماضی و حال میں پیچیدہ زندگی گزارتا نظر آتا ہے۔ خورشید عالم اور پیرو جاہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن حالت کی ستم ظریفی کے سبب خورشید عالم کی شادی الماس بیگم سے ہو جاتی ہے، خورشید عالم کی یہ نئی زندگی اعلیٰ طبقے کی مرہون منت ہے جس کا احسان وہ زندگی بھر زبان بند کر کے ادا کرتا ہے۔ خورشید عالم اور پیرو جاہ بظاہر تو الگ ہو جاتے ہیں لیکن پیرو جاہ تارابائی کے ذریعے الماس بیگم کے گھر اور خورشید عالم کے سامنے موجود رہتی ہے۔ افسانے کا سب اہم اور تادیر اثر رکھنے والا کردار دستور پیرو جاہ کا ہے، افسانے کا یہ کردار پسماندہ طبقے کے غریب گھرانے تعلق رکھتا ہے۔

پسماندہ طبقے کی زندگی اور ان کے مسائل پر لکھا گیا اہم افسانہ 'فقیروں کی پہاڑی' ہے۔ تخلیق کار نے بے روزگاروں کی نفسیاتی زندگی اور بدلتے ہوئے ذہنی فکر کو اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ کردار اپنے کھوئے ہوئے وجود کے ساتھ سرکار کی اقتصادی اور معاشی نظام پر طنز ہے۔ تلاشِ معاش میں یہ کردار فقیروں کی پہاڑی پر پہنچ جاتا ہے جہاں مختلف اور متعدد فقیروں کی مصنوعی مسائل کا محاسبہ دیکھتا ہے اور آخر میں یہ اسی مصنوعی زندگی میں شامل ہو کر فقیروں کے طبقے کا بہت بڑا بھکاری بن جاتا ہے۔ تخلیق کار نے دراصل ان پسماندہ طبقے کے کرداروں کے ذریعے سماجی اور سیاسی نظام پر سوال کیا ہے۔ کہ کیسے ایک شخص ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے بھیک مانگنا اپنا پیشہ بنا لیتا ہے۔ ''اکثر اس طرح سے بھی رقص فغاں ہوتا ہے'' مذکورہ افسانے کی طرح اس افسانہ کا محور بھی حالات اور قسمت کی ستم ظریفی ہے۔ جمال آرا اور بندو خان کی زندگی کا حصہ بھی بھیک مانگتے ہوئے دکھایا گیا ہے لیکن 'فقیروں کی پہاڑی' میں بے روزگاری کا مسئلہ ہے جبکہ اس افسانے میں حالات نے بھیک مانگنے پر مجبور کیا ہے۔ دونوں افسانے میں پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی، ان کی نفسیات اور ذہنی کیفیت کا ہیجانی مسئلہ تخلیق کار کی تخلیقی کاوش کا نتیجہ ہے۔ ان کرداروں کے مسائل کو تخلیق کار نے بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے، سارے منظر آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اس مجموعے کا زیرِ تحقیق آخری افسانہ ''کہرے کے پیچھے'' کے نام سے ہے۔ افسانے کا پس منظر ملک اور بیرون ملک دونوں ہے۔ گھروں میں ملازمت کرنے والے پسماندہ طبقہ کے نمائندہ کردار فضل مسیح اور آیا

کٹّو ہے، جن کی زندگی کے نشیب وفراز افسانے کا مرکز ہے۔ یہ کردار اپنی زندگی کو اپنے مالک کا مرہون منت سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کٹّو کی بیٹی پر اس کی ماں سے زیادہ مس سیلیا رچمنڈ کا حق ہے اور وہی اس کی زندگی کا فیصلہ بھی کرتی ہے۔تخلیق کار نے ان کرداروں کی زندگی کو سماجی اصول کا پابند دکھایا ہے۔

''قندیل چیں'' قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا آخری مجموعہ جسے ڈاکٹر جمیل اختر نے ترتیب دی ہے۔اس میں کل ۲۱ افسانے شامل ہیں۔قندیل چین،مختلف رسائل میں بکھرے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانہ''شربت والی گلی'' قدیم وجدید فلمی دنیا کے موضوع پر لکھا گیا اہم افسانہ ہے۔تخلیق کار نے جدید دنیا کی الٹرا فیشن فلمی سوسائٹی کے ساتھ قدیم دور کی فلمی دنیا کے حالات کا موازنہ پیش کیا ہے کہ کس طرح جدید صورت حال نے انسانی اقدار اور طبقاتی تفریق کے پیمانے کو بدل دیا۔جدید فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والا افراد اعلیٰ سوسائٹی کا عزت دار فرد ہے جبکہ ماضی میں فلمی دنیا کی ہیروئن ڈولی جیکب کا کردار سماج میں حاشیہ کا تھا اور وہ پسماندہ طبقے کے نیچ سوسائٹی کا حصہ بھی۔دونوں زمانۂ حال کی پوری تصویر افسانے کا موضوع ہے۔''تار پر چلنے والی'' یہ افسانہ سرکس اور اس میں کام کرنے والے لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل پر مبنی ہے۔اس میں مختلف مما لک کے ماہر کرتب باز ایک ساتھ بین الاقوامی برادری کی طرح رہتے ہیں۔افسانے کا پس منظر سرکس والوں کی ذہنی اور فکری احساس کو سمیٹے ہوئے ہے جس کی تخلیق میں افسانہ نگار نے گہرے مشاہدہ کا ثبوت دیا ہے۔سرکس کی محدود دنیا میں مادام تمارا، اولگا اور مس لار پسماندہ حالات اور طبقاتی نظام کی شکار نظر آتی ہیں۔مصنفہ نے ان کرداروں کی تخلیق میں جہاں ان کی مفلسی اور فاقہ کش زندگی کی حقیقت بیانی کی ہے وہیں ان کرداروں کے ذریعے قاری کے دل میں ہمدردی اور احساس بھی پیدا کیا ہے۔سوسائٹی اپنے ماضی وہ حال میں تبدیلی لاتی ہے لیکن ان کرداروں کی دنیا محدود ہے اور یہ سب اسی محدود دنیا میں اپنی پسماندہ زندگی گزار رہے ہیں۔ان کے حالات میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی بلکہ یہ حالات کی کسمپرسی کے سبب ذہنی امراض میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

''سنگھاردان'' موضوع کے اعتبار سے قرۃ العین حیدر کا منفرد افسانہ ہے۔یہ افسانہ پسماندہ طبقے کی طوائف خاندان کی زندگی پر مبنی ہے۔زمرد پری،لکھنو کی مشہور طوائف ہے جس کا قیام لندن میں ہے۔

زمیندارانہ نظام کے خاتمے کے بعد طوائف طبقے کے پسماندہ خاندان کی زندگی معاشی بدحالی کا شکار ہو جاتی ہے۔اس افسانے میں طوائف طبقے کے مسائل کو سماجی نظام کا ایک حصہ بنا کر پیش کیا ہے کیونکہ طوائف کو سماج کے پسماندہ طبقے میں شمار کیا جاتا ہے جس سے معاشرہ نفرت کرتا ہے۔اس مجموعے کا اگلا افسانہ''ایک پرانی کہانی'' کے عنوان سے ہے۔قرۃ العین حیدر کے اس افسانے کا موضوع غریبی اور بھوک مری کے زیر اثر انسان کے پسماندہ حالات ہیں۔معاشی پسماندگی اور پیٹ کی بھوک کے آگے انسان ہر فعل کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ وہ بھیک مانگنا بھی قبول کر لیتا ہے۔

مجموعی طور پر قرۃ العین حیدر کے افسانوں کو دیکھا جائے تو ان کے یہاں موضوعات کا تنوع بہت زیادہ ہے۔کرداروں کا ایک جمِ غفیر نظر آتا ہے جو چاروں طرف آتے جاتے نظر آتے ہیں۔افسانے کے یہ کردار اپنے حالات اور مسائل کے ذریعے اس عہد کی سماجی،معاشی،معاشرتی،تہذیبی اور طبقاتی سطح پر بہترین نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔اس باب میں قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا مطالعہ ان کے افسانوں کے پسماندہ کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کے مختلف پہلوؤں سے کیا گیا ہے جو سماجی،طبقاتی،معاشرتی ،معاشی اور ذاتی سطح پر کمزور اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔اس موضوع پر کام کرتے ہوئے بنیادی ماخذ سے زیادہ سروکار رکھا گیا ہے جبکہ ثانوی ماخذ سے کم مدد ملی ہے۔کیوں کہ قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا نقاد افسانہ نگار کی موضوعاتی تفہیم سے کم سروکار رکھتا ہوا نظر آتا ہے جبکہ ان کی تکنیک،اسٹائل،زبان اور اسلوب پر زیادہ بات کرتا ہے۔بہر کیف قرۃ العین حیدر کے مذکورہ تمام افسانوں کے پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی ان کے مسائل کا جائزہ متن کے حوالے سے لیا گیا ہے جو قرۃ العین حیدر کے افسانوی تفہیم اور معنوی جہت میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔

باب سوم کا عنوان''قرۃ العین حیدر کے ناولٹ میں پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل کا تجزیاتی مطالعہ'' ہے۔اس باب میں قرۃ العین حیدر کے ناولٹوں میں پسماندہ طبقے کا سماج اور پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی کے مسائل کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ناولٹ''چائے کے باغ''میں مصنفہ نے دو مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگی کی نقاب کشائی کی ہے۔ایک طرف نو دولتیہ طبقہ ہے جو ہر صورت عیش

وعشرت کا جام لیے ہوئے ہے اور پسماندہ طبقے کے غریب مزدوروں کا ہمہ وقت استحصال کرتا ہوا نظر آتا ہے۔اس طبقاتی تقسیم میں جو غریب اور مزدور طبقہ وہ مشرقی پاکستان اور آسام کی سرحد پر اپنے بنیادی ذریعے معاش چائے کے باغوں میں مزدوری کر کے پیٹ پالتا ہے۔مزدور طبقے کے کرداروں میں رام نندن، گلجر یا، پاربتی ،ترلوچن ،سکھ نندن ،بس میتا اور رام کرن ہے ۔ناولٹ کے پسماندہ کرداروں کو تخلیق کار نے گہرے مشاہدے سے تخلیق کیا ہے۔کرداروں کے زندگی کی ایک ایک جزئیات ،ان کی نفسیات اور ذہنی کیفیت کا اظہار مصنفہ کا پسماندہ طبقے سے گہری واقفیت اور عمیق تجربے کا پتا دیتی ہے۔راقم نے زیر تحقیق یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ناقدین ادب نے قرۃ العین حیدر پر جو اعلیٰ طبقے کی ترجمانی کا لیبل لگایا ہے یہ مقالہ اس لیبل کو توڑتا ہے۔اسی طرح ان کا ایک اور ناولٹ ''اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو'' کے نام سے ہے جو اقتصادی اور سماجی لحاظ سے عورت کے استحصال کی کہانی بیان کرتا ہے ۔ یہ ناولٹ کردار نگاری کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس ناولٹ میں قرۃ العین حیدر نے جن کرداروں کو پیش کیا ہے وہ پسماندہ طبقے کے کردار ہیں۔ یہ ناولٹ پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک بدنصیب کنبے کی کہانی ہے جن میں رشک قمر، ہرمزی خالہ، جمّن خان، جمیلن اور ساتھ میں رہنے والا کانٹرے بھانڈ رہتا ہے۔ناولٹ کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تخلیق کار نے پسماندہ کرداروں کے اندر احساس وجذبات کا اتنا دکھ درد بھر دیا ہے کہ ان کی داستانِ حیات پڑھ کر دل دہل سا جاتا ہے۔ دراصل ناولٹ کی یہ خوبی فن کار کی تخلیقی خوبی کا باعث ہے جو کردار نگاری کے اعتبار سے پڑھنے کے لائق ہے۔

موضوعِ بحث قرۃ العین کا ناولٹ ''دلربا'' کے عنوان سے ہے۔ناولٹ کا موضوع ہندوستانی شوبز کی دنیا ہے۔اب تک اس ناولٹ کا مطالعہ اعلیٰ طبقے کی جاگیردانہ نظام کے خاتمے کے حوالے سے ہوتا رہا ہے لیکن زیر تحقیقی مطالعہ ان ڈیرہ دار طوائفوں کی زندگی پر مبنی ہے۔ناولٹ میں شہر لکھنؤ کے اس معاشرے کو پیش کیا ہے جو وقت کے ساتھ تیزی سے بدل رہا ہے۔دراصل یہ صرف لکھنؤ کا پس منظر نہیں ہے بلکہ پورے ملک کا منظر نامہ ہے۔آزادی سے قبل پسماندہ طبقے کی ڈیرہ دار طوائف گلنار بائی کی سماج میں سوائے سامانِ تفریح کے کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن آزادی کے بعد جدید زمانے نے ترقی کے ایسے منازل طے کیے کہ گلنار بائی فلم پروڈیوسر

بن کر اعلیٰ طبقے کی سوسائٹی میں شمار ہو جاتی ہے۔ دراصل ناولٹ کا اصل موضوع بدلتے وقت کے ساتھ بدلتے سماجی نظام کا ہے بدلنے والا سماج جدید دور سے تعبیر کیا جانے لگا۔ جدید دور میں فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والا فرد سماج کا پسماندہ طبقہ نہیں بلکہ نئے سماج کا اعلیٰ اور عزت دار طبقہ ہے۔ گلنار، گلزار بائی اور دلربا کو اسی ناولٹ میں سوسائٹی قبول نہیں کرتی لیکن جدید ترقی نے اب ان کی زندگی کو شرفا کے لیے لائق تقلید بنا دیا ہے۔ حالات کی تبدیلی ناولٹ کا موضوع ضرور ہے لیکن کردار نگاری میں قرۃ العین حیدر نے طوائفوں کی زندگی کے مسائل، سماجی حالات اور ان کے احساس کو نہایت فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ راقم نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ ناولٹ اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کے عروج و زوال کی بہترین نمائندہ ہے جس میں دونوں طبقے کی زندگی کے مسائل کو حقیقت پسندانہ پیرائے میں پیش کیا ہے جو ناولٹ کی جان بن گئی ہے۔

اس باب کا آخری ناولٹ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' ہے جس کا پس منظر تقسیم سے قبل ہندوستان اور بعد میں پاکستان ہے۔ اس ناولٹ میں تخلیق کار نے دیہات کے کسانوں کی زندگی اور ان کے صورتِ حال کو موضوع بنایا ہے اور ساتھ ہی پاکستان کی اقتصادی فضا بھی پیش کی ہے۔ تقسیم کے بعد مشترکہ تہذیب و ثقافت کے مٹنے کے ساتھ نئی تہذیب و ثقافت کے زیر اثر نئے مسائل سامنے آتے ہیں۔ ناولٹ میں جدید سوسائٹی اور نئے اقدار سے پیدا ہونے والے سیاسی، سماجی، معاشی اور متعدد قسم کے مسائل بصورت علامت موجود ہے۔ اس ناولٹ میں ہم نے دیکھا کہ تخلیق کار نے پلاٹ اور کرداروں سے زیادہ ماحول اور فضا سے جنم لینے والے برے نتائج کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ پسماندہ طبقے کے کرداروں میں شبیر وا، دوارکا پرساد اور مدار بخش، کلکٹر صاحب کے یہاں خاص ملازم ہیں۔ اس کے علاوہ جھینگا باسی وہ کردار ہے جو مظہر صاحب کے کھیتوں اور باغوں میں کام کرتا ہے۔ دیہات میں رہنے والے پسماندہ طبقے کے کردار جو کھیتوں اور باغوں میں کام کر کے اپنی معاشی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اس ناولٹ میں کسان، کھیت، مزدور اور دیہات کے علاوہ منظور النساء کی بیٹی کے جشن میں دیہات کے سماجی ماحولیات کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ بیٹی کی جشن ولادت میں ڈومنی اور بھانڈ ناچتے اور جشن مناتے نظر آتے ہیں یہ منظر ہندوستان کے دیہات کا منظر ہے جس میں اعلیٰ اور پسماندہ دونوں طبقے کے لوگ تفریق کے باوجود ایک ساتھ زندگی گزارتے نظر آتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو قرۃ العین حیدر کے ناولٹوں کا ایک بڑا حصہ پسماندہ طبقے کے طوائفوں، خانگیوں اور سماج کے نچلے طبقے کی زندگی اور ان کے مسائل پر مبنی ہے۔ یہ لوگ سماجی غیر مساوات کا بری طرح سے شکار ہیں۔غریبی، بھوک، معاشی تنگی اور خوشگوار مستقبل کے خواہشات کی تکمیل کے لیے خود کو بیچ ڈالنے پر مجبور ہیں۔شخصیت کا انتشار، جنسی خواہشات سے جنم لیتا ہے اور پھر جب، یہ خواہشات نا آسودہ رہ جاتی ہیں تو انسان ان کا مداوا کرنے کے لیے نئے نئے حربے استعمال کرتا ہے۔مذکورہ ناولٹ کے کردار بھی اس کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔مصنفہ نے ان کرداروں کو حقیقت کا روپ اس طرح دیا ہے کہ ان میں طبقاتی اور سماجی تفریق بھی نظر آتا ہے اور تہذیبی عمل داری بھی۔'چائے کے باغ'، 'ہاؤسنگ سوسائٹی'، 'دلربا' اور 'اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو' یہ چاروں ناولٹ ایسے ہیں جو نہ صرف ناولٹ نگاری کے فن پر پورا اترتے ہیں بلکہ اس کے کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل مصنفہ کے عمیق مطالعہ اور مشاہدے کا بہترین نمونہ ہے۔ناولٹ کے کرداروں کو اس کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اس طرح اجاگر کرتی ہیں کہ جس سے انسانی زندگی کا ایک مکمل ڈھانچہ سامنے آجاتا ہے۔

باب چہارم ''قرۃ العین حیدر کے ناول میں پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل: ایک تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔اپنے عہد سے متاثر ہونا اور عصرِ آگہی رکھنا ادیب کے لیے ضروری ہے۔ہر ناول نگار نے اپنے اپنے دائرہ کار میں اپنے اردگرد ماحول میں پھیلے ہوئے طبقات کو پیش کر کے اپنے طبقاتی شعور کا اظہار کیا ہے۔قرۃ العین حیدر نے بھی اپنے ناولوں میں پسماندہ طبقے کے طبقاتی کشمکش کو پیش کیا ہے۔پسماندہ طبقے کے پیش کش میں قرۃ العین حیدر کا انداز مختلف نظر آتا ہے۔یہ درست ہے کہ قرۃ العین حیدر اپنی تحریروں میں اعلیٰ طبقے کی بڑائی ثابت کرتی نظر آتی ہیں۔اگر ان کی تحریروں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کے یہاں پسماندہ طبقہ بھی موجود ہے۔اس باب میں قرۃ العین حیدر کے ناولوں پر جو مفکرین ادب نے اعلیٰ طبقے کا لیبل لگایا ہے اس رائے سے قطع نظر ان کے ناولوں کا مطالعہ پسماندہ طبقے کے کرداروں کے حوالے سے کیا گیا ہے۔قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں میں شہروں کے مظلوم، مفلس، غریب اور سماجی سطح پر جو نچلے طبقے کی زندگی گزار رہے ہیں ان لوگوں کے مسائل کو پیش کیا ہے۔

ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کا پس منظر ہندوستان کی آزادی سے قبل سماج کے طبقاتی افراتفری کا ہے۔ناول کا ایک حصہ مارکسی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے جس میں خورشید عالم کا کردار اہم ہے،خورشید عالم مزدور طبقے کا نمائندہ کردار ہے۔مارکسی نظریات اور تحریک کے زیراثر سماج کا پسماندہ طبقہ اوپر کی طرف آرہا ہے جسے اعلیٰ طبقہ قبول نہیں کر رہا۔قرۃ العین نے اعلیٰ اور متوسط طبقہ کی خامیوں اور کمیوں پر بہت طنز کیا ہے۔اس ناول میں مصنفہ نے عملاً کسی پسماندہ کردار کو پیش نہیں کیا ہے لیکن پسماندہ طبقے کا سماج اور انسانی زندگی کے متعلق تخلیق کار کی ہمدردی واضح طور پر سامنے آتی ہے۔اس ناول میں نچلا طبقہ اعلیٰ طبقے کے ملازمین کی حیثیت سے متعارف ہوا ہے وہ صرف وفادار انسان کے طور پر سامنے آتا ہے۔اس کی سائیکی،اس کی ضرورت اور کردار کی خصوصیات کا کوئی تجزیہ پیش نہیں کیا گیا ہے۔یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ ''میرے بھی صنم خانے'' میں اعلیٰ اور متوسط طبقے دکھائی تو دیتے ہیں مگر نچلے طبقے کا گزر نہیں ہے۔جو کسی بھی سماج اور تہذیب کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔ناول کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں اعلیٰ اور متوسط طبقے کے لوگ اور ان کے مسائل دکھائی تو دیتے ہیں مگر نچلا طبقہ سوائے وفادار ملازم کے کچھ دیگر نظر نہیں آتے۔دراصل ناول جس دور کی تہذیب اور سماج کی عکاسی کرتا ہے اس دور میں ہندوستان کا اعلیٰ طبقہ،سماجی اور تہذیبی سطح پر بحران کا شکار تھا۔

''سفینۂ غم دل'' اس ناول میں لکھنو کی تہذیب، ماحول اور لوگوں کی بدلتی زندگی کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔جدید دور میں نوابین طبقہ اپنے قائم مقام سے نیچے آچکا ہے،صنعتی دور نے سب کو آگے بڑھنے کا موقع دیا۔پونم مہیشوری پسماندہ طبقے کا کردار ہے جو نچلے طبقے سے اوپر کے طبقے میں شامل ہوگیا ہے۔پونم وشاریہ، ناول کے کرداروں میں پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتا ہے،ہمیں اس کی دہری زندگی ناول کے صفحات پر نظر آتی ہے۔پونم وشاریہ،پسماندہ طبقے کے غریب ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے،اس کی پانچ بہنوں میں ایک کوٹی۔بی ہو چکی ہے،ایک بہن ریلوے ٹکٹ بیچنے والے کے ساتھ بھاگ گئی ہے،تیسری کو ہسٹریا ہوگیا ہے اور ماں کی زندگی گلی میں رہنے والے بھٹیارنوں کی سی ہے جو ساس اور محلے والوں کو گالیاں دیتی رہتی ہے۔یہ گھر معاشی طور پر پسماندہ حالات سے دوچار ہے قرۃ العین حیدر نے اس طبقے کی نفسیاتی زندگی،حالات اور معمولات کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ سماج کا ایک اور پسماندہ طبقہ تھیٹر میں کام کرنے والی مراثین کا

بھی ہے۔مصنفہ نے مارکسزم کے طبقاتی انقلاب اوراس کے متعلق خیالات کا واضح اظہار بھی کیا ہے۔نیز ناول میں پسماندہ طبقے سے ان کی ہمدردی کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

ناول ''آگ کا دریا'' کا کینوس بہت وسیع ہے۔ناول ڈھائی ہزار سالہ تہذیب وثقافت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ہندوستان کی سماجی تشکیل کے لیے ہر سو بکھری زندگی کا احاطہ کرنا لازمی تھا۔کیونکہ ہندوستان کی تاریخی روایت میں طبقاتی نظام قدیم زمانے سے رائج ہے۔رائج الوقت سے چلی آرہی اس روایت میں مکمل سماج کی تکمیل جبھی ہوسکتی تھی جب سماج کے سبھی طبقات کا احاطہ غیر جانبداری سے کیا جائے۔قرۃ العین حیدر نے اس کا احاطہ بڑی خوبی سے کیا ہے جوان کے عمیق مطالعے اور مشاہدے کی دین ہے۔

اس ناول کے ابتداء میں ہی ہندوستانی معاشرہ پانچ مختلف ذاتوں پر مشتمل دکھائی دیتا ہے۔جس میں کشتری، براہمن، ویش، شودر اور چنڈال ہیں۔یہ طبقہ اپنے اقدار و حالات کو لیے ہوئے ناول کے پس منظر میں ہر طرف دکھائی دیتا ہے۔مسلمانوں کی آمد کے بعد صورتِ حال میں تبدیلی ضرور نظر آتی ہے لیکن اقدار کے پیمانے میں طبقات کا مسئلہ اب بھی برقرار ہے۔قرۃ العین حیدر نے ناول میں ہندوستان کے گاؤں اور دیہات کی اس حقیقی دنیا کو پیش کیا ہے جو آج بھی وسیع وعریض علاقے تک پھیلے ہوئے ہیں۔دیہات کے پس منظر میں بھی طبقاتی تفریق نظر آتی ہے جہاں اچھوت اور نچلی ذاتی کے لوگ مختلف طرح کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔جولاہوں، کسانوں اور دوسرے پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی، اعلیٰ طبقہ اور شہری منصب داروں سے قدرے مختلف تھی۔پسماندہ طبقے کے غریب لوگوں کو مراتب اور منصب سے کوئی سروکار نہیں، وہ صرف اور صرف انسان پرست لوگ تھے اوران کا مقصد بھی انسانیت سے تھا۔پسماندہ طبقے کا کسان اپنے کھیت میں اور مزدور پیٹ کے لیے محنت ومشقت کرتا ہے۔اسے تاریخ اور واقعات سے کوئی لینا دینا نہیں۔کاشی کا اہیر، کمال الدین کو کھانا کھلاتے ہوئے کہتا ہے کہ ذات پات اور اونچ نیچ کے بھید بھاؤ میں کیا رکھا ہے۔دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ بھوک ہے، کسی بھوکے کو کھانا کھلانا کتنا سکون اور نیکی کا کام ہے۔قرۃ العین حیدر نے پسماندہ طبقے کے غریب اور مزدور لوگوں کی سادہ دلی اور انسان پرستی کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔گاؤں دیہات کے یہ غریب لوگ مفاد پرستی سے بالاتر نظر آتے ہیں۔

اس کے بعد بدلتے وقت کے تناظر میں مذہبی تفریق ،مسیحی کلچر جنہوں نے سب سے زیادہ پسماندہ طبقے کے نچلی ذاتی کے لوگوں کو پناہ دی اور مذہب قبول کرنے کے بعد معاشی امداد بھی عنایت کی۔اس کے بعد انگریزی حکومت میں آقا اور غلام کا معاملہ دکھائی دیتا ہے۔اس ضمن میں تہذیبی زوال کا اثر زیادہ دکھائی دیتا ہے۔خاص کر اعلیٰ طبقہ اپنا اثر رسوخ کھو کر بھیک مانگنے اور طوائف بننے پر مجبور دکھائی دیتا ہے۔اس کے بعد تقسیم کا مرحلہ آتا ہے اس دور میں مہاجرین طبقے کی پسماندہ زندگی ناول کا حصہ ہے اور آخر میں تقسیم بنگلہ دیش کے پسماندہ زندگی کا المیہ ناول میں موجود ہے جس کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔تخلیق کار نے ناول کے ہر دور میں پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''ناول آگ کا دریا'' میں قرۃ العین حیدر نے مختلف ادوار میں ہر طبقے کے افراد کی زندگی کو دکھایا ہے۔اعلیٰ طبقہ۔۔۔۔۔۔۔۔متوسط طبقہ۔۔۔۔۔۔۔نچلا طبقہ۔۔۔۔ انسانی تاریخ اسی طرح دائرے میں سفر کرتی ہے اور طبقات میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔یہاں اس ناول میں معاشرے کے سبھی طبقات کو قرۃ العین حیدر نے پیش کیا ہے۔

''آخرِ شب کے ہمسفر'' بنگال میں چلنے والی آزادی کی تحریک اس ناول کا موضوع ہے۔مارکسزم تحریک کے زیر اثر ہندوستان کی آزادی کے خواہش مند نوجوان اعلیٰ اور پسماندہ طبقہ کے طبقاتی فرق کو بھی مٹانے کی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔جس کی نمائندگی ریحان الدین اور دیپالی سرکار کر رہے ہیں۔اعلیٰ طبقے کے لیے پسماندہ طبقے کے دلوں میں بغاوت اور نفرت کی فضا کو جس طرح تخلیق کار نے پیش کیا ہے اس کا تجزیہ ناول کے متن اور کرداروں کے حوالے سے کیا گیا ہے۔اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کے متعدد کردار ناول میں ایسے ہیں جو تبدیلی کے باعث زندگی کی بڑی تبدیلی سے گزرتے ہیں ان کرداروں کے جذبات واحساسات اور تمام تر داخلی کیفیات کو تخلیق کار نے جس طرح نمایاں کیا ہے۔زیر تحقیق اس کا بھی تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ناول کے جن کرداروں کے ذریعے پلاٹ کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے ان میں اعلیٰ طبقے کے ساتھ پسماندہ طبقے کے ضمنی کردار بھی موجود ہیں۔جن میں آپا کلثوم ،لیلا ،عبدالغفور اور عیوصی جیسے

اہم کردار ہیں۔قرۃ العین حیدر نے ناول میں پسماندہ طبقے کے ان کرداروں کی سائکلو جی اور عملی زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی اپنی زندگی اپنے آقا کی مرہونِ منت ہے۔کلثوم بھی اپنے طرزِ عمل سے یہی ثابت کرتی ہے کہ وہ ایک بہترین اور اپنے پیشے سے ایمانداری رکھنے والی ملازمہ ہے۔

یہ ناول تقسیم ہند سے پہلے کے حالات تحریک آزادی اور بائیں بازو کی آزادی کی جارحانہ کوششوں سے شروع ہوتا ہے اور تقسیم کے بعد کے حالات اور تقسیم کے وقت کی نسل کی مضمحل روحوں کے المیے پر آکر ختم ہو جاتے ہیں۔ویسے تو یہ ناول صوبہ بنگال میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں اور رونما ہونے والے انقلاب کا احاطہ کرتا ہے اور یہی اس کا موضوع بھی ہے مگر اس ناول میں نچلا طبقہ جو اس دور میں واضح شکل اختیار کر چکا تھا اور اب ابھر کر پوری آب و تاب سے معاشرے میں اپنے وجود کو منوا رہا تھا اس کو بھی ناول میں نمایاں حیثیت حاصل ہے، تحقیق کے دوران ان سبھی امور کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ ناول امتدادِ زمانہ کی بنتی بگڑتی شکل کو سامنے لاتا ہے اور ان کے کردار کو واضح بھی کرتا ہے۔

''گردشِ رنگِ چمن'' کی کہانی پچھلی ڈیڑھ صدی کا احاطہ کرتی ہے۔ناول کے اہم کرداروں میں مہرو بیگم اور دل نواز بیگم کا کردار ہے، جو مغل شہزادیاں ہیں اور امتدادِ زمانہ نے انہیں پسماندہ طبقے کا طوائف بنا دیا ہے۔بیگم گل رخ بانو عرف نواب فاطمہ،شریف مسلمان کی بیٹی ہے جو باپ کی وفات کے بعد در بدر کی ٹھوکریں کھاتی ہے اور بالآخر وہ بھی پسماندہ طبقے میں شمار طوائف بننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ناول کے پسماندہ کرداروں میں سب سے پہلے دلنواز کا کردار سامنے آتا ہے جو اپنی بہن مہرو سے علیحدہ ہو کر چورن بیچنے والی جگن بوا کے روپ میں ملتا ہے۔دوسرا اہم کردار نواب فاطمہ کا ہے جو مرزا دلدار علی برلاس کی بیٹی ہے جس کے والدین دہلی میں پھیلنے والے ہیضے کی بیماری سے مر جاتے ہیں اور اس بچی کو پیش کار سبطِ حسن کے حوالے کر جاتے ہیں۔ سبطِ حسن، دلدار علی برلاس کے مرنے کے بعد اس کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیتا ہے اور تبادلے کا ڈھونگ رچا کر نواب فاطمہ کو دہلی کے ایک تاجر شیخ عبدالباسط کے حوالے کر کے غائب ہو جاتا ہے۔نواب فاطمہ دن رات گھر کی عورتوں کے آگے ذلیل ہوتی ہے پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ظالم اور پتھر دل عورتیں اس کی شادی گھر میں رہنے والے ایل ملازم پاگل ممدو سے کرنا چاہتی ہیں۔یہاں نواب بیگم کی زندگی میں ایک نیا موڑ آتا ہے

جب وہ چورن بیچنے والی مغل شہزادی دل نواز کے ساتھ اجمیر شریف کے مزار پر آجاتی ہے تاکہ شیخ عبدالباسط کے اہلِ گھرانہ کے شر سے بچ سکے، یہاں ایک بھاری بھرکم فقیر نواب فاطمہ کو گھورا کرتا تھا۔ دلنواز بھی اسی فقیر سے نواب فاطمہ کی شادی کرنا چاہتی تھی، جیسے ہی نواب بیگم کو ان کے اس ارادے کا پتا چلا وہ عرس کے دنوں میں اجمیر کی راحت بائی کے پیچھے چل پڑی۔ اب راحت بائی اس کی قسمت کی مالک تھی۔ اب نواب بیگم کے ساتھ وہی ہوا جو ایسی بدقسمت لڑکیوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے، اچھے گھرانوں کی خدا معلوم کتنی لڑکیاں اسی طرح پسماندہ طبقے کے طوائف طبقے کا حصہ بن جاتی ہیں۔

راحت بائی کا تعلق پسماندہ طبقے کے طوائف طبقے سے ہے، اودے پور میں راحت بائی نے پیشے کے اعتبار سے نواب بیگم کی تعلیم و تربیت مکمل کروائی۔ لاہور میں اس نے محفلِ موسیقی میں شرکت کی اس کے بعد دور دور سے اس کے لیے پیغام آنے لگے، وہ درباروں میں بلائے جانے لگی۔ نواب بیگم کی خوبصورتی اور ادا کے دیوانے مہاراجہ جے پور کے ٹھاکر مہیشور سنگھ نے اپنے پاس بلالیا، مہیشور سنگھ نے ناز نخرے اور مال و دولت کے علاوہ علیحدہ مکان بھی لے کر دیا۔ نواب بیگم کے کردار میں ناول کے پس منظر پر کہیں مستقل سکون میسر نہیں آتا، وہ اپنی پسماندہ زندگی میں تبدیلی حالات سے ہمہ وقت دوچار نظر آتی ہے، اس کی زندگی میں مختلف موڑ آتے ہیں۔ ایک مرتبہ کرنل ڈالٹن جو مغلیہ سلطنت کی تصویروں کا دلدادہ تھا وہ ایک دن نایاب مغل تصاویر دیکھنے کے لیے ٹھاکر مہیشور سے ملا، جس کے ساتھ بیلجئیم کا ایک فوٹو گرافر آندرے رینال تھا، تصویر بناتے ہوئے جب نواب فاطمہ سے آمنا سامنا ہوا تو اس نے نواب فاطمہ سے تعلقات قائم کر لیے، دوسری طرف مقروض مہیشور سنگھ کو اچانک موت نے گھیر لیا۔ نواب فاطمہ موقع پا کر کلکتہ بھاگ گئیں، آندرے رینال کو پہلے ہی بیگم فاطمہ نے خاصی دولت دے کاروبار کرنے کے لیے کلکتہ بھیجا تھا لیکن رینال سارے پیسے ریس میں ہار کر کلکتہ سے فرار ہو گیا تھا۔ نواب فاطمہ کی بیٹی عندلیب دراصل اسی بیلجئین فوٹو گرافر آندرے رینال کی اولاد تھی، اس کے بعد نواب فاطمہ کی زندگی میں دکھ ہی دکھ تھے لیکن عندلیب کی زندگی سنوارنا اس کا اولین مقصد تھا۔

عندلیب کی زندگی بھی مصائب سے عبارت تھی لیکن نواب فاطمہ کی نسبت عندلیب نے بہتر زندگی گزاری۔ بہتری کے باوجود وہ طوائف طبقے سے باہر نہ جا سکی اور آخر میں پسماندی طبقے کے طوائف پیشے کا

حصہ بن کر رہ جاتی ہے۔خان بہادر کا خطاب حاصل کرنے والے امبا پرشاد نے اس دور میں عندلیب کو ایک ہزار روپے عطا کیے۔ماسٹر مشکور حسین عندلیب کو پینٹنگ سکھانے آنے لگے۔ماسٹر مشکور حسین نے دولت کے لالچ میں عندلیب سے شادی کر لی چوں کہ وہ پہلے سے ہی شادی شدہ تھے اس لیے نہ بن سکی،طلاق ہوگئی۔اس کے بعد عندلیب اپنی ماں نواب فاطمہ کے پاس چلی گئی۔اس کی ماں ۱۹۴۵ء میں کینسر سے مر جاتی ہے،جس کے بعد عندلیب رقاصہ بن جاتی ہے۔ماں چونکہ آخری عمر میں زیادہ مذہبی ہوگئی تھی اس لیے ردِعمل کے طور پر عندلیب بے دین سی ہوگئی تھی۔عندلیب کی بیٹی عنبرین نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور کئی ممالک گھوم پھر لیے۔اب ڈاکٹر منصور کاشغری سے اس کی دوستی تھی۔اعلیٰ تعلیم اور ترقی یافتہ ہونے کے باوجود بھی عنبرین کا تعلق طوائف طبقے سے جڑا ہوا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی ماں عندلیب اور نانی نواب فاطمہ کی زندگیوں پر گہرا طنز کرتی تھی کیوں کہ اسے اپنے تشخص کا گہرا دکھ ہے۔وہ سوچتی ہے کہ آیا وہ امبا پرساد کی بیٹی ہے یا ماسٹر مشکور حسین کی۔پسماندہ طبقے کے پس منظر کو جس طرح تخلیق کار نے اس ناول میں پیش کیا ہے اس کے تمام پہلو اور پس منظر کو راقم نے زیرِ تحقیق واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

''چاندنی بیگم'' مصنفہ کا اہم ناول ہے۔کہانی کی ابتداء میں ہماری ملاقات فیوڈل طرزِ رہائش کے حامل خاندان سے ہوتی ہے جو زوال پذیر ہے۔اعلیٰ طبقے کے اس خاندان میں تین افراد بیرسٹر اظہر علی شیخ،ان کی بیوی بدر النساء،عرف بٹو باجی اور بیٹا قنبر علی ہیں۔پسماندہ طبقے کے شاگر پیشہ میں علاؤالدین موٹر ڈرائیور، رمضانی خانساماں،اپنے اہل وعیال کے ساتھ عید و خدمتگار،کوارٹر کے سرے پر ننھا دھوبی اور اس کے گھر والے رہتے ہیں۔بھگوان دین مالی اور پھٹکو چوکیدار باغ کے کاٹیج میں رہائش پذیر ہیں۔

علاقہ کا دوسرا خاندان راجہ انور حسین کا ہے جو سفید رنگ کے تین کٹوری ہاؤس میں قیام پذیر ہیں۔اعلیٰ طبقے کے اس خاندان میں راجہ انور حسین کے علاوہ ان کی بیوی رانی صولت زمانی،وکی میاں اور بوبی،بیٹیوں میں زرینہ سلطانہ،پروین سلطانہ اور صفیہ سلطانہ ہیں جب کہ پسماندہ طبقے کے ملازم پیشہ میں الا بچی خانم خوش قدم،بتاشن بوا،وزیرن،نوازن اور سونا کلی رہائش پذیر ہیں۔

ناول کے کرداروں میں بیرسٹر شیخ اظہر کا بیٹا قنبر علی جس کی سوچ اور فکر والد سے الگ ہے،وہ ترقی پسند

نظریات کا حامل ہے۔ قنبر علی اعلیٰ طبقے کے فیوڈل نظام کا پروردہ ہونے کے باوجود اپنے نظام کو پسند نہیں کرتا کیوں کہ وہ اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کے طبقاتی فرق کو مٹانا چاہتا تھا، وہ ایک غیر طبقاتی سماج کا خواب دیکھتا ہے۔ اس کی ماں بھی سوشل ورکر اور روشن خیال خاتون ہے جو ہر وقت حقوقِ نسواں کے لیے جدو جہد کرتی دکھائی دیتی ہے اور اپنی کوٹھی پر آنے والی پسماندہ طبقے کی غریب، مفلس اور مفلوک الحال خواتین کی مدد بھی کرتی نظر آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ناول میں ہندوستان کے زوال پذیر اعلیٰ طبقے کی زندگی، ان کا مخصوص کلچر اور مخصوص ماحول کے ساتھ پسماندہ طبقے کے مراثیوں، بھانڈوں، مغلانیوں اور اناؤں کی زندگی کے مختلف طبقاتی مسائل سے پردہ اٹھایا ہے۔ مصنفہ نے نچلے طبقے کے مراثیوں اور بھانڈوں کے کلچر پر خوب روشنی ڈالی ہے، ان کے کلچر کی روایات صدیوں سے چلی آرہی ہیں۔ یہ روایات نسل درنسل چلتی آرہی ہے۔ سامعین اور ماحول کے موافق وہ اپنی گفتگو کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن موجودہ دور میں یہ پسماندہ طبقہ بھی زوال پذیر ہے اور اپنی معاشی زندگی میں بے حال نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مفلسی مٹاؤ کے نعرے کی تہذیبی، معاشی اور معاشرتی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش بھی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ لوک گیتوں، برات اور جوگیوں کا ماتم، سوانگ کے طریقوں، بنجاروں کے نوحوں اور حبشیوں کے ماتم کی کیفیات کو عمدگی سے بیان کیا ہے۔ ماتم اور نوحوں کی فضا میں جس طرح کے جذبات اور احساسات موجود ہوتے ہیں وہ ساری کیفیات پوری شدت کے ساتھ جھلکتی نظر آتی ہے۔

اس ناول کے فضا میں اعلیٰ طبقہ اپنے زوال کے باوجود اسی طرح مگن ہے جس پر مصنفہ نے سخت طنز کیا ہے۔ وہیں پسماندہ طبقے سے تخلیق کار کی ہمدردی کا جذبہ ابھرتا نظر آتا ہے۔ ناول نگار نے چاندنی بیگم کے ذریعے پسماندہ کرداروں کی زندگی اور مسائل کو پیش کرتے ہوئے جس نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے راقم نے اس کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

''کارِ جہاں دراز ہے'' قرۃ العین حیدر کا سوانحی ناول ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ ناول صرف فیملی ساگا نہیں ہے بلکہ اس میں برعظیم کی بنتی بگڑتی صورتحال وقت کے آئینے میں شفاف دکھائی گئی ہے۔ برعظیم

ہمیشہ طبقات میں تقسیم رہا، آنے والے لوگوں نے مختلف نظام کے تحت ہندوستان میں طبقاتی نظام قائم کیے جس کا تعلق فاتح اور مفتوح، ادنیٰ واعلیٰ اور ذات پات کے نسلی امتیاز سے رہا ہے۔ کردار نگاری کے حوالے سے ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں کوئی فنی اور فکری جذبہ نہیں ملتا بلکہ تصویری طور پر ان کی زندگی دکھائی دیتی ہے۔

قرۃ العین حیدر ایک ہمہ جہت شخصیت تھیں جیسے جیسے ان کی تحریروں کو پڑھتے جائیں ویسے ویسے فکر وشعور کے نئے نئے در وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر لوگوں نے مصنفہ کے فکشن کا مطالعہ کرنے کے بعد انہیں اعلیٰ طبقے کی نمائندہ تخلیق کار کہا ہے۔ لیکن ان کی تخلیقات میں بہت سے دیگر پہلو بھی ہیں جن کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ افسوس اس امر کا ہے کہ ان کے فکشن کا مطالعہ ان کی زندگی کے پس منظر میں کیا گیا اور کردار نگاری کے حوالے ان کا دائرہ اعلیٰ طبقے کے کرداروں تک محدود قرار دیا۔ جبکہ ان کے یہاں پسماندہ طبقے کے کردار بھی موجود ہیں لیکن اس طرف توجہ کم دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کے حوالے سے کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ حالانکہ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات اتنی وسعت، بوقلمونی اور اتنے پھیلاؤ کی حامل ہے کہ عقل ششدر رہ جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اپنی خلاقانہ صلاحیت کی بدولت اپنے جینوئن رائٹر ہونے کا بھی ثبوت پیش کیا ہے کیونکہ انہوں نے باقی تمام چیزوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے نظریات اور اصولوں سے کبھی انحراف نہیں کیا تھا۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اس نابغۂ روزگار ہستی جس نے اپنی ساری زندگی ادب کی خدمت میں گزار دی ہو، ان کو زندگی میں جیسی پذیرائی ملنی چاہئے تھی وہ نہیں مل سکی اسی لیے انہوں نے اس ناقدری دنیا کو خیر باد کہنے میں عافیت سمجھی اور بالآخر ۲۱ر اگست ۲۰۰۷ء کی رات اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔

قرۃ العین حیدر نے اپنی اسی (۸۰) سالہ زندگی میں بے پناہ اور بہترین ادب تخلیق کیا ہے، اور انہوں نے فکشن کے میدان میں ایسے تابندہ نقوش ثبت کیے ہیں جو انہیں مدتوں مرنے نہیں دیں گے اور ادب سے محبت کرنے والے ان کے بہترین فکشن کی بدولت انہیں بھلا نہیں پائیں گے۔

☆☆☆

کتابیات

مصنف/مرتب	نام کتاب	مقامِ اشاعت	سالِ اشاعت
قرۃ العین حیدر	ستاروں سے آگے	ایجوکیشنل بک ہاوس دہلی	۲۰۱۷ء
قرۃ العین حیدر	شیشے کے گھر	ایجوکیشنل بک ہاوس دہلی	۲۰۱۰ء
قرۃ العین حیدر	پت جھڑ کی آواز	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۶۵ء
قرۃ العین حیدر	روشنی کی رفتار	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	۲۰۱۴ء
قرۃ العین حیدر (مرتب، ڈاکٹر جمیل اختر)	قندیل چین	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۰۰ء
قرۃ العین حیدر	چارناولٹ	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	۱۹۹۸ء
قرۃ العین حیدر	میرے بھی صنم خانے	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۹ء
قرۃ العین حیدر	سفینۂ غمِ دل	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۰۸ء
قرۃ العین حیدر	آگ کا دریا	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۸ء
قرۃ العین حیدر	آخرِ شب کے ہمسفر	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۱۰ء
قرۃ العین حیدر	گردشِ رنگِ چمن	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۸۸ء
قرۃ العین حیدر	چاندنی بیگم	ایجوکیشنل پبلسنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۹۰ء
قرۃ العین حیدر	کارِ جہاں دراز ہے	یونیورسل لیتھو پریس	۱۹۷۷ء
ابن کنول	اردو افسانہ	کتابی دنیا دہلی	۲۰۱۱ء
ارتضیٰ کریم، مرتب	قرۃ العین حیدر۔ ایک مطالعہ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۹۲ء

اسلم آزاد — قرۃ العین حیدر بحیثیت ناول نگار — سیمانت پرکاش، دہلی — ۲۰۰۴ء
اعجاز الرحمٰن — تانیثیت اور قرۃ العین حیدر کے نسوانی کردار — کلاسک آرٹ پریس، دہلی — ۲۰۱۰ء
امجد طفیل — قرۃ العین حیدر تشخص کی تلاش میں — بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ، لاہور — ۱۹۹۱ء
انوار الحق — چاندنی بیگم: ایک جائزہ — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی — ۲۰۰۷ء
خورشید انور — قرۃ العین حیدر کے ناول میں تاریخی شعور — انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی — ۱۹۹۳ء
درخشاں پروین — قرۃ العین حیدر کے چار ناولٹ کا تنقیدی جائزہ — جوہر آفسیٹ پرنٹرس، دہلی — ۲۰۱۶ء
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی — آج کا اردو ادب — قمر کتاب گھر کراچی — ۱۹۸۲ء
ڈاکٹر اختر سلطانہ — تحریروں کے آئینے میں — وی۔ایس۔گرفکس، حیدرآباد — ۲۰۰۵ء
ڈاکٹر جمیل اختر — انداز بیاں اور (قرۃ العین حیدر سے بات چیت) — فرید بک ڈپو، نئی دہلی — ۲۰۰۵ء
ڈاکٹر جمیل اختر — زندگی نامہ: قرۃ العین حیدر — NCPUL نئی دہلی — ۲۰۱۴ء
ڈاکٹر سہیل بیابانی — قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری — عفیف پرنٹرس، لال کنواں، دہلی — ۱۹۹۸ء
ڈاکٹر شکیل احمد — اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی — نصرت پبلی شرز، امین آباد، لکھنؤ — ۱۹۸۴ء
ڈاکٹر صاحب علی، مرتب — قرۃ العین حیدر شخصیت اور فن — شعبۂ اردو ممبئی — ۲۰۰۸ء
ڈاکٹر عامر سہیل، مرتب — قرۃ العین حیدر، خصوصی مطالعہ — بیکن بکس ملتان — ۲۰۰۳ء
ڈاکٹر عبدالمغنی — قرۃ العین حیدر کا فن — موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی — ۱۹۸۵ء
ڈاکٹر غلام محمد بنگلو — تھا کا راگیے اور قرۃ العین حیدر — موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی — ۲۰۰۳ء
ڈاکٹر مجیب احمد — قرۃ العین حیدر ذات وصفات — کاک آفسیٹ پرنٹرس۔ دہلی — ۲۰۰۸ء
ڈاکٹر محمد نسیم — اردو ناول پر تقسیم ہند کے اثرات — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی — ۲۰۱۲ء
ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی — اردو ناولٹ کا تحقیقی وتنقیدی تجزیہ — فیضی آرٹ پریس، گورکھپور — ۲۰۰۱ء
ڈاکٹر ارتضیٰ کریم — اردو فکشن تنقید — تخلیق کار پبلی شرز، دہلی — ۱۹۹۶ء
رضی عابدی — تین ناول نگار — لاہور پولی سنگ میل، پبلی کیشنز — ۱۹۹۴ء
سہیلی بخاری — اردو ناول نگاری — الحمراء پبلیشرز، دہلی — ۱۹۷۲ء
شافع قدوائی — فکشن مطالعات پس ساختیاتی تناظر — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی — ۲۰۱۰ء
شعور کی رو اور قرۃ العین حیدر — ہارون ایوب — اردو پبلشرز، لکھنؤ — ۱۹۷۸ء

شہنشاہ مرزا	قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری	نصرت پبلی شرز، لکھنؤ	۱۹۸۹ء
صغیر افراہیم	افسانوی ادب کی نئی قرأت	مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ	۲۰۱۱ء
طارق چھتاری	جدید افسانہ اردو ہندی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۹۲ء
عابد سہیل	فکشن کی تنقید: چند مباحث	پاریکھ آفسٹ پرنٹنگ پریس۔ لکھنؤ	۲۰۰۰ء
عبد المغنی	قرۃ العین حیدر کا فن	ماڈرن پبلشنگ ہاوس، نئی دہلی	۱۹۸۵ء
عقیلہ جاوید	اردو ناول میں تانیثیت	یوسف فرید پرنٹنگ پریس، لاہور	
فرمان فتح پوری	اردو افسانہ اور افسانہ نگاری	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۸۲ء
گوپی چند نارنگ	فکشن شعریات تشکیل وتنقید	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دیلی	۲۰۰۹ء
محی الدین بمبئی والا، مرتب	قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ	ماڈرن پبلشنگ ہاوس نئی دہلی	۱۹۹۹ء
وارث علوی	فکشن کی تنقید کا المیہ	سٹی پریس بک شاپ	۲۰۰۰ء
وقار عظیم	افسانہ نگاری	سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد	۱۹۳۵ء

☆☆☆

رسائل و جرائد

۱۔رسالہ ''نقوش لاہور'' (آپ بیتی نمبر) ۔جون ۱۹۶۴ء

۲۔رسالہ 'پگڈنڈی امرتسر' (یلدرم نمبر) جلد ۹ شمارہ ۵، ۱۹۶۲ء

۳۔ماہنامہ رسالہ، کتاب نما کا خصوصی شمارہ، قرۃ العین حیدر شخصیت اور فن، شمارہ نمبر ۹، جلد ۴۷، ستمبر ۲۰۰۷

۴۔سہ ماہی رسالہ، روشنائی، جلد ۹، شمارہ نمبر ۳۴، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸

۵۔سہ ماہی رسالہ نیا دور، خصوصی شمارہ، قرۃ العین حیدر نمبر، محکمہ اطلاعات و عامہ اتر پردیش، فروری تا مارچ ۲۰۰۹

۶۔قرۃ العین حیدر شخصیت فکر و فن، مقالات و روداد و سمینار، پٹنہ ۲۰۰۸

۷۔رسالہ '' آج کل'' قرۃ العین حیدر نمبر، جلد ۶۶، شمارہ ۴، نومبر ۲۰۰۷

۸۔رسالہ '' آج کل'' قرۃ العین حیدر نمبر، جلد نمبر ۴۹، شمارہ ۱، اگست ۱۹۹۰

۹۔رسالہ ''ایوان اردو'' قرۃ العین حیدر نمبر، جلد نمبر ۲۱، شمارہ ۹، جنوری ۲۰۰۸

۱۰۔رسالہ ''چہار سو'' خاص گوشہ، جلد نمبر ۱۴، شمارہ جولائی / اگست، ۲۰۰۵

۱۱۔رسالہ ''نیا دور'' قرۃ العین حیدر نمبر، جلد نمبر ۶۳، شمارہ ۱۱۔۱۲ فروری تا مارچ ۲۰۰۹

۱۲۔رسالہ ''نیا دور'' قرۃ العین حیدر نمبر، سالنامہ دسمبر ۲۰۰۷

☆☆☆

Qurratul Ain Hyder Ke Fiction Mein Pasmanda Tabqe Ke Kirdar Aur Unke Masail

ABSTRACT
THESIS

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

Urdu

By

Md. Sufiyan Ahmad

UNDER THE SUPERVISION OF

Prof. Mohd Tariq

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY,
ALIGARH, (INDIA) 2021

قرۃ العین حیدر کے فکشن میں
پسماندہ طبقے کے کرداراوران کے مسائل

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ .ڈی

مقالہ نگار

محمد سفیان احمد

نگراں

پروفیسر محمد طارق

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۲۱ء

حاصلِ مطالعہ

معاشرے میں کوئی بھی نظام ایک دن میں پروان نہیں چڑھتا۔اس کے پیچھے برس ہا برس کا وہ تاریخی عمل ہوتا ہے جو اسے متحرک رکھنے کے ساتھ ساتھ تغیر وتبدل بھی فراہم کرتا ہے۔دنیا کے کسی خطے کی بھی تاریخ اٹھا کر دیکھ لی جائے، وہاں معاشرہ ارتقائی مراحل طے کرتا دکھائی دیتا ہے۔کبھی کلیساؤں کے زیراثر عہدِ غلامی جس میں مذہبی پیشوا اعلیٰ طبقے پر مشتمل ہیں اور دیگران کے پیرو اور غلام نچلے طبقے پر مشتمل ہیں۔آقائی عہد میں معاشرہ آقا اور غلام میں منقسم ہے۔انسانی ترقی نے معاشرے کو بھی ترقی دی اور سرمایہ دارانہ نظام نے معاشرتی طبقاتی ساخت کو تبدیل کر دیا۔اب تک معاشرہ اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات میں تقسیم تھا اور صنعتی نظام کے تحت خودکار (اپنے ہاتھ سے کمانے والا، جو کسی کا غلام نہیں) انسان کی پیدائش نے معاشرے کو تین واضح طبقات میں تبدیل کیا۔جو اعلیٰ طبقہ،متوسط طبقہ اور نچلا طبقہ کہلائے۔

جہاں تک برعظیم کا تعلق ہے تو یہاں کا معاشرہ ذات پات میں تقسیم معاشرہ ہے۔ابتداء میں یہاں کے اصل باشندے دراوڑ بغیر کسی تخصیص و تقسیم کے غیر طبقاتی معاشرے میں رہ رہے تھے۔مگر جب بیرونی حملہ آور، آنا شروع ہوئے تو برعظیم کا معاشرہ مختلف ذاتوں میں تقسیم ہو گیا۔برعظیم کا معاشرہ سب سے پہلے اس وقت طبقات میں تقسیم ہوا جب آریا یہاں آئے۔انہوں نے آتے ہی یہاں کے اصل باشندوں کو اپنا غلام بنالیا اوران پر ظلم و جبر کا سلسلہ شروع کر دیا۔یہ آقا اور غلام، دو طبقات میں تقسیم معاشرہ تھا،یعنی آریاؤں کے ابتدائی دور میں دو طبقات تھے، فاتح (کھشتری) اور مفتوح داس۔

آریاؤں نے ان افراد کو بھی ذات سے باہر کر دیا تھا جو اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کی مخلوط نسل تھی۔ یعنی کسی غلام عورت کے بطن سے کسی اعلیٰ نسل کی اولاد ہے تو اس کا مقام بھی غلام کا ہی تھا۔ مذہبی رسومات سے بھی انہیں باہر رکھا گیا بلکہ مذہبی رسومات میں ان کی شمولیت کو ممنوع قرار دیا گیا۔ دراصل اس نظام قانون سے براہمن کے عمومی کردار پر روشنی پڑتی ہے، نیز براہمن ان کے جان و مال کے بھی مالک تھے۔ وہ جب چاہے انہیں ان کی جائیداد اور ان کی زندگی سے محروم کر سکتے تھے، جبکہ غلام کی حیثیت سے انہیں سر تسلیم خم کیا تھا۔

آنے والے وقت میں برعظیم میں آریائی تہذیب نے جب اپنے قدم جما لیے تو معاشرہ اعلیٰ و پسماندہ سے چار طبقات میں تقسیم ہو گیا۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر کچھ عرصے بعد برعظیم کے جنگلوں، صحراؤں اور ساحل سمندر پر رہنے والے آزاد لوگوں کو بھی اس نظام میں شامل کر لیا اور اس طبقاتی تقسیم میں ایک اور طبقے کا اضافہ ہوا جسے چنڈال کہا گیا۔ یہ برعظیم میں آریاؤں کے عروج کا دور تھا جس میں معاشرہ پانچ طبقات میں تقسیم تھا۔

آریاؤں کا تقسیمی نظام جو ذات پات پر مشتمل تھا اس نے ظلم و جبر کو فروغ دیا۔ نچلے طبقے کے پسماندہ ،شودر اور ویش کسمپرسی کے عالم میں زندگی گزارنے لگے۔ یہاں تک کہ گوتم بدھ نے ان کے لیے اس ظلم و جبر سے نجات کا راستہ تلاش کیا۔ گوتم بدھ کی تعلیمات نے فروغ پایا تو ہر طرح کی طبقاتی تقسیم کو باطل قرار دیا۔ ابتداء میں تو بدھ ازم کو بہت فروغ ملا مگر اعلیٰ طبقوں کے لیے یہ برداشت کرنا ناممکن تھا۔ بدھ کے نظریات اور تعلیمی فکر کے ساتھ اعلیٰ طبقے کے مسائل نے بہت کچھ بدل دیا جس کے بعد ہندومت کا دوبارہ احیاء شروع ہوا اس کا بانی شنکر اچاریہ تھا۔

بدلتے وقت کے دھارے میں بدھ بھکشوؤں نے خود بھی ہندوؤں کے جلسوں میں شامل ہونا شروع کر دیا تھا۔ غرضیکہ، یہ اب صرف نام کے بدھ بھکشو تھے اصلاً، ان میں براہمن پروہتوں کی خصلت پیدا ہو چکی تھی، اس ماحول میں، دیوتاؤں کے وجود سے منکر، گوتم بدھ کو، وشنو دیوتا کا نواں اوتار مانا جانے لگا جس سے بدھ مت کی انفرادیت جاتی رہی۔ یوں تو ہندومت نے بدھ بھکشوؤں کے تعاون سے گوتم بدھ کے پیغام کو سپرد خاک کر کے بدھ کا بت بنا کر پوجنا شروع کر دیا، اس طرح ہندومت کا نظام معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

ساتویں صدی عیسوی سے برعظیم میں مسلمانوں کے دور کی ابتداء ہوتی ہے۔مگر باقاعدہ اور مکمل اثر و رسوخ ظہیر الدین بابر کے عہد میں ملا جس نے مغلیہ عہدِ حکومت کی بنیاد رکھی اور اس کو مکمل عروج عہد اکبر میں ملا۔ایک طرف صوفیاء اکرام مساوات کا درس دے رہے تھے۔دوسری طرف مغلیہ حکومت کے سیاسی مقاصد تھے جن کے حصول کے لیے وہ عوام دوست کی حیثیت اختیار کیے رہے۔اس عہد میں اہلِ ہند کی بھگتی تحریک بھی چلتی رہی اور سکھوں کا وجود منظرِ شہود پر ظاہر ہوا۔اس کے علاوہ ہمایوں کے دور میں جو ایرانی برعظیم آئے، برعظیم میں تشعیت کو بھی ساتھ لائے۔ان حالات میں ملک میں ایک طرف فرقہ واری اور نسلی امتیازات پروان چڑھتے رہے اور دوسری طرف جاگیردارانہ نظام نے فروغ پایا اور معاشرے میں دو طبقات اعلیٰ اور پسماندہ طبقات وجود میں آئے۔وقت کے ساتھ ساتھ مغلیہ حکومت کمزور ہوتی گئی جس کا فائدہ انگریزوں نے اٹھایا۔

برعظیم میں آریاؤں یا مسلمانوں کی آمد نے حالات کو تبدیل کیا اور وہ مستقل طور پر یہاں آباد ہو گئے۔مگر انگریزوں نے برعظیم کو محض تجارتی منڈی تصور کیا اور اپنے دورِ حکومت میں یہاں کی بہت سی دولت اپنے ملک منتقل کی۔اٹھارہویں صدی تک مغرب کی جدید تہذیب اپنے تمام تر پہلو ظاہر کر چکی تھی۔جدید تعلیمی نظام کے ذریعے سیکولرزم، نیشنلزم، جمہوریت اور انسان دوستی جیسے تصورات برعظیم تک پہنچ چکے تھے۔ان تصورات کے ذریعے برطانوی سامراج کے استحصال پر پردہ ڈالے رکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی۔جدید تعلیمی نظام کے ذریعے جدید تعلیم یافتہ طبقہ وجود میں آیا۔

انگریزوں نے ایک طرف تعلیم کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کیے اور دوسری طرف صنعتی نظام کے قیام سے مفادات حاصل کیے۔صنعتی نظام کے فروغ نے مادیت کو پروان چڑھایا۔مادی قوت کا اضافہ ذاتی، طبقاتی اور قومی مفادات کو غالب صورت میں لے آتی ہے یہی برعظیم کے سماج میں ہوا اور معاشرہ مزید طبقات میں منقسم ہو گیا۔معاشرے میں ایک اور طبقہ، متوسط طبقہ پیدا ہوا۔ان تمام تبدیلیوں کا براہ راست اثر اس عہد کے ادب میں بھی نمایاں ہوا۔

قرۃ العین حیدر کی شروع سے لے کر آخر تک تقریباً تمام تحریروں میں طبقاتی تفریق کے اثرات جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔مصنفہ نے تمام تر طبقاتی پہلوؤں بالخصوص سماج کی اونچ نیچ کے طبقاتی مسائل سے خاصی

متاثر نظر آتی ہیں اس کی مثال ان کی وہ تخلیقات ہیں جو سماج کی طبقاتی تفریق کو نمایاں کرتی ہیں۔ان کے یہاں انسانی جذبوں اور رشتوں کی شکست وریخت اور سماجی آدرشوں اور تہذیبوں کے انہدام کے منظر نامے بحسن وخوبی موجد ہے،اس کے ساتھ ساتھ سماج کے بنائے طبقاتی تفریق کے اصولی نظام پر وسیع اور گہری نظر کا مشاہدہ بھی ملتا ہے۔قرۃ العین حیدر نے سماجی تاریخ کے الٹ پھیر اوراس کے عروج وزوال کی داستان اس طرح بیان کی ہے کہ ان کے یہاں ہمیں سماج کے طبقاتی نظام اوراس کے اصول و پیانے کی پوری تصویر دکھائی دیتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن اردو ادب میں اب تک ان کی تحریروں کا مطالعہ محدود دائرہ میں کیا گیا ہے،اورانہیں صرف اعلیٰ طبقے کا نمائندہ تخلیق کار کہا گیا ہے۔راقم نے قرۃ العین حیدر کے فکشن میں اعلیٰ طبقے کے بجائے پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کو پیش کیا ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان کی تحریروں میں پسماندہ طبقے کے کردار ضمنی یا عارضی طور پہ نظر نہیں آتے بلکہ پسماندہ طبقے کی ترجمانی میں ان کے مشاہدے اور عمیق تجربے کا علم واضح طور پر ہوتا ہے۔وہ پسماندہ طبقے کی زندگی سے اچھی طرح واقف تھیں،ان کے ساتھ سماج میں کس طرح کا رویہ اپنایا جاتا تھا اور سماج میں اونچ نیچ کے رویہ سے کس طرح اذیت محسوس کرتے تھے،ان کی تخلیقات میں اس کی تصویر پوری طرح سامنے آجاتی ہے۔اسی ضرورت کے پیش نظر راقم نے اپنے مقالے کا موضوع ''قرۃ العین حیدر کے فکشن میں پسماندہ طبقے کے کرداراوران کے مسائل'' منتخب کیا ہے۔جو درج ذیل پانچ حصوں پر مشتمل ہے:

باب اول:قرۃ العین حیدر کے حالاتِ زندگی اورادبی کارنامے:ایک جائزہ

باب دوم:قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کے کرداراوران کے مسائل کی عکاسی

باب سوم:قرۃ العین حیدر کے ناولٹ میں پسماندہ طبقے کے کرداراوران کے مسائل کا تجزیاتی مطالعہ

باب چہارم:قرۃ العین حیدر کے ناول میں پسماندہ طبقے کے کرداراوران کے مسائل:ایک تنقیدی جائزہ

اورآخر میں،حاصل مطالعہ

باب اول''قرۃ العین حیدر کے حالاتِ زندگی اورادبی کارنامے:ایک جائزہ'' کے عنوان سے ہے۔

اس باب میں قرۃ العین حیدر کی زندگی ،ابتدائی تعلیم ،تخلیقی محرکات اوران کا ادبی ماحول وغیرہ کے اہم پہلو کا احاطہ کیا گیا ہے ۔مصنفہ کے بے پناہ مطالعے اور مشاہدے اور غیر معمولی ادبی شخصیت کے پیچھے غیر معمولی مواقع اور غیر معمولی والدین کا عمل دخل کارفرما ہے اسی لیے تو مصنفہ نے کہا تھا کہ مجھے اپنے حالات رقم کرنے سے پہلے اپنے آباؤ اجداد کے احوال رقم کرنے پڑیں گے کیونکہ میں ان سے ہٹ کر کوئی انوکھی ہستی قطعاً نہیں ہوں ۔قرۃ العین حیدر نے اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ سادات خاندان پر ہمیشہ فخر کیا ہے ۔وہ اپنے ایک مشہور بزرگ سید کمال الدین ترمذی کا سلسلۂ نسب حضرت زین العابدین کے خاندان سے جوڑتی ہیں ۔سید کمال الدین ترمذی بارہویں صدی عیسوی میں ترکستان سے ہندوستان آئے اور قصبہ کیتھل میں قیام کیا،اس خاندان کو مغلیہ سلطنت کی جانب سے جاگیریں عطا تھیں ۔قرۃ العین حیدر کے والد سجاد حیدر یلدرم اتر پردیش کے ضلع بجنور کے ایک قصبہ نہٹور میں رہتے تھے،ان کے دادا میر احمد علی نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کیا اور بغاوت کے جرم میں پھانسی کی سزا سنائی گئی ۔ان کی جان بخشی ان کے بھائی سید بندے علی نے کروائی جو کہ انگریز حکومت کے وفادار تھے ۔قرۃ العین حیدر کے دادا سید جلال الدین حیدر نے ۱۸۵۷ء کے بعد بہت برے حالات سے اپنی زندگی کی شروعات کی اور حسن کارکردگی کی بدولت خان بہادر کا خطاب حاصل کیا ۔سجاد حیدر یلدرم ،سید جلال الدین حیدر کے بیٹے تھے ۔سجاد حیدر یلدرم اپنے دور کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال انسان تھے، جنہیں شروع ہی سے ترکی زبان سے خاصی دلچسپی تھی ۔انہوں نے بہت سے اعلیٰ عہدوں پر کام کیا اور اس طرح انہیں سیاحت کا خوب موقع ملا ۔۱۹۱۲ء میں نذر الباقر کی بیٹی نذر زہرا سے سجاد حیدر یلدرم کی شادی ہوگئی ۔قرۃ العین حیدر کے ماں باپ دونوں بہت لبرل ،روشن خیال اور ترقی پسند ذہن والے شخص تھے ۔ان کا گھرانوں میں مشرقی ماحول ہونے کے باوجود مغربی ماحول کے اثرات نمایاں تھے اسی لیے قرۃ العین حیدر کو ماں اور باپ دونوں کی طرف سے جو ماحول ملا اس کے واضح اثرات ان کی تحریروں میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔

قرۃ العین حیدر نے اردو افسانوی ادب کو جدید فکر وفن ،تاریخ وتہذیب اور سماج ومعاشرے کی عکاسی میں منفرد کرداروں کے ذریعے اردو ادب کو مالا مال کر دیا ۔مصنفہ کی پیدائش چونکہ ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو قدیم وجدید کی آمیزش اور مشرق ومغرب کا حسین سنگم تھا ۔یہ قدامت پرستی ،جدت پسندی اور بیک وقت

مشرق ومغرب کے اثرات دراصل سماج ومعاشرے کے بدلتے حالات کی وہ سچائیاں ہیں جوان کے خاندان اور ماحول کا خاصہ رہی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے تخلیقی ادب نے روحِ عصر کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیبی ترجمانی کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے۔اس لیے ان کے یہاں ہمیں گہرے مشاہدے اور زندگی کے متنوع تجربے نظر آتے ہیں۔ مصنفہ نے آنکھ کھولتے ہی اودھ کے مخصوص ماحول کو دیکھا کہ اور یہ دیکھا کہ پرانی دہلی جو تہذیب کی نمائندہ تھی آخری سانسیں لے رہی تھی اور نئی دہلی پیدا ہو رہی تھی،اسی دور میں تعلقہ داروں کا لکھنؤ خاص اہمیت کا حامل تھا اور یہ تعلقہ دار لکھنوی تہذیب وثقافت اور زبان وبیان کے ترجمان تھے اور یہی سارا ماحول ہمیں قرۃ العین حیدر کے یہاں جابجا نظر آتا ہے۔

برعظیم کی تہذیبی وراثت،سماج ومعاشرت اور اس کی یگانگت قرۃ العین حیدر کو بہت عزیز تھی۔مشترکہ تہذیبی ورثے کی تباہی اور سماج میں افراد کا تفریقی نظام کے تحت پسماندہ مسائل کا شدید دکھ ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔برعظیم کے تہذیب ومعاشرت کے ساتھ ان کا جذباتی،ذہنی اور نظریاتی لگاؤ تھا اسی لیے تقسیم ہند کے المناک حادثے کو انہوں نے کسی صورت قبول نہیں کیا۔ان کے لیے تقسیم ہند اور اپنے محبوب باپ کی وفات دو ایسے محرکات اور سانحات تھے جن کا کرب اور دکھ وہ تمام عمر بھلا نہ پائیں بلکہ ان کی بیشتر تحریریں انہی سانحات کے زیر اثر لکھی گئی ہیں۔تقسیم ہند سے جہاں ایک طرف انہیں ذہنی اور جسمانی جلاوطنی کا شکار ہونا پڑا وہاں انہیں ایک لازوال تہذیبی ورثے کی تباہی کا بھی شدید دکھ ہوا اسی لیے وہ ہمیشہ اپنے تشخص اور جڑوں کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتی ہیں کیونکہ ملک کی تقسیم اور ہجرت کے المیوں سے ہماری جذباتی،ثقافتی اور روحانی بنیادیں متزلزل ہوئیں،ویسے تو مصنفہ تقسیم ہند کے بعد اپنی والدہ کے ساتھ پاکستان چلی گئی تھیں جہاں انہوں نے متعدد ملازمتیں بھی کیں اور مختلف اعزازات سے بھی نوازا گیا لیکن تقریباً چودہ پندرہ سال بعد وہ دوبارہ ہندوستان چلی آئیں۔

قرۃ العین حیدر اپنے عہد کی ایک روشن خیال اور خوبصورت خاتون تھیں حتیٰ کہ عمر کے آخری حصے میں بھی جاذبِ نظر،پروقار،بارعب اور پرکشش تھیں۔تمکنت اور طنطنہ ان کا انداز ہ تھا۔بے شمار سہولیات کے

باوجود ساری زندگی شادی نہیں کی۔ان کی شادی نہ کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ سامنے نہیں آسکی۔خدا معلوم وہ ان جکڑ بندیوں اور پابندیوں سے بہت گھبراتی تھیں یا انہیں اپنے باپ جیسا کوئی آئیڈیل شخص نہیں مل سکا یا شاید وہ ان پابندیوں کو ادب کے درمیان رکاوٹ سمجھتی تھیں، وجہ کوئی بھی ہو یہ بات تو ممکن ہے کہ اگر شادی کر لیتیں تو شاید اتنی عظیم ادیبہ بن کر اتنا بڑا ادب تخلیق نہ کر پاتیں۔

قرۃ العین حیدر بیسویں صدی کی وہ عظیم ادیبہ تھیں کہ پچاس کی دہائی ہی سے جن کا ادبی حلقوں پر ایسا رعب و دبدبہ قائم ہو گیا تھا کہ ان کے مخالفین اور ان کے تخیل کی بلندیوں تک نہ پہنچ سکنے والے، کوشش کے باوجود ان کے ادبی مقام کو ذرہ برابر بھی کم نہ کر سکے کیونکہ ان کے فن میں اعلیٰ تخیل کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور وہ اس تخیل کی بدولت بہت اونچا اڑتی تھیں، اس پرواز میں بعض اوقات ایسی منزلیں بھی آجاتی ہیں کہ ان کے ساتھ اڑنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ ان کا تہذیبی اور تاریخی شعور جو سماج میں حالات کے زیر اثر افراد کی داخلی اور ظاہری مسائل کی پیش کش میں ان کا فکری کینوس بہت وسیع، جامع اور واضح تھا اسی لیے انہوں نے اپنے حلقۂ ادب میں وسیع و بلیغ دنیائے فن کو تخلیق کیا، ان کی ذات میں انسانی ہمدردی بدرجۂ اتم موجود تھی اسی لیے ان کے یہاں ہمیں سماج کے بکھرے ہوئے انسانی زندگی کا درد دکھائی دیتا ہے اور برعظیم کی تاریخ کا وہ باب نظر آتا ہے جسے ہم نیچ یا پسماندہ طبقے کے غیر اہم کردار سمجھتے ہیں۔

جب بھی ہم کسی ادیب کے فنی وفکری ارتقا کا جائزہ لیتے ہیں تو اس طرح ہم اس کے نقطۂ نظر تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ کیا اس کے فنی وفکری سفر میں ارتقا کا عمل جاری ہے اس ارتقا میں کہاں کہاں اہم موڑ دکھائی دیتے ہیں؟ معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور سماج میں افراد کی زندگی کے مسائل کے متعلق ان کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ اس طرح ہم مصنف کے بنیادی نظریے کے قریب پہنچ جاتے ہیں جس سے فن کار کی شخصیت اور اس کی تخلیقات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بالکل اسی طرح جب ہم قرۃ العین حیدر کے فن اور شخصیت کو ان کی تخلیقات کی روشنی میں پرکھتے ہیں تو ان کے نظریات، ان کا حیات وادب کے متعلق فکر وفلسفہ اور تصوراتِ زندگی واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی فکشن میں زبان وبیان کا جدید رجحان نظر آتا ہے۔ان کے یہاں روایتی زبان کے

ساتھ جدید زبان کی آمیزش کی کوشش بھی واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ روایتی کلاسیکیت کے ساتھ ساتھ جدید سماج اور معاشرتی اقدار کی واضح بازگشت ان کے یہاں نمایاں ہے، اسی حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے فکشن میں سماج کے بدلتے حالات میں افراد کی زندگی اور اس کی مختلف النوع مسائل کی عکاسی نظر آتی ہے۔قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کا محاکمہ یہاں مختصر اور جامع انداز میں پیش کیا جارہا ہے۔تخلیقات کے اعتبار سے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ستاروں سے آگے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔اس مجموعے کے افسانوں کی دنیا بہت محدود ہے۔بچپن، نوجوانی، خواب وخیالات اور خواہشات سے بھری دنیا رومانی پہلو سے بھری ہوئی ہے۔ اس مجموعے کے بیشتر کردار مسرت کی تلاش اور خوف وتحیر کا جذبہ ہمیشہ لیے نظر آتے ہیں۔

باب دوم ''قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کردار اوران کے مسائل کی عکاسی'' کے عنوان سے ہے جس میں قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا مطالعہ پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی اوران کے مسائل کے حوالے سے کیا گیا ہے۔قرۃ العین حیدر کے افسانوں کی منظر نگاری اور کردار نگاری دیکھی جائے تو کردار نگاری اور منظر نگاری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔فنی وفکری نقطۂ نظر سے مصنفہ کے مذکورہ افسانوی مجموعے میں خواب وخواہشات کے پنپنے کا مسلسل عمل کارفرما ہے۔ پہلا افسانوی مجموعہ ابتدائی تحریروں میں شمار ہوتا ہے۔دانشوران ادب نے قرۃ العین حیدر کی تحریروں کو موضوعاتی اعتبار سے محدود دائرہ حد کی تخلیق سے تعبیر کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کا دائرہ اعلیٰ طبقے تک ہی محدود ہے لیکن زیر تحقیق راقم نے اس مجموعے کے ان افسانوں کا تجزیہ پیش کیا ہے جس میں اعلیٰ طبقے کے ساتھ پسماندہ طبقے کے کردار بھی موجود ہیں اوران کی زندگی اور مسائل کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔''پرواز کے بعد'' اس افسانے میں اعظم مسعود، جمال انور، آفتاب اور جمال انور کی والدہ جیسے اعلیٰ طبقے کے کرداروں کے ساتھ میگڈ یلین ڈی کوڈ را عرف مگ اور کارل جیسے پسماندہ طبقے کے کردار بھی ہیں۔جن کی زندگی اور مسائل کو قرۃ العین حیدر نے بڑی فن کاری کے ساتھ افسانے کا موضوع بنایا ہے۔اسی طرح ''ٹوٹتے تارے'' کے کردار رخشندہ عرف شی شی اور کمل پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والے کردار ہیں جو حالات اور سماج کے طبقاتی وتفریقی نظام کے زیر اثر ہیجانی کیفیت میں زندگی گزار رہے ہیں۔''رقص شرر'' کا کردار سلیما مارینا جو دوسری جنگ عظیم کے ماحولیاتی اور جنگی بحران کا شکار

ہے۔سلیما برلن سے ہندوستان آنے کے بعد اپنی معاشی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے نائٹ کلب میں بال روم ڈانسر کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔زیرِ تحقیق 'ستاروں سے آگے' میں شامل آخری افسانہ ''یہ باتیں'' کے عنوان سے ہے۔اس افسانے کا موضوع بہت ہی اہم ہے ۔تخلیق کار نے ان بے روزگار نوجوانوں کی زندگیوں کو موضوع بنایا ہے جو معاش کی تلاش میں ہمہ وقت سرگرداں رہتے ہیں ۔دراصل تخلیق کار نے افسانے میں دو پہلو پیش کیے ہیں ایک وہ جو معاشی صورت حال سے خوشحال اور ایک وہ جو معاشی صورت حال سے پریشان۔پسماندہ طبقے کے کردار کی نفسیات کو قرۃ العین حیدر نے بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے کردار کے مسائل آفاقی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

دوسرا افسانوی مجموعہ ''شیشے کے گھر'' کے عنوان سے ہے۔اس مجموعے کے تمام افسانوں پر تقسیم ہند سے قبل اور بعد کے حالات نظر آتے ہیں۔افسانہ ''برف باری سے پہلے'' تخلیق کار کا اہم افسانہ ہے جس میں ہندوستان کی سماجی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کو دیکھا جا سکتا ہے۔لیکن پورے افسانے پر تقسیم کا المیہ سایہ کی طرح منڈلاتا ہوا قاری کو اپنے سحر میں لے لیتا ہے۔افسانے میں ہندوستان کی سماج کی تصویر کشی جاندار ہے۔ تقسیم کے المیے نے اعلیٰ اور پسماندہ دونوں طبقے کی زندگی کو متاثر کیا، معاشی طور پر غریب پسماندہ طبقے کے کرداروں میں اصغر ربانی، ارنا کرسینا اور سگرڈ ربانی ہیں۔دوسری طرف معاشی طور پر خوشحال ماڈرن کرداروں میں نشاط اسٹینلے، روبی کھوچڑ اور انوری خان ہیں، دراصل تخلیق کار نے سماجی سطح پر ان کی عیش وعشرت زدہ زندگی کی وجہ سے انہیں گری پڑی نظروں سے دیکھا جاتا ہے گویا یہ سماج کے لیے مخرب الاخلاق کردار ہیں اس لیے سماجی اعتبار سے ان کرداروں کو اعلیٰ طبقے کے لوگ گری ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔'جلاوطن' اردو کے سر فہرست افسانوں میں سے ایک ہے۔یہ افسانہ انسانی اقدار کی شکست و ریخت اور تہذیبی زوال پر لکھا گیا کامیاب افسانہ ہے۔'جلاوطن' ہر طبقے کا المیاتی اظہار ہے جو تقسیم کے درداندوہ حالات سے دوچار ہوا۔پسماندہ طبقے کے کرداروں میں رام رکھی، ممولہ ڈومنی اور وہ سارے کہار جو ایک ایک ودو پیسے کے لیے اپنے کاندھوں پر لوگوں کو اٹھائے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔افسانے کا ایک حصہ اس طبقے کی زندگی اور مسائل کی عکاسی کرتا ہے جسے مصنفہ نے بڑی فن کاری سے افسانے میں جگہ دی ہے۔

قرۃ العین حیدر کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''پت جھڑ کی آواز'' کے نام سے ہے۔اس کا پہلا افسانہ ''ڈالن والا'' ہے۔جس کا پس منظر دہرہ دون میں آباد'ڈالن والا' انڈین اور انگلوانڈین لوگوں کی بستی ہے جس میں مختلف اور متعدد طبقے کے لوگ موجود ہیں۔پسماندہ طبقے کے کرداروں میں میوزک ماسٹر سائمن،گڑھوال فقیرا اور تین بھائیوں کی ایک بیوی جل دھرا۔ڈالن والا، میں قرۃ العین حیدر نے جن پسماندہ کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کو پیش کیا ہے اس سے تخلیق کار کی ہمدردی واضح دکھائی دیتی ہے۔''یاد کی ایک دھنک جلے'' پسمادہ طبقے کی زندگی پر لکھا گیا کامیاب افسانہ ہے۔پسماندہ طبقے کی آیا'گریسی'اس افسانے کا اہم کردار ہے جو معمولی ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر ایک جذباتی پہلو بھی رکھتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے کردار کی زندگی،اوراس کے مسائل کو بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے۔افسانہ وقت کے ساتھ جب آگے بڑھتا ہے تو گریسی کی زندگی میں کئی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔سماجی سطح پر گریسی مختلف محاذ پر دیکھی جاتی ہے اور ہر محاذ پر گریسی کی پسماندہ زندگی اور مسائل کی پیش کش میں تخلیق کار کی اعلیٰ فن کاری دیکھی جاسکتی ہے۔افسانہ' کارمن' بھی پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی پر لکھا گیا اہم افسانہ ہے۔اس افسانے کا پس منظر بیرون ملک کا وہ علاقہ ہے جسے وہاں کے لوگ تحقیر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔افسانے کا مرکز اسی علاقے کے پسماندہ کردار ہیں۔کارمن،روزا،ایمیلیا اور مگدیلینیا پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتی ہیں افسانہ نگار نے ان کی زندگی اور روزمرہ حالات کو تخلیقی اہمیت دی ہے۔

''روشنی کی رفتار'' قرۃ العین حیدر کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے ۔'حسب نسب' آزادی سے قبل زمیندارانہ نظام کے زوال پر لکھا گیا افسانہ ہے۔زمینداری کے خاتمے کے بعد ان گھرانے کے لوگوں کی زندگی میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں اور کن صورت حال سے یہ لوگ گزرے؟ قرۃ العین حیدر نے اس افسانے میں اسی صورت حال کی تصویر کو حقیقت کے آئینے میں پیش کیا ہے۔'چھمّی بیگم'،کی زندگی اس زوال کی عمدہ مثال ہے۔اس کے علاوہ زمیندار خاندان میں ملازم طبقے کی زندگی جو پرورش پا رہی تھی اس کا اندازہ بھی افسانے کے مطالعے سے ہوتا ہے۔پسماندہ طبقے کرداروں میں سلامت بوا،ملّن خان، دھمّو خان اور کلّو بائی طوائف ہے جن کی زندگی اور مسائل افسانے کے سماجی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔اگلا افسانہ'نظارہ درمیاں ہے'اس

افسانے کا پس منظر بمبئی میں وقت کی ستم ظریفی میں ایک متوسط طبقہ کا کردار اپنی ماضی وحال میں پیچیدہ زندگی گزارتا نظر آتا ہے۔خورشید عالم اور پیرو جاہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن حالت کی ستم ظریفی کے سبب خورشید عالم کی شادی الماس بیگم سے ہو جاتی ہے،خورشید عالم کی یہ نئی زندگی اعلیٰ طبقے کی مرہون منت ہے جس کا احسان وہ زندگی بھر زبان بند کر کے ادا کرتا ہے۔خورشید عالم اور پیرو جاہ بظاہر تو الگ ہو جاتے ہیں لیکن پیرو جاہ تارابائی کے ذریعے الماس بیگم کے گھر اور خورشید عالم کے سامنے موجود رہتی ہے۔افسانے کا سب اہم اور تادیر اثر رکھنے والا کردار دستور پیرو جاہ کا ہے،افسانے کا یہ کردار پسماندہ طبقے کے غریب گھرانے تعلق رکھتا ہے۔

پسماندہ طبقے کی زندگی اور ان کے مسائل پر لکھا گیا اہم افسانہ 'فقیروں کی پہاڑی' ہے۔تخلیق کار نے بے روزگاروں کی نفسیاتی زندگی اور بدلتے ہوئے ذہنی فکر کو اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ کردار اپنے کھوئے ہوئے وجود کے ساتھ سرکار کی اقتصادی اور معاشی نظام پر طنز ہے۔تلاشِ معاش میں یہ کردار فقیروں کی پہاڑی پر پہنچ جاتا ہے جہاں مختلف اور متعدد فقیروں کی مصنوعی مسائل کا محاسبہ دیکھتا ہے اور آخر میں یہ اسی مصنوعی زندگی میں شامل ہو کر فقیروں کے طبقے کا بہت بڑا بھکاری بن جاتا ہے۔تخلیق کار نے دراصل ان پسماندہ طبقے کے کرداروں کے ذریعے سماجی اور سیاسی نظام پر سوال کیا ہے۔کہ کیسے ایک شخص ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے بھیک مانگنا اپنا پیشہ بنالیتا ہے۔''اکثر اس طرح سے بھی رقص فغاں ہوتا ہے'' مذکورہ افسانے کی طرح اس افسانہ کا محور بھی حالات اور قسمت کی ستم ظریفی ہے۔جمال آرا اور بندو خان کی زندگی کا حصہ بھی بھیک مانگتے ہوئے دکھایا گیا ہے لیکن 'فقیروں کی پہاڑی' میں بے روزگاری کا مسئلہ ہے جبکہ اس افسانے میں حالات نے بھیک مانگنے پر مجبور کیا ہے۔دونوں افسانے میں پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی،ان کی نفسیات اور ذہنی کیفیت کا ہیجانی مسئلہ تخلیق کار کی تخلیقی کاوش کا نتیجہ ہے۔ان کرداروں کے مسائل کو تخلیق کار نے بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے،سارے منظر آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اس مجموعے کا زیر تحقیق آخری افسانہ ''کہرے کے پیچھے'' کے نام سے ہے۔افسانے کا پس منظر ملک اور بیرون ملک دونوں ہے۔گھروں میں ملازمت کرنے والے پسماندہ طبقہ کے نمائندہ کردار فضل مسیح اور آیا

کٹو ہے، جن کی زندگی کے نشیب وفراز افسانے کا مرکز ہے۔ یہ کردار اپنی زندگی کو اپنے مالک کا مرہون منت سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کٹو کی بیٹی پر اس کی ماں سے زیادہ مس سیلیا رچمنڈ کا حق ہے اور وہی اس کی زندگی کا فیصلہ بھی کرتی ہے۔ تخلیق کار نے ان کرداروں کی زندگی کو سماجی اصول کا پابند دکھایا ہے۔

''قندیل چیں''، قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا آخری مجموعہ جسے ڈاکٹر جمیل اختر نے ترتیب دی ہے۔ اس میں کل ۱۲۱ افسانے شامل ہیں۔ قندیل چین، مختلف رسائل میں بکھرے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانہ ''شربت والی گلی''، قدیم وجدید فلمی دنیا کے موضوع پر لکھا گیا اہم افسانہ ہے۔ تخلیق کار نے جدید دنیا کی الٹرا فیشن فلمی سوسائٹی کے ساتھ قدیم دور کی فلمی دنیا کے حالات کا موازنہ پیش کیا ہے کہ کس طرح جدید صورت حال نے انسانی اقدار اور طبقاتی تفریق کے پیمانے کو بدل دیا۔ جدید فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والا افراد اعلیٰ سوسائٹی کا عزت دار فرد ہے جبکہ ماضی میں فلمی دنیا کی ہیروئن ڈولی جیکب کا کردار سماج میں حاشیہ کا تھا اور وہ پسماندہ طبقے کے نیچ سوسائٹی کا حصہ بھی۔ دونوں زمانۂ حال کی پوری تصویر افسانے کا موضوع ہے۔ ''تار پر چلنے والی'' یہ افسانہ سرکس اور اس میں کام کرنے والے لوگوں کی زندگی اور ان کے مسائل پر مبنی ہے۔ اس میں مختلف مما لک کے ماہر کرتب باز ایک ساتھ بین الاقوامی برادری کی طرح رہتے ہیں۔ افسانے کا پس منظر سرکس والوں کی ذہنی اور فکری احساس کو سمیٹے ہوئے ہے جس کی تخلیق میں افسانہ نگار نے گہرے مشاہدہ کا ثبوت دیا ہے۔ سرکس کی محدود دنیا میں مادام تمارا، اولگا اور مس لار پسماندہ حالات اور طبقاتی نظام کی شکار نظر آتی ہیں۔ مصنفہ نے ان کرداروں کی تخلیق میں جہاں ان کی مفلسی اور فاقہ کش زندگی کی حقیقت بیانی کی ہے وہیں ان کرداروں کے ذریعے قاری کے دل میں ہمدردی اور احساس بھی پیدا کیا ہے۔ سوسائٹی اپنے ماضی وہ حال میں تبدیلی لاتی ہے لیکن ان کرداروں کی دنیا محدود ہے اور یہ سب اسی محدود دنیا میں اپنی پسماندہ زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے حالات میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی بلکہ یہ حالات کی کسمپرسی کے سبب ذہنی امراض میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

''سنگھاردان''، موضوع کے اعتبار سے قرۃ العین حیدر کا منفرد افسانہ ہے۔ یہ افسانہ پسماندہ طبقے کی طوائف خاندان کی زندگی پر مبنی ہے۔ زمرد پری، لکھنو کی مشہور طوائف ہے جس کا قیام لندن میں ہے۔

زمیندارانہ نظام کے خاتمے کے بعد طوائف طبقے کے پسماندہ خاندان کی زندگی معاشی بدحالی کا شکار ہو جاتی ہے۔اس افسانے میں طوائف طبقے کے مسائل کو سماجی نظام کا ایک حصہ بنا کر پیش کیا ہے کیونکہ طوائف کو سماج کے پسماندہ طبقے میں شمار کیا جاتا ہے جس سے معاشرہ نفرت کرتا ہے۔اس مجموعے کا اگلا افسانہ ''ایک پرانی کہانی'' کے عنوان سے ہے۔قرۃ العین حیدر کے اس افسانے کا موضوع غریبی اور بھوک مری کے زیر اثر انسان کے پسماندہ حالات ہیں۔معاشی پسماندگی اور پیٹ کی بھوک کے آگے انسان ہر فعل کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ وہ بھیک مانگنا بھی قبول کر لیتا ہے۔

مجموعی طور پر قرۃ العین حیدر کے افسانوں کو دیکھا جائے تو ان کے یہاں موضوعات کا تنوع بہت زیادہ ہے۔کرداروں کا ایک جمِ غفیر نظر آتا ہے جو چاروں طرف آتے جاتے نظر آتے ہیں۔افسانے کے یہ کردار اپنے حالات اور مسائل کے ذریعے اس عہد کی سماجی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور طبقاتی سطح پر بہترین نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔اس باب میں قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا مطالعہ ان کے افسانوں کے پسماندہ کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کے مختلف پہلوؤں سے کیا گیا ہے جو سماجی، طبقاتی، معاشرتی، معاشی اور ذاتی سطح پر کمزور اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔اس موضوع پر کام کرتے ہوئے بنیادی ماخذ سے زیادہ سروکار رکھا گیا ہے جبکہ ثانوی ماخذ سے کم مدد ملی ہے۔کیوں کہ قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا نقاد افسانہ نگار کی موضوعاتی تفہیم سے کم سروکار رکھتا ہوا نظر آتا ہے جبکہ ان کی تکنیک، اسٹائل، زبان اور اسلوب پر زیادہ بات کرتا ہے۔بہر کیف قرۃ العین حیدر کے مذکورہ تمام افسانوں کے پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی ان کے مسائل کا جائزہ متن کے حوالے سے لیا گیا ہے جو قرۃ العین حیدر کے افسانوی تفہیم اور معنوی جہت میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔

باب سوم کا عنوان ''قرۃ العین حیدر کے ناولٹ میں پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل کا تجزیاتی مطالعہ'' ہے۔اس باب میں قرۃ العین حیدر کے ناولٹوں میں پسماندہ طبقے کا سماج اور پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی کے مسائل کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ناولٹ ''چائے کے باغ'' میں مصنفہ نے دو مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگی کی نقاب کشائی کی ہے۔ایک طرف نودولتیہ طبقہ ہے جو ہر صورت عیش

وعشرت کا جام لیے ہوئے ہے اور پسماندہ طبقے کے غریب مزدوروں کا ہمہ وقت استحصال کرتا ہوا نظر آتا ہے۔اس طبقاتی تقسیم میں جو غریب اور مزدور طبقہ وہ مشرقی پاکستان اور آسام کی سرحد پر اپنے بنیادی ذریعے معاش چائے کے باغوں میں مزدوری کرکے پیٹ پالتا ہے۔مزدور طبقے کے کرداروں میں رام نندن، گلجریا، پاربتی ،ترلوچن،سکھ نندن،بس میتا اور رام کرن ہے۔ناولٹ کے پسماندہ کرداروں کو تخلیق کار نے گہرے مشاہدے سے تخلیق کیا ہے۔کرداروں کے زندگی کی ایک ایک جزئیات ،ان کی نفسیات اور ذہنی کیفیت کا اظہار مصنفہ کا پسماندہ طبقے سے گہری واقفیت اور عمیق تجربے کا پتا دیتی ہے۔راقم نے زیر تحقیق یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ناقدین ادب نے قرۃ العین حیدر پر جو اعلیٰ طبقے کی ترجمانی کا لیبل لگایا ہے یہ مقالہ اس لیبل کو توڑتا ہے۔اسی طرح ان کا ایک اور ناولٹ ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' کے نام سے ہے جو اقتصادی اور سماجی لحاظ سے عورت کے استحصال کی کہانی بیان کرتا ہے۔یہ ناولٹ کردار نگاری کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس ناولٹ میں قرۃ العین حیدر نے جن کرداروں کو پیش کیا ہے وہ پسماندہ طبقے کے کردار ہیں۔یہ ناولٹ پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک بدنصیب کنبے کی کہانی ہے جن میں رشک قمر، ہرمزی خالہ،جمّن خان، جمیلن اور ساتھ میں رہنے والا کانٹرے بھانڈ رہتا ہے۔ناولٹ کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تخلیق کار نے پسماندہ کرداروں کے اندر احساس و جذبات کا اتنا دکھ درد بھر دیا ہے کہ ان کی داستانِ حیات پڑھ کر دل دہل سا جاتا ہے۔دراصل ناولٹ کی یہ خوبی فن کار کی تخلیقی خوبی کا باعث ہے جو کردار نگاری کے اعتبار سے پڑھنے کے لائق ہے۔

موضوعِ بحث قرۃ العین کا ناولٹ ''دلربا'' کے عنوان سے ہے۔ناولٹ کا موضوع ہندوستانی شوبز کی دنیا ہے۔اب تک اس ناولٹ کا مطالعہ اعلیٰ طبقے کی جاگیردانہ نظام کے خاتمے کے حوالے سے ہوتا رہا ہے لیکن زیر تحقیقی مطالعہ ان ڈیرہ دار طوائفوں کی زندگی پر مبنی ہے۔ناولٹ میں شہر لکھنؤ کے اس معاشرے کو پیش کیا ہے جو وقت کے ساتھ تیزی سے بدل رہا ہے۔دراصل یہ صرف لکھنؤ کا پس منظر نہیں ہے بلکہ پورے ملک کا منظر نامہ ہے۔آزادی سے قبل پسماندہ طبقے کی ڈیرہ دار طوائف گلنار بائی کی سماج میں سوائے سامانِ تفریح کے کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن آزادی کے بعد جدید زمانے نے ترقی کے ایسے منازل طے کیے کہ گلنار بائی فلم پروڈیوسر

بن کر اعلیٰ طبقے کی سوسائٹی میں شمار ہو جاتی ہے۔ دراصل ناولٹ کا اصل موضوع بدلتے وقت کے ساتھ بدلتے سماجی نظام کا ہے بدلنے والا سماج جدید دور سے تعبیر کیا جانے لگا۔ جدید دور میں فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والا فرد سماج کا پسماندہ طبقہ نہیں بلکہ نئے سماج کا اعلیٰ اور عزت دار طبقہ ہے۔ گلنار، گلزار بائی اور دلربا کو اسی ناولٹ میں سوسائٹی قبول نہیں کرتی لیکن جدید ترقی نے اب ان کی زندگی کو شرفا کے لیے لائق تقلید بنا دیا ہے۔ حالات کی تبدیلی ناولٹ کا موضوع ضرور ہے لیکن کردار نگاری میں قرۃ العین حیدر نے طوائفوں کی زندگی کے مسائل، سماجی حالات اور ان کے احساس کو نہایت فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ راقم نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ ناولٹ اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کے عروج و زوال کی بہترین نمائندہ ہے جس میں دونوں طبقے کی زندگی کے مسائل کو حقیقت پسندانہ پیرائے میں پیش کیا ہے جو ناولٹ کی جان بن گئی ہے۔

اس باب کا آخری ناولٹ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' ہے جس کا پس منظر تقسیم سے قبل ہندوستان اور بعد میں پاکستان ہے۔ اس ناولٹ میں تخلیق کار نے دیہات کے کسانوں کی زندگی اور ان کے صورتِ حال کو موضوع بنایا ہے اور ساتھ ہی پاکستان کی اقتصادی فضا بھی پیش کی ہے۔ تقسیم کے بعد مشترکہ تہذیب و ثقافت کے مٹنے کے ساتھ نئی تہذیب و ثقافت کے زیر اثر نئے مسائل سامنے آتے ہیں۔ ناولٹ میں جدید سوسائٹی اور نئے اقدار سے پیدا ہونے والے سیاسی، سماجی، معاشی اور متعدد قسم کے مسائل بصورت علامت موجود ہے۔ اس ناولٹ میں ہم نے دیکھا کہ تخلیق کار نے پلاٹ اور کرداروں سے زیادہ ماحول اور فضا سے جنم لینے والے برے نتائج کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ پسماندہ طبقے کے کرداروں میں شبیر وا، دوارکا پرساد اور مدار بخش، کلکٹر صاحب کے یہاں خاص ملازم ہیں۔ اس کے علاوہ جھینگا باسی وہ کردار ہے جو مظہر صاحب کے کھیتوں اور باغوں میں کام کرتا ہے۔ دیہات میں رہنے والے پسماندہ طبقے کے کردار جو کھیتوں اور باغوں میں کام کر کے اپنی معاشی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اس ناولٹ میں کسان، کھیت، مزدور اور دیہات کے علاوہ منظور النساء کی بیٹی کے جشن میں دیہات کے سماجی ماحولیات کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ بیٹی کی جشن ولادت میں ڈومنی اور بھانڈ ناچتے اور جشن مناتے نظر آتے ہیں یہ منظر ہندوستان کے دیہات کا منظر ہے جس میں اعلیٰ اور پسماندہ دونوں طبقے کے لوگ تفریق کے باوجود ایک ساتھ زندگی گزارتے نظر آتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو قرۃ العین حیدر کے ناولٹوں کا ایک بڑا حصہ پسماندہ طبقے کے طوائفوں، خانگیوں اور سماج کے نچلے طبقے کی زندگی اور ان کے مسائل پر مبنی ہے۔ یہ لوگ سماجی غیر مساوات کا بری طرح سے شکار ہیں۔غریبی، بھوک، معاشی تنگی اور خوشگوار مستقبل کے خواہشات کی تکمیل کے لیے خود کو بیچ ڈالنے پر مجبور ہیں۔شخصیت کا انتشار، جنسی خواہشات سے جنم لیتا ہے اور پھر جب، یہ خواہشات ناآسودہ رہ جاتی ہیں تو انسان ان کا مداوا کرنے کے لیے نئے نئے حربے استعمال کرتا ہے۔ مذکورہ ناولٹ کے کردار بھی اس کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ مصنفہ نے ان کرداروں کو حقیقت کا روپ اس طرح دیا ہے کہ ان میں طبقاتی اور سماجی تفریق بھی نظر آتا ہے اور تہذیبی عمل داری بھی۔ 'چائے کے باغ'، 'ہاؤسنگ سوسائٹی'، 'دلربا' اور 'اگلے جنم موہے بٹیانی کیجو' یہ چاروں ناولٹ ایسے ہیں جو نہ صرف ناولٹ نگاری کے فن پر پورا اترتے ہیں بلکہ اس کے کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل مصنفہ کے عمیق مطالعہ اور مشاہدے کا بہترین نمونہ ہے۔ ناولٹ کے کرداروں کو اس کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اس طرح اجاگر کرتی ہیں کہ جس سے انسانی زندگی کا ایک مکمل ڈھانچہ سامنے آجاتا ہے۔

باب چہارم ''قرۃ العین حیدر کے ناول میں پسماندہ طبقے کے کردار اور ان کے مسائل: ایک تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ اپنے عہد سے متاثر ہونا اور عصرِ آگہی رکھنا ادیب کے لیے ضروری ہے۔ ہر ناول نگار نے اپنے اپنے دائرہ کار میں اپنے اردگرد ماحول میں پھیلے ہوئے طبقات کو پیش کر کے اپنے طبقاتی شعور کا اظہار کیا ہے۔قرۃ العین حیدر نے بھی اپنے ناولوں میں پسماندہ طبقے کے طبقاتی کشمکش کو پیش کیا ہے۔ پسماندہ طبقے کے پیش کش میں قرۃ العین حیدر کا انداز مختلف نظر آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ قرۃ العین حیدر اپنی تحریروں میں اعلیٰ طبقے کی بڑائی ثابت کرتی نظر آتی ہیں۔ اگر ان کی تحریروں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کے یہاں پسماندہ طبقہ بھی موجود ہے۔ اس باب میں قرۃ العین حیدر کے ناولوں پر جو مفکرین ادب نے اعلیٰ طبقے کا لیبل لگایا ہے اس رائے سے قطع نظر ان کے ناولوں کا مطالعہ پسماندہ طبقے کے کرداروں کے حوالے سے کیا گیا ہے۔قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں میں شہروں کے مظلوم، مفلس، غریب اور سماجی سطح پر جو نچلے طبقے کی زندگی گزار رہے ہیں ان لوگوں کے مسائل کو پیش کیا ہے۔

ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کا پس منظر ہندوستان کی آزادی سے قبل سماج کے طبقاتی افراتفری کا ہے۔ ناول کا ایک حصہ مارکسی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے جس میں خورشید عالم کا کردار اہم ہے، خورشید عالم مزدور طبقے کا نمائندہ کردار ہے۔ مارکسی نظریات اور تحریک کے زیر اثر سماج کا پسماندہ طبقہ اوپر کی طرف آرہا ہے جسے اعلیٰ طبقہ قبول نہیں کر رہا۔ قرۃ العین نے اعلیٰ اور متوسط طبقہ کی خامیوں اور کمیوں پر بہت طنز کیا ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے عملاً کسی پسماندہ کردار کو پیش نہیں کیا ہے لیکن پسماندہ طبقے کا سماج اور انسانی زندگی کے متعلق تخلیق کار کی ہمدردی واضح طور پر سامنے آتی ہے۔ اس ناول میں نچلا طبقہ اعلیٰ طبقے کے ملازمین کی حیثیت سے متعارف ہوا ہے وہ صرف وفادار انسان کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس کی سائیکی، اس کی ضرورت اور کردار کی خصوصیات کا کوئی تجزیہ پیش نہیں کیا گیا ہے۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''میرے بھی صنم خانے'' میں اعلیٰ اور متوسط طبقے دکھائی تو دیتے ہیں مگر نچلے طبقے کا گزر نہیں ہے۔ جو کسی بھی سماج اور تہذیب کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔ ناول کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں اعلیٰ اور متوسط طبقے کے لوگ اور ان کے مسائل دکھائی تو دیتے ہیں مگر نچلا طبقہ سوائے وفادار ملازم کے کچھ دیگر نظر نہیں آتے۔ دراصل ناول جس دور کی تہذیب اور سماج کی عکاسی کرتا ہے اس دور میں ہندوستان کا اعلیٰ طبقہ، سماجی اور تہذیبی سطح پر بحران کا شکار تھا۔

''سفینۂ غم دل'' اس ناول میں لکھنو کی تہذیب، ماحول اور لوگوں کی بدلتی زندگی کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ جدید دور میں نوابین طبقہ اپنے قائم مقام سے نیچے آچکا ہے، صنعتی دور نے سب کو آگے بڑھنے کا موقع دیا۔ پونم مہیشوری پسماندہ طبقے کا کردار ہے جو نچلے طبقے سے اوپر کے طبقے میں شامل ہو گیا ہے۔ پونم وشاریہ، ناول کے کرداروں میں پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتا ہے، ہمیں اس کی دہری زندگی ناول کے صفحات پر نظر آتی ہے۔ پونم وشاریہ، پسماندہ طبقے کے غریب ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے، اس کی پانچ بہنوں میں ایک کوٹی۔ بی ہو چکی ہے، ایک بہن ریلوے ٹکٹ بیچنے والے کے ساتھ بھاگ گئی ہے، تیسری کو ہسٹریا ہو گیا ہے اور ماں کی زندگی گلی میں رہنے والے بھٹیارنوں کی سی ہے جو ساس اور محلے والوں کو گالیاں دیتی رہتی ہے۔ یہ گھر معاشی طور پر پسماندہ حالات سے دوچار ہے قرۃ العین حیدر نے اس طبقے کی نفسیاتی زندگی، حالات اور معمولات کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ سماج کا ایک اور پسماندہ طبقہ تھیٹر میں کام کرنے والی مراثین کا

بھی ہے۔ مصنفہ نے مارکسزم کے طبقاتی انقلاب اور اس کے متعلق خیالات کا واضح اظہار بھی کیا ہے۔ نیز ناول میں پسماندہ طبقے سے ان کی ہمدردی کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

ناول ''آگ کا دریا'' کا کینوس بہت وسیع ہے۔ ناول ڈھائی ہزار سالہ تہذیب و ثقافت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ہندوستان کی سماجی تشکیل کے لیے ہر سو بکھری زندگی کا احاطہ کرنا لازمی تھا۔ کیونکہ ہندوستان کی تاریخی روایت میں طبقاتی نظام قدیم زمانے سے رائج ہے۔ رائج الوقت سے چلی آ رہی اس روایت میں مکمل سماج کی تکمیل جبھی ہو سکتی تھی جب سماج کے سبھی طبقات کا احاطہ غیر جانبداری سے کیا جائے۔ قرۃ العین حیدر نے اس کا احاطہ بڑی خوبی سے کیا ہے جو ان کے عمیق مطالعے اور مشاہدے کی دین ہے۔

اس ناول کے ابتداء میں ہی ہندوستانی معاشرہ پانچ مختلف ذاتوں پر مشتمل دکھائی دیتا ہے۔ جس میں کشتری، براہمن، ویش، شودر اور چنڈال ہیں۔ یہ طبقہ اپنے اقدار و حالات کو لیے ہوئے ناول کے پس منظر میں ہر طرف دکھائی دیتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد صورتِ حال میں تبدیلی ضرور نظر آتی ہے لیکن اقدار کے پیمانے میں طبقات کا مسئلہ اب بھی برقرار ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ناول میں ہندوستان کے گاؤں اور دیہات کی اس حقیقی دنیا کو پیش کیا ہے جو آج بھی وسیع و عریض علاقے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ دیہات کے پس منظر میں بھی طبقاتی تفریق نظر آتی ہے جہاں اچھوت اور نچلی ذاتی کے لوگ مختلف طرح کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جولاہوں، کسانوں اور دوسرے پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی، اعلیٰ طبقہ اور شہری منصب داروں سے قدرے مختلف تھی۔ پسماندہ طبقے کے غریب لوگوں کو مراتب اور منصب سے کوئی سروکار نہیں، وہ صرف اور صرف انسان پرست لوگ تھے اور ان کا مقصد بھی انسانیت سے تھا۔ پسماندہ طبقے کا کسان اپنے کھیت میں اور مزدور پیٹ کے لیے محنت و مشقت کرتا ہے۔ اسے تاریخ اور واقعات سے کوئی لینا دینا نہیں۔ کاشی کا اہیر، کمال الدین کو کھانا کھلاتے ہوئے کہتا ہے کہ ذات پات اور اونچ نیچ کے بھید بھاؤ میں کیا رکھا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ بھوک ہے، کسی بھوکے کو کھانا کھلانا کتنا سکون اور نیکی کا کام ہے۔ قرۃ العین حیدر نے پسماندہ طبقے کے غریب اور مزدور لوگوں کی سادہ دلی اور انسان پرستی کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ گاؤں دیہات کے یہ غریب لوگ مفاد پرستی سے بالاتر نظر آتے ہیں۔

اس کے بعد بدلتے وقت کے تناظر میں مذہبی تفریق ،مسیحی کلچر جنھوں نے سب سے زیادہ پسماندہ طبقے کے نچلی ذاتی کے لوگوں کو پناہ دی اور مذہب قبول کرنے کے بعد معاشی امداد بھی عنایت کی۔اس کے بعد انگریزی حکومت میں آقا اور غلام کا معاملہ دکھائی دیتا ہے۔اس ضمن میں تہذیبی زوال کا اثر زیادہ دکھائی دیتا ہے۔خاص کر اعلیٰ طبقہ اپنا اثر رسوخ کھوکر بھیک مانگنے اور طوائف بننے پر مجبور دکھائی دیتا ہے۔اس کے بعد تقسیم کا مرحلہ آتا ہے اس دور میں مہاجرین طبقے کی پسماندہ زندگی ناول کا حصہ ہے اور آخر میں تقسیم بنگلہ دیش کے پسماندہ زندگی کا المیہ ناول میں موجود ہے جس کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔تخلیق کار نے ناول کے ہر دور میں پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''ناول آگ کا دریا'' میں قرۃ العین حیدر نے مختلف ادوار میں ہر طبقے کے افراد کی زندگی کو دکھایا ہے۔اعلیٰ طبقہ۔۔۔۔۔۔۔۔متوسط طبقہ۔۔۔۔۔۔۔نچلا طبقہ۔۔۔۔ انسانی تاریخ اسی طرح دائرے میں سفر کرتی ہے اور طبقات میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔یہاں اس ناول میں معاشرے کے سبھی طبقات کو قرۃ العین حیدر نے پیش کیا ہے۔

''آخرِ شب کے ہمسفر'' بنگال میں چلنے والی آزادی کی تحریک اس ناول کا موضوع ہے۔مارکسزم تحریک کے زیر اثر ہندوستان کی آزادی کے خواہش مند نوجوان اعلیٰ اور پسماندہ طبقہ کے طبقاتی فرق کو بھی مٹانے کی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔جس کی نمائندگی ریحان الدین اور دیپالی سرکار کر رہے ہیں۔اعلیٰ طبقے کے لیے پسماندہ طبقے کے دلوں میں بغاوت اور نفرت کی فضا کو جس طرح تخلیق کار نے پیش کیا ہے اس کا تجزیہ ناول کے متن اور کرداروں کے حوالے سے کیا گیا ہے۔اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کے متعدد کردار ناول میں ایسے ہیں جو تبدیلی کے باعث زندگی کی بڑی تبدیلی سے گزرتے ہیں ان کرداروں کے جذبات واحساسات اور تمام تر داخلی کیفیات کو تخلیق کار نے جس طرح نمایاں کیا ہے۔زیر تحقیق اس کا بھی تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ناول کے جن کرداروں کے ذریعے پلاٹ کو ترتیب دینے کی کوشش کی ہے ان میں اعلیٰ طبقے کے ساتھ پسماندہ طبقے کے ضمنی کردار بھی موجود ہیں۔جن میں آپا کلثوم ،لیلا ،عبدالغفور اور عیوصی جیسے

اہم کردار ہیں۔قرۃ العین حیدر نے ناول میں پسماندہ طبقے کے ان کرداروں کی سائکلو جی اور عملی زندگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی اپنی زندگی اپنے آقا کی مرہونِ منت ہے۔کلثوم بھی اپنے طرزِ عمل سے یہی ثابت کرتی ہے کہ وہ ایک بہترین اور اپنے پیشے سے ایمانداری رکھنے والی ملازمہ ہے۔

یہ ناول تقسیم ہند سے پہلے کے حالات تحریک آزادی اور بائیں بازو کی آزادی کی جارحانہ کوششوں سے شروع ہوتا ہے اور تقسیم کے بعد کے حالات اور تقسیم کے وقت کی نسل کی مضمحل روحوں کے المیے پر آ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ویسے تو یہ ناول صوبہ بنگال میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں اور رونما ہونے والے انقلاب کا احاطہ کرتا ہے اور یہی اس کا موضوع بھی ہے مگر اس ناول میں نچلا طبقہ جو اس دور میں واضح شکل اختیار کر چکا تھا اور اب ابھر کر پوری آب و تاب سے معاشرے میں اپنے وجود کو منوا رہا تھا اس کو بھی ناول میں نمایاں حیثیت حاصل ہے، تحقیق کے دوران ان سبھی امور کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ ناول امتداد زمانہ کی بنتی بگڑتی شکل کو سامنے لاتا ہے اور ان کے کردار کو واضح بھی کرتا ہے۔

''گردشِ رنگ چمن'' کی کہانی پچھلی ڈیڑھ صدی کا احاطہ کرتی ہے۔ناول کے اہم کرداروں میں مہرو بیگم اور دل نواز بیگم کا کردار ہے، جو مغل شہزادیاں ہیں اور امتداد زمانہ نے انہیں پسماندہ طبقے کا طوائف بنا دیا ہے۔بیگم گل رخ بانو عرف نواب فاطمہ، شریف مسلمان کی بیٹی ہے جو باپ کی وفات کے بعد در بدر کی ٹھوکریں کھاتی ہے اور بالآخر وہ بھی پسماندہ طبقے میں شمار طوائف بننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ناول کے پسماندہ کرداروں میں سب سے پہلے دلنواز کا کردار سامنے آتا ہے جو اپنی بہن مہرو سے علیحدہ ہو کر چورن بیچنے والی جگن بوا کے روپ میں ملتا ہے۔دوسرا اہم کردار نواب فاطمہ کا ہے جو مرزا دلدار علی برلاس کی بیٹی ہے جس کے والدین دہلی میں پھیلنے والے ہیضے کی بیماری سے مر جاتے ہیں اور اس بچی کو پیش کار سبطِ حسن کے حوالے کر جاتے ہیں۔ سبطِ حسن، دلدار علی برلاس کے مرنے کے بعد اس کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیتا ہے اور تبادلے کا ڈھونگ رچا کر نواب فاطمہ کو دہلی کے ایک تاجر شیخ عبدالباسط کے حوالے کر کے غائب ہو جاتا ہے۔نواب فاطمہ دن رات گھر کی عورتوں کے آگے ذلیل ہوتی ہے پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ظالم اور پتھر دل عورتیں اس کی شادی گھر میں رہنے والے ایل ملازم پاگل ممدو سے کرنا چاہتی ہیں۔یہاں نواب بیگم کی زندگی میں ایک نیا موڑ آتا ہے

جب وہ چورن بیچنے والی مغل شہزادی دل نواز کے ساتھ اجمیر شریف کے مزار پر آجاتی ہے تا کہ شیخ عبدالباسط کے اہلِ گھرانہ کے شر سے بچ سکے، یہاں ایک بھاری بھرکم فقیر نواب فاطمہ کو گھورا کرتا تھا۔ دلنواز بھی اسی فقیر سے نواب فاطمہ کی شادی کرنا چاہتی تھی، جیسے ہی نواب بیگم کو ان کے اس ارادے کا پتا چلا وہ عرس کے دنوں میں اجمیر کی راحت بائی کے پیچھے چل پڑی۔ اب راحت بائی اس کی قسمت کی مالک تھی۔ اب نواب بیگم کے ساتھ وہی ہوا جو ایسی بدقسمت لڑکیوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے، اچھے گھرانوں کی خدا معلوم کتنی لڑکیاں اسی طرح پسماندہ طبقے کے طوائف طبقے کا حصہ بن جاتی ہیں۔

راحت بائی کا تعلق پسماندہ طبقے کے طوائف طبقے سے ہے، اودے پور میں راحت بائی نے پیشے کے اعتبار سے نواب بیگم کی تعلیم و تربیت مکمل کروائی۔ لاہور میں اس نے محفلِ موسیقی میں شرکت کی اس کے بعد دور دور سے اس کے لیے پیغام آنے لگے، وہ درباروں میں بلائے جانے لگی۔ نواب بیگم کی خوبصورتی اور ادا کے دیوانے مہاراجہ جے پور کے ٹھاکر مہیشور سنگھ نے اپنے پاس بلالیا، مہیشور سنگھ نے ناز نخرے اور مال و دولت کے علاوہ علیحدہ مکان بھی لے کر دیا۔ نواب بیگم کے کردار میں ناول کے پس منظر پر کہیں مستقل سکون میسر نہیں آتا، وہ اپنی پسماندہ زندگی میں تبدیلی حالات سے ہمہ وقت دوچار نظر آتی ہے، اس کی زندگی میں مختلف موڑ آتے ہیں۔ ایک مرتبہ کرنل ڈالٹن جو مغلیہ سلطنت کی تصویروں کا دلدادہ تھا وہ ایک دن نایاب مغل تصاویر دیکھنے کے لیے ٹھاکر مہیشور سے ملا، جس کے ساتھ بیلجئیم کا ایک فوٹو گرافر آندرے رینال تھا، تصویر بناتے ہوئے جب نواب فاطمہ سے آمنا سامنا ہوا تو اس نے نواب فاطمہ سے تعلقات قائم کر لیے، دوسری طرف مقروض مہیشور سنگھ کو اچانک موت نے گھیر لیا۔ نواب فاطمہ موقع پا کر کلکتہ بھاگ گئیں، آندرے رینال کو پہلے ہی بیگم فاطمہ نے خاصی دولت دے کاروبار کرنے کے لیے کلکتہ بھیجا تھا لیکن رینال سارے پیسے ریس میں ہار کر کلکتہ سے فرار ہو گیا تھا۔ نواب فاطمہ کی بیٹی عندلیب دراصل اسی بیلجئین فوٹو گرافر آندرے رینال کی اولاد تھی، اس کے بعد نواب فاطمہ کی زندگی میں دکھ ہی دکھ تھے لیکن عندلیب کی زندگی سنوارنا اس کا اولین مقصد تھا۔

عندلیب کی زندگی بھی مصائب سے عبارت تھی لیکن نواب فاطمہ کی نسبت عندلیب نے بہتر زندگی گزاری۔ بہتری کے باوجود وہ طوائف طبقے سے باہر نہ جاسکی اور آخر میں پسماندی طبقے کے طوائف پیشے کا

حصہ بن کر رہ جاتی ہے۔خان بہادر کا خطاب حاصل کرنے والے امبا پرشاد نے اس دور میں عندلیب کو ایک ہزار روپے عطا کیے۔ ماسٹر مشکور حسین عندلیب کو پینٹنگ سکھانے آنے لگے۔ماسٹر مشکور حسین نے دولت کے لالچ میں عندلیب سے شادی کر لی چوں کہ وہ پہلے سے ہی شادی شدہ تھے اس لیے نہ بن سکی، طلاق ہوگئی۔اس کے بعد عندلیب اپنی ماں نواب فاطمہ کے پاس چلی گئی۔اس کی ماں ۱۹۴۵ء میں کینسر سے مر جاتی ہے، جس کے بعد عندلیب رقاصہ بن جاتی ہے۔ماں چونکہ آخری عمر میں زیادہ مذہبی ہوگئی تھی اس لیے ردِعمل کے طور پر عندلیب بے دین سی ہوگئی تھی۔عندلیب کی بیٹی عنبرین نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور کئی ممالک گھوم پھر لیے۔اب ڈاکٹر منصور کاشغری سے اس کی دوستی تھی۔اعلیٰ تعلیم اور ترقی یافتہ ہونے کے باوجود بھی عنبرین کا تعلق طوائف طبقے سے جڑا ہوا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی ماں عندلیب اور نانی نواب فاطمہ کی زندگیوں پر گہرا طنز کرتی تھی کیوں کہ اسے اپنے تشخص کا گہرا دکھ ہے۔وہ سوچتی ہے کہ آیا وہ امبا پرساد کی بیٹی ہے یا ماسٹر مشکور حسین کی۔پسماندہ طبقے کے پس منظر کو جس طرح تخلیق کار نے اس ناول میں پیش کیا ہے اس کے تمام پہلو اور پس منظر کو راقم نے زیر تحقیق واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

''چاندنی بیگم'' مصنفہ کا اہم ناول ہے۔کہانی کی ابتداء میں ہماری ملاقات فیوڈل طرزِ رہائش کے حامل خاندان سے ہوتی ہے جو زوال پذیر ہے۔اعلیٰ طبقے کے اس خاندان میں تین افراد بیرسٹر اظہر علی شیخ، ان کی بیوی بدرالنساء، عرف بٹو باجی اور بیٹا قنبر علی ہیں۔پسماندہ طبقے کے شاگر پیشہ میں علاؤالدین موٹر ڈرائیور، رمضانی خانساماں، اپنے اہل وعیال کے ساتھ عید و خدمتگار، کوارٹر کے سرے پر ننھا دھوبی اور اس کے گھر والے رہتے ہیں۔بھگوان دین مالی اور پھٹکو چوکیدار باغ کے کاٹیج میں رہائش پذیر ہیں۔

علاقہ کا دوسرا خاندان راجہ انور حسین کا ہے جو سفید رنگ کے تین کٹوری ہاؤس میں قیام پذیر ہیں۔اعلیٰ طبقے کے اس خاندان میں راجہ انور حسین کے علاوہ ان کی بیوی رانی صولت زمانی، وکی میاں اور بوبی، بیٹیوں میں زرینہ سلطانہ، پروین سلطانہ اور صفیہ سلطانہ ہیں جب کہ پسماندہ طبقے کے ملازم پیشہ میں الا یچی خانم خوش قدم، بتاشن بوا، وزیرن، نوازن اور سونا کلی رہائش پذیر ہیں۔

ناول کے کرداروں میں بیرسٹر شیخ اظہر کا بیٹا قنبر علی جس کی سوچ اور فکر والد سے الگ ہے، وہ ترقی پسند

نظریات کا حامل ہے۔قنبر علی اعلیٰ طبقے کے فیوڈل نظام کا پروردہ ہونے کے باوجود اپنے نظام کو پسند نہیں کرتا کیوں کہ وہ اعلیٰ اور پسماندہ طبقے کے طبقاتی فرق کو مٹانا چاہتا تھا، وہ ایک غیر طبقاتی سماج کا خواب دیکھتا ہے۔اس کی ماں بھی سوشل ورکر اور روشن خیال خاتون ہے جو ہر وقت حقوقِ نسواں کے لیے جدو جہد کرتی دکھائی دیتی ہے اور اپنی کوٹھی پر آنے والی پسماندہ طبقے کی غریب، مفلس اور مفلوک الحال خواتین کی مدد بھی کرتی نظر آتی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ناول میں ہندوستان کے زوال پذیر اعلیٰ طبقے کی زندگی، ان کا مخصوص کلچر اور مخصوص ماحول کے ساتھ پسماندہ طبقے کے مراثیوں، بھانڈوں، مغلانیوں اور اناؤں کی زندگی کے مختلف طبقاتی مسائل سے پردہ اٹھایا ہے۔مصنفہ نے نچلے طبقے کے مراثیوں اور بھانڈوں کے کلچر پر خوب روشنی ڈالی ہے، ان کے کلچر کی روایات صدیوں سے چلی آرہی ہیں۔ یہ روایات نسل درنسل چلتی آرہی ہے۔سامعین اور ماحول کے موافق وہ اپنی گفتگو کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن موجودہ دور میں یہ پسماندہ طبقہ بھی زوال پذیر ہے اور اپنی معاشی زندگی میں بے حال نظر آتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مفلسی مٹاؤ کے نعرے کی تہذیبی، معاشی اور معاشرتی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش بھی ملتی ہے۔اس کے علاوہ لوک گیتوں، برات اور جوگیوں کا ماتم، سوانگ کے طریقوں، ، بنجاروں کے نوحوں اور حبشیوں کے ماتم کی کیفیات کو عمدگی سے بیان کیا ہے۔ ماتم اور نوحوں کی فضا میں جس طرح کے جذبات اور احساسات موجود ہوتے ہیں وہ ساری کیفیات پوری شدت کے ساتھ جھلکتی نظر آتی ہے۔

اس ناول کے فضا میں اعلیٰ طبقہ اپنے زوال کے باوجود اسی طرح مگن ہے جس پر مصنفہ نے سخت طنز کیا ہے۔ وہیں پسماندہ طبقے سے تخلیق کار کی ہمدردی کا جذبہ ابھرتا نظر آتا ہے۔ ناول نگار نے چاندنی بیگم کے ذریعے پسماندہ کرداروں کی زندگی اور مسائل کو پیش کرتے ہوئے جس نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے راقم نے اس کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

''کارِ جہاں دراز ہے'' قرۃ العین حیدر کا سوانحی ناول ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ ناول صرف فیملی ساگا نہیں ہے بلکہ اس میں برعظیم کی بنتی بگڑتی صورتحال وقت کے آئینے میں شفاف دکھائی گئی ہے۔ برعظیم

ہمیشہ طبقات میں تقسیم رہا، آنے والے لوگوں نے مختلف نظام کے تحت ہندوستان میں طبقاتی نظام قائم کیے جس کا تعلق فاتح اور مفتوح، ادنیٰ واعلیٰ اور ذات پات کے نسلی امتیاز سے رہا ہے۔ کردار نگاری کے حوالے سے ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں کوئی فنی اور فکری جذبہ نہیں ملتا بلکہ تصویری طور پر ان کی زندگی دکھائی دیتی ہے۔

قرۃ العین حیدر ایک ہمہ جہت شخصیت تھیں جیسے جیسے ان کی تحریروں کو پڑھتے جائیں ویسے ویسے فکر وشعور کے نئے نئے در وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر لوگوں نے مصنفہ کے فکشن کا مطالعہ کرنے کے بعد انہیں اعلیٰ طبقے کی نمائندہ تخلیق کار کہا ہے۔ لیکن ان کی تخلیقات میں بہت سے دیگر پہلو بھی ہیں جن کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ افسوس اس امر کا ہے کہ ان کے فکشن کا مطالعہ ان کی زندگی کے پس منظر میں کیا گیا اور کردار نگاری کے حوالے ان کا دائرہ اعلیٰ طبقے کے کرداروں تک محدود قرار دیا۔ جبکہ ان کے یہاں پسماندہ طبقے کے کردار بھی موجود ہیں لیکن اس طرف توجہ کم دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک پسماندہ طبقے کے کرداروں کی زندگی اور ان کے مسائل کے حوالے سے کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ حالانکہ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات اتنی وسعت، بوقلمونی اور اتنے پھیلاؤ کی حامل ہے کہ عقل ششدر رہ جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اپنی خلاقانہ صلاحیت کی بدولت اپنے جینوئن رائٹر ہونے کا بھی ثبوت پیش کیا ہے کیونکہ انہوں نے باقی تمام چیزوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے نظریات اور اصولوں سے کبھی انحراف نہیں کیا تھا۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اس نابغۂ روزگار ہستی جس نے اپنی ساری زندگی ادب کی خدمت میں گزاردی ہو، ان کو زندگی میں جیسی پذیرائی ملنی چاہئے تھی وہ نہیں مل سکی اسی لیے انہوں نے اس ناقدری دنیا کو خیرباد کہنے میں عافیت سمجھی اور بالآخر ۲۱/اگست ۲۰۰۷ء کی رات اپنے خالقِ حقیقی سے جاملیں۔

قرۃ العین حیدر نے اپنی اسی (۸۰) سالہ زندگی میں بے پناہ اور بہترین ادب تخلیق کیا ہے، اور انہوں نے فکشن کے میدان میں ایسے تابندہ نقوش ثبت کیے ہیں جو انہیں مدتوں مرنے نہیں دیں گے اور ادب سے محبت کرنے والے ان کے بہترین فکشن کی بدولت انہیں بھلا نہیں پائیں گے۔

☆☆☆